

میں نے خواہوں کا شجر دیکھا ہے



عمیرہ احمد

میں نے خواہوں کا شجر دیکھا ہے

عمیرہ احمد

علم و فن پبلشرز

40-الہمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور، فون: 7232336، 7352332
www.ilmoirfanpublishers.com. E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

فہرست

11	شہر ذات	-1
69	کوئی لمحہ خواب نہیں ہوتا	-2
119	میں نے خوابوں کا شجر دیکھا ہے	-3
162	کوئی بات ہے تیری بات میں	-4
184	منٹھی بھر مٹی	-5
208	تیری یاد خار و گلاب ہے	-6

شہر ذات

”خدا کا خوف کرو فلک! اتنی دیر میں لوگ چاند پر جا کر واپس آ جاتے ہیں جتنی دیر میں تم صرف اپنی آنکھوں کا میک اپ کر رہی ہو۔ میں تمہیں ایک بار پھر یقین دلاتی ہوں، وہاں سلمان الفکر کے آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس لیے اتنے ہتھیاروں سے لیس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

رشنا کی بیزاری اب اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی اور وہ سیدھا سیدھا طنز کرنے پر اتر آئی تھی۔ مگر اس کی کسی بات کا فلک پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی سکون و اطمینان سے اپنی پلکوں پر مسکارا کی ایک اور کوئنگ کرتی رہی۔

”اٹھ جاؤ فلک! اٹھ جاؤ ہم کنسرٹ پر جا رہے ہیں کسی فیشن شو میں نہیں اب بس کرو۔“ اس کی خاموشی نے رشنا کو کچھ اور تپایا۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر اس کے سامنے پڑی میک اپ کٹ کو اٹھا کر بند کر دیا۔

”تمہیں کیا تکلیف ہے یار! چند منٹ انتظار نہیں کر سکتیں؟“ فلک نے اس کے ہاتھ سے میک اپ کٹ چھیننے ہوئے کہا۔

”مجھے قطعاً کوئی تکلیف نہیں ہے مگر یار جتنی جانفشانی سے تم میک اپ میں مصروف ہو، اس سے تمہیں ضرور کوئی تکلیف ہو جائے گی۔“

فلک اس کی بات کا جواب دے بے بغیر ایک بار پھر مسکارا لگانے میں مصروف ہو گئی۔ رشنا ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھ کر ہلکی سی مسکراہٹ سے اسے دیکھنے لگی فلک اپنے چہرے پر جی اس کی آنکھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میک اپ میں مصروف رہی۔

”فلک! تمہیں آخر میک اپ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تمہیں تو خدا نے پہلے ہی بہت مکمل بنایا ہے۔ میک اپ کی ضرورت تو ان لوگوں کو ہوتی ہے جن میں کوئی خامی کوئی کمی رہ

گئی ہو۔ تم میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ چند لمحے اس کے چہرے پر نظر جمائے رکھنے کے بعد رشنا نے کہا۔

ایک دلکش مسکراہٹ فلک کے چہرے پر لہرائی۔ ایک خاص ادا سے دایاں ابرو اچکاتے ہوئے اس نے کہا۔

”جانتی ہوں مجھے میک اپ کی ضرورت نہیں ہے مگر سلمان کو میک اپ پسند ہے اور جو چیز اسے پسند ہے، وہ فلک کو کیسے ناپسند ہو سکتی ہے۔ مس رشنا کمال! یہ سب سنگھار صرف اسی ایک شخص کے لیے کر رہی ہوں تاکہ اس کی نظر کہیں اور نہ جاسکے۔ اگر کوئی چہرہ اس کے خیالوں میں رہے تو وہ یہی چہرہ ہو اگر کوئی وجود اس کی نظر کو اسیر کرے تو وہ یہی وجود ہو۔“

فلک نے میک اپ کٹ بند کر کے دراز میں رکھ دی۔

”دل تو اس بندے کا پہلے ہی جیت چکی ہو اب باقی کیا رہا جسے حاصل کرنے کی خواہش ہے۔ وہ بندہ تمہارے پیچھے اس قدر دیوانہ ہے کہ اس سب سنگھار کے بغیر بھی اس کی نظر تمہارے علاوہ کسی اور چہرے پر نہیں لگے گی۔“

رشنا نے رشک آمیز حسرت سے کہا تھا۔ ایک قفاخر آمیز مسکراہٹ سے فلک اپنے تراشیدہ بالوں میں برش کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

خوبصورتی کی اگر کوئی حد ہوتی تو وہ حد فلک شیر انگن تھی۔ وہ مجسم حسن تھی جو نظر ایک بار اس چہرے کو دیکھ لیتی وہ دوہا رد کچھ اور دیکھنے کے قابل نہیں رہتی تھی۔ اسے نظروں کا اسیر کرنے کا ہنر آتا تھا۔ بعض دفعہ وہ اپنے وجود کو آئینے میں دیکھتی اور خود اپنے سحر میں گرفتار ہو جاتی اور پھر سوچتی۔

”اگر میں ایک عورت ہوتے ہوئے خود اپنے ہی عکس سے نظر ہٹا نہیں سکتی تو کسی مرد کے لیے یہ کتنا مشکل ہوگا۔“

یہ احساس اسے بیٹھے بٹھائے قلو پٹھر بنا جاتا پھر وہ گھنٹوں آئینے کے سامنے بیٹھی سنگھار میں مصروف رہتی۔ بہت سے لوگوں کو دنیا میں صرف ایک چیز ملتی ہے اور بس ایک ہی چیز ملتی ہے۔ بعض لوگوں کو دنیا میں سب کچھ ملتا ہے اور سب کچھ ہی ملتا ہے، فلک شیر انگن دوسری فہرست میں آتی تھی۔ وہ شیر انگن جلیل کی اکلوتی بیٹی تھی اور شیر انگن جلیل ملک کے نامور انڈسٹریلسٹ تھے۔ اسے چاہا نہیں گیا تھا۔ بے تحاشا چاہا گیا تھا اگر اس کے ماں باپ کا بس چلتا تو وہ واقعی اسے اپنی پلکوں پر بٹھا لیتے۔ وہ خود پسند بھی تھی اور خود پرست بھی مگر کوئی اور خامی اس میں نہیں تھی یا شاید اس کا حسن کسی دوسرے کو اتنی جرأت ہی نہیں دیتا تھا کہ وہ فلک

شیر انگن کی کوئی خامی ڈھونڈ پاتا۔

اس نے ہر جگہ سے ستائش پائی تھی چاہے وہ گھر ہو یا سکول، کالج ہو یا یونیورسٹی۔ وہ لڑکیاں بھی جو اس سے حسد کرتی تھیں۔ کہیں نہ کہیں ان کے دل میں بھی اس سے دوستی کی خواہش ضرور دہی رہتی تھی۔ بعض دفعہ کوئی دل ہی دل میں اس سے سخت بدگمان ہوتا اسے ناپسند کرتا اس کے بارے میں دوسروں سے غلط باتیں کہتا اور پھر وہ ایک بار ہی اس سے مخاطب ہوتی، حال احوال پوچھتی، مسکراتی اور اگلا چاروں شانے چت ہو جاتا پھر اس میں کوئی محارمت ہی باقی نہیں رہتی تھی۔ اگلے کتنے دن وہ اسی احساس کے ساتھ ساتویں آسمان پر رہتا کہ فلک شیر انگن نے اس سے بات کی ہے اس کا حال احوال دریافت کیا ہے اسے دیکھ کر مسکرائی ہے۔ پھر وہ دوبارہ کبھی اس کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ کر پاتا۔ وہ اکثر اپنے مخالفین کو اسی طرح چت کیا کرتی تھی۔

وہ یونیورسٹی میں ایم ایف اے کر رہی تھی مگر اس کا حلقہ احباب لمبا چوڑا نہیں تھا۔ اس کے دوستوں کی تعداد محدود تھی۔ اس کی چند دوستیں وہی تھیں جن کے ساتھ اسکول کے زمانے سے اس کی دوستی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تعلق نہ صرف مضبوط ہوا تھا بلکہ اس کی دوستوں میں کوئی اضافہ بھی نہیں ہوا تھا۔ رشنا بھی اس کی ان ہی گہری دوستوں میں سے ایک تھی اور اس سے اور مریم سے ہی اس کا سب سے زیادہ میل جول تھا۔

فلک کے لیے رشتے تب سے آنے شروع ہو گئے تھے جب وہ اسکول میں تھی۔ مگر شیر انگن نے بڑی خوبصورتی سے سب کو ٹال دیا تھا وہ چھوٹی عمر میں اس کی شادی کرنا نہیں چاہتے تھے ویسے بھی وہ جانتے تھے کہ فلک کے لیے کبھی بھی رشتوں کی کمی نہیں ہوگی۔ وہ نہ صرف بے پناہ خوبصورت تھی بلکہ ان کی ساری دولت کی بھی مالک تھی پھر ایک اسی سونے کی چڑیا کو پھانسنے کے لیے شکاریوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ کیوں نہ ہوتا۔

وہ شروع سے کو ایجوکیشن میں بڑھی تھی اور شروع سے ہی اس کے پیچھے بھاگنے والوں کی فہرست بہت لمبی تھی۔ مگر فلک نے کبھی کسی کی پرواہ نہیں کی تھی یا پھر شاید اس کو کسی میں اتنی کشش ہی محسوس نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس کے بارے میں سوچتی بلکہ وہ اکثر اپنی فریڈز کے ساتھ مل کر ایسے عشاق کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ رشنا اکثر اس سے کہا کرتی تھی۔ ”جو لوگ خود خوبصورت ہوتے ہیں، انہیں کسی دوسرے سے محبت ذرا کم ہی ہوتی ہے اور عشق تو دور کی بات ہے۔“ وہ ہر بار اس کی باتوں پر قہقہہ لگایا کرتی تھی۔

سلمان الفرسے اس کی ملاقات اپنی ایک دوست کی بہن کی شادی کی تقریب میں

ہوئی تھی۔ آداری میں سوئمنگ پول کے کنارے ایک ٹیبل پر وہ اپنی دوستوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی حسب معمول بہت سی نظروں کا مرکز بنی ہوئی تھی اور اس بات سے آگاہ بھی تھی اور بے پرواہ بھی اپنی دوستوں کے کسی بات پر تہہ لگاتے ہوئے اس کی نظر سوئمنگ پول کے دوسرے کنارے پر موجود ایک ٹیبل پر پڑی تھی۔ سیاہ جینز اور اسی رنگ کی لیڈر کی جیکٹ اور ٹی شرٹ میں ملبوس وہ بندہ اس ٹیبل کی سب سے خاص چیز تھا۔ وہ اتنی دور سے بھی اس کے چہرے کے نقوش کی خوبصورتی کو محسوس کر سکتی تھی۔ وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے لڑکے کی بات سن رہا تھا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے گلاس سے کوک کے سپ لے رہا تھا۔ فلک چاہتے ہوئے بھی اس سے نظر ہٹانے نہیں پائی۔ اپنی فرینڈ کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے وہ وقفے وقفے سے اسے دیکھ رہی تھی اور کچھ دیر بعد اچانک اسے احساس ہوا تھا کہ وہ صرف فلک کی توجہ کا مرکز نہیں تھا۔ کچھ اور نظریں بھی بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ اور اس احساس نے پہلی بار اسے حسد سے روشناس کروایا تھا۔ اس کے دل میں بڑی شدت سے اس کے پاس جانے کی خواہش پیدا ہوئی۔

”رشنا! یہ سوئمنگ پول کے دوسری طرف ٹیبل پر بلیک آؤٹ فٹ میں جو بندہ ہے، اسے جانتی ہو؟“

اس نے اچانک رشنا سے سرگوشی میں پوچھا جو اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی رشنا نے نظر دوڑائی تھی۔ ”نہیں یار یہ کوئی نیا بندہ ہے کم از کم میں واقف نہیں ہوں۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

پھر فلک نے یہی سوال ٹیبل کے گرد بیٹھی ہوئی اپنی دوسری دوستوں سے کیا تھا۔ سب کا جواب نفی میں تھا۔

”رمشہ سے پوچھو، میرا خیال ہے، یہ اس کے بہنوئی کا کوئی دوست ہوگا۔“ رشنا نے اس سے کہا تھا۔ وہ رشنا کے ساتھ اٹھ کر اسٹیج کی طرف آگئی تھی۔ وہاں رمشہ، دولہا دلہن کے ساتھ بیٹھی تصویریں بنا رہی تھی۔ فلک نے اسے ایک طرف بلوایا اور اس بندے کے بارے میں پوچھا تو وہ اپنے بھائی سے اس کے بارے میں پوچھنے لگی تھی۔

”یہ سلمان النصر ہے، اسد بھائی کا کزن ہے۔“ اس نے آکر اپنے بہنوئی کا نام لیا تھا۔ فلک نے اس سے کہا تھا کہ وہ اسے اس سے ملوئے۔

”اچھا چلو ٹھیک ہے۔ اسد بھائی کا چھوٹا بھائی جمشید بھی اسی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ میں اس کے پاس تمہیں لے جاتی ہوں ظاہر ہے وہ خود ہی ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں کا

تعارف کروادے گا۔“ رمشہ نے اس ٹیبل پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

فلک دھڑکتے دل کے ساتھ رمشہ کے ساتھ اس ٹیبل کی طرف آگئی تھی۔ وہ دور سے جتنا خوبصورت نظر آ رہا تھا پاس آ کر اس سے زیادہ اچھا لگا تھا اسے۔ رمشہ کے ساتھ جب وہ اس ٹیبل کے پاس پہنچی تو رمشہ نے جمشید سے اس کا تعارف کروایا تھا پھر جمشید نے باری باری ٹیبل کے گرد بیٹھے ہوئے لڑکوں کا تعارف ان سے کروایا تھا۔

سلمان النصر نے اپنے تعارف پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہلو کہا تھا۔ پھر وہ پہلے کی طرح ارد گرد نظر دوڑانے میں مصروف ہو گیا تھا۔ فلک کے لیے یہ بات حیران کن تھی۔ وہ اس ٹیبل پر بیٹھے ہوئے دوسرے لڑکوں کی طرح اسے ستائشی نظروں سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل کو کچھ ٹھیس لگی تھی، کچھ دل گرفتہ سی وہ واپس اپنی میز پر آگئی تھی۔ فنکشن کے اختتام تک اس کی توجہ اسی پر مرکوز رہی تھی مگر اس نے سلمان النصر کو ایک بار بھی اپنی طرف متوجہ نہیں دیکھا۔

اگلے کئی دن وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ چہرہ جیسے اس کے دماغ میں کہیں فیض ہو گیا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اسے اپنے ذہن سے جھٹک نہیں پارہی تھی۔

سلمان النصر سے اس کی دوسری ملاقات Pace میں ہوئی تھی۔ وہ ہاتھوں میں کچھ شاپنگ بیگز تھامے باہر کی طرف آ رہا تھا۔ جبکہ وہ اندر جا رہی تھی۔ اسے سامنے سے آتے دیکھ کر فلک کے قدم رک گئے۔

”ہیلو!“ پاس آنے پر فلک نے بے تابی سے اسے مخاطب کیا وہ کچھ حیران ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک نہیں تھی۔

فلک کو شاک لگا۔ ”کیا مجھ میں ایسی کوئی بات بھی اسے نظر نہیں آئی کہ یہ مجھے یاد رکھتا۔“ اس نے سوچا تھا۔

”سوری، میں نے آپ کو پہچانا نہیں ہے۔“

فلک نے کچھ دل گرفتہ ہو کر دو ہفتے پہلے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتایا۔

وہ ایک دم مسکرایا۔ ”مجھے یاد آ گیا کیسی ہیں آپ؟“

اس کی مسکراہٹ نے فلک کی ساری سنجیدگی دور کر دی تھی ”میں ٹھیک ہوں، آپ

کیسے ہیں؟“

”فائن۔“

”اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو کیا میں آپ کو لچ کی آفر کر سکتی ہوں؟“ اس نے ایک

لمحہ کی تاخیر کے بغیر اس سے کہا تھا۔

وہ اس اچانک آفر پر کچھ حیران ہوا تھا۔

”لنچ آل رائٹ چلیں۔“ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہا تھا۔

دونوں باہر نکل آئے۔ فلک نے اپنے ڈرائیور کو واپس بھجوا دیا۔ سلمان کے ساتھ

انگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے اسکا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

”کہاں چلیں؟“ اس نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے کہا تھا۔

”فیو جی یا ما۔“ وہ گاڑی کو رپورس کرتے ہوئے سڑک پر لے آیا تھا۔

”آپ پڑھتی ہیں؟“ اس نے اپنی ٹی شرٹ کے ساتھ نکلے ہوئے سن گلاسز اتار کر

لگاتے ہوئے کہا تھا۔

فلک نے اسے اپنے بارے میں بتایا۔

”اور آپ؟“

”مجھے تو کافی سال ہو گئے اپنی تعلیم مکمل کئے۔ اکتانکس میں ماسٹرز کیا ہے۔ سراسر

کی فیکٹری ہے میرے ڈیڑی کی وہیں ہوتا ہوں۔“ وہ آہستہ آہستہ اپنے بارے میں بتاتا گیا۔

پھر گنگو کا سلسلہ طویل ہوتا گیا تھا۔

(فیو جی یا ما) میں ہونے والا یہ لنچ پہلا اور آخری لنچ ثابت نہیں ہوا تھا۔ ان کی

ملاقاتوں کی تعداد بڑھنے لگی تھی اور پھر اینڈ رزلٹ وہی ہوا تھا جو فلک نے چاہا تھا۔ سلمان نے

اسے پروپوز کر دیا اور اس نے ایک لمحہ کے تاہل کے بغیر یہ پروپوزل قبول کر لیا۔ سلمان اسے

پہلی ملاقات میں ہی دوسرے مردوں سے مختلف لگا تھا۔ فلک بیس سال کی تھی اور وہ اس سے

دس سال بڑا تھا فلک کی طرح وہ نہ تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھڑک اٹھتا تھا اور نہ ہی کسی بات پر

فوراً اپنا رد عمل ظاہر کرتا تھا۔ وہ بہت سوجر اور ڈینٹ تھا۔ پرسکون انداز میں ٹھہر ٹھہر کر دیکھی

آواز میں بات کیا کرتا تھا اور فلک کسی سحر زدہ معمول کی طرح اسے بات کرتے دیکھتی رہتی

تھی۔ وہ کبھی بھی کسی کی بات اتنے انہماک سے نہیں سنتی تھی جس طرح وہ سلمان کو سنتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ سلمان کے پروپوز کرنے پر جیسے اس کی دلی مراد پوری ہو گئی تھی اسے

پہلی بار اپنی خوش قسمتی پر یقین آیا تھا لیکن ابھی کچھ مشکلات باقی تھیں۔

گھر میں اس پروپوزل کا ذکر کرنے پر جیسے ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا۔ شیراگلن کو

اعتراض تھا کہ وہ ان کی برادری کا نہیں ہے اور ویسے بھی وہ فلک سے دس سال بڑا تھا۔ ایک

اور اعتراض انہیں یہ تھا کہ وہ بلاشبہ ایک دیل آف فیملی سے تعلق رکھتا تھا مگر وہ فیملی شیراگلن

جلیل کی لکڑی نہیں تھی فلک کے لیے اگر یہ ساری باتیں بے معنی تھیں تو شیراگلن کے لیے یہی

چیزیں اہمیت رکھتی تھیں۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے داماد بھی ویسا ہی چاہتے تھے اور سلمان اس

معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ مگر فلک کی ضد کے آگے ان کی مخالفت زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتی تھی۔ وہ

اس کے رونے دھونے اور خاموشی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور انہوں نے سلمان کے رشتہ کو

نہ چاہتے ہوئے بھی قبول کر لیا تھا۔

مگر شیراگلن کی ناپسندیدگی سلمان سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ منگنی کے فوراً بعد ان

کے اختلافات ایک بار پھر ابھر کر سامنے آئے تھے جب شیراگلن نے یہ کوشش کی تھی کہ سلمان

اپنی فیکٹری چھوڑ کر ان کے بزنس کو دیکھنا شروع کرے۔ انہوں نے یہ پیش کش فلک کے ذریعے

کی تھی۔

”یعنی تمہارے فادر کو ایک ایسا داماد چاہئے جو ان کی فائلوں والا بریف کیس اٹھا کر

ان کے پیچھے پیچھے چلے، سروٹ کم سن ان لاء۔“ اس کا لہجہ طنزیہ تھا فلک کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”تم کیسی باتیں کر رہے ہو سلمان؟ کیا میرے پاپا تمہیں نوکر بنا کر رکھیں گے۔ وہ تو

صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم ان کا بزنس سنبھالنا شروع کر دو ظاہر ہے ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے اور

میری شادی جس سے بھی ہوتی، اسے پاپا کا بزنس تو سنبھالنا ہی ہوتا۔“ اس نے وضاحت پیش

کرنے کی کوشش کی تھی۔

”اور میری سراسر کی فیکٹری کا کیا ہو گا؟“ اس نے کچھ دیر بعد فلک سے پوچھا

تھا۔

”تم اپنے کسی بھائی کے سپرد کر سکتے ہو یا اپنی جگہ کوئی جنرل منیجر رکھ سکتے ہو۔“ فلک

نے مشورہ دیا تھا۔ وہ کافی کے سب لیتے ہوئے کچھ دیر تک اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ ”کچھ چیزیں

ایکدہ ہیں جن کے بارے میں، میں نے تم سے بات ہی نہیں کی اور یہی غلطی کی ہے، میرا خیال

ہے انجنٹ سے پہلے ہی مجھے تم سے ان چیزوں کے بارے میں بات کر لینی چاہئے تھی۔“ اس کا

لہجہ خاصا سرد تھا۔

فلک کچھ چونک گئی تھی۔

”مجھے شادی ایک لڑکی سے کرنی ہے۔ کوئی ہاس گھر لے کر نہیں آتا ہے۔ میرا خیال

ہے میں اس طرح کا شوہر ثابت نہیں ہو سکتا جس طرح کا تمہیں یا تمہارے گھر والوں کو

ضرورت ہے۔ اگر میرا اپنا بزنس نہ ہوتا تو میں تمہارے فادر کے بزنس کے بارے میں سوچتا

لیکن اب میری اپنی فیکٹری ہے جو پوری طرح سے اسٹبلش ہے۔ تم چاہتی ہو، میں وہ چھوڑ کر

تمہارے فادر کے بزنس کو جو ان کر لوں جو میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ میں اپنی زندگی کو اپنے طریقے سے گزارنا چاہتا ہوں۔ بیوی یا ان لازمی مرضی کے مطابق نہیں۔ میرا خیال تھا ہم نے کافی وقت اکٹھا گزارا ہے تم مجھے کسی نہ کسی حد تک سمجھ چکی ہو گی مگر میرا خیال غلط ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے ہمیں کسی نئے رشتے میں بندھنا نہیں چاہئے۔“

اس نے اپنی بات کے اختتام پر اپنی انگلی سے منگنی کی انگلی اتار کر فلک کے سامنے نیبل پر رکھ دی تھی۔ وہ بالکل بے حس و حرکت تھی۔ اس نے والٹ نکال کر بل کے پیسے مینو کارڈ میں رکھے اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ فلک کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی چھوٹی سی بات پر یہ قدم.....

اس نے اسے ریسٹورنٹ کے دروازے سے نکلنے دیکھا تھا اور پھر جیسے وہ اپنے حواس میں واپس آگئی تھی۔ اپنا بیگ اور انگلی اٹھا کر وہ بھاگتی ہوئی اس کے پیچھے گئی تھی۔ وہ پارکنگ کی طرف جا رہا تھا۔

”آئی ایم سوری سلمان! اگر تم میری بات پر ہرٹ ہوئے ہو تو..... لیکن میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ اس نے پاس آ کر اس کے کندھے کو تھام کر لجاجت سے کہا تھا۔ وہ رک گیا تھا۔ ”بات ہرٹ ہونے یا نہ ہونے کی نہیں ہے بات اپنی اپنی خواہش اور ضرورت کی ہے۔ تمہارے فادر کو واقعی ایک شخص کی ضرورت ہے جو ان کے بزنس کو سنبھالے مگر میں.....“

اس نے بڑی نرمی سے اس سے کہا تھا مگر فلک نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اس موضوع پر ہمارے درمیان دوبارہ کبھی بات نہیں ہوگی۔ جو تم چاہو گے وہی ہوگا۔ پاپا کیا سوچتے ہیں یا کیا چاہتے ہیں۔ میں تم سے دوبارہ کبھی اس بات کا ذکر نہیں کروں گی۔“ اس نے قطعی لہجے میں سلمان سے کہا تھا ”اور اب تم یہ انگلی پہن لو۔“

سلمان نے کچھ سوچتے ہوئے رنگ پکڑ لی۔

شیر انگن کی ناراضگی سلمان کے اس انکار کے بعد کچھ اور بڑھ گئی تھی انہوں نے فلک کو سلمان کے خلاف اکسانے کی کوشش کی تھی مگر وہ اب ان کی کوئی بات سننے پر تیار نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ سلمان اگر ان کا بزنس جو ان نہیں کرنا چاہتا ہے تو انہیں اس پر اصرار نہیں کرنا چاہئے۔ ویسے بھی وہ سلمان کی اس حرکت کے بعد خوفزدہ ہو گئی تھی بہت دنوں تک وہ اس واقعہ کو ذہن سے نہیں نکال سکی تھی۔

”کیا سلمان کے نزدیک میری ذرا بھی اہمیت نہیں تھی کہ اس نے اتنی معمولی سی

بات پر انگلی اتار کر پھینک دی؟“

یہ سوال بار بار اس کو خوفزدہ کر دیتا تھا۔

”مگر..... اگر اس کے نزدیک میری کوئی اہمیت نہ ہوتی تو وہ مجھے شادی کا پرپوزل کیوں دیتا۔“ وہ جیسے خود کو تسلی دینے کی کوشش کرتی تھی۔ ”ایک شخص سے محبت، انسان کو کتنا مجبور کر دیتی ہے میں نے زندگی میں کسی کی پراہ ہی نہیں کی اور اب اس شخص کی پراہ کی ہے تو مجھے احساس ہوا ہے کہ محبت کرنے کے بعد بندے کو کتنا جھکنا پڑتا ہے صرف اس خوف سے کہ کہیں دوسرا آپ کو چھوڑ نہ دے۔“

وہ سوچتی تھی۔ ہر بار یہ سوچ اسے دل گرفتہ کر دیتی تھی اور ہر بار سلمان کے سامنے آنے پر اس کی ساری دل گرفتگی جیسے دھواں بن کر غائب ہو جاتی تھی۔ اس کے سارے شکوے جیسے ختم ہو جاتے تھے۔ وہ عام مردوں کی طرح لمبی چوڑی باتیں کرتا تھا نہ ہی اس کے حسن کے تعصیے پڑھتا مگر فلک کو اس کی موسم کے حالات کے بارے میں کبھی جانے والی بات بھی کسی خوبصورت اور رو میٹک شعر سے زیادہ اچھی لگتی تھی وہ نہیں جانتی تھی کہ سلمان کو اس کے ساتھ بیٹھنا ہاتھیں کرنا اس کے ساتھ چلنا پھرنا کیسا لگتا تھا۔ مگر اسے سلمان کے ساتھ چلتے ہوئے اپنے وجود پر فخر ہوتا تھا یوں جیسے وہ سلمان کو نہیں پورے جہان کو اپنے ساتھ لیے پھر رہی ہو۔ جیسے دنیا میں اس کے علاوہ ہر لڑکی خالی ہاتھ ہو۔

اس کی زندگی میں اگر سلمان پہلا مرد تھا تو سلمان کی زندگی میں آنے والی بھی وہ پہلی لڑکی ہی تھی۔ وہ شروع سے ہی بہت ریزرو طبیعت کا ملک تھا اور لڑکیوں کے ساتھ گھومنا پھرنا کبھی بھی اس کی عادت میں شامل نہیں رہا تھا۔ فلک کی طرح وہ بھی اپنی خوبصورتی اور صنف مخالف کے لیے اپنی کشش سے واقف تھا اور اس کی طرح وہ خود پرست بھی تھا اور اتنا پرست بھی لیکن ان دونوں باتوں کے باوجود بھی فلک کی محبت میں گرفتار تھا۔ ہاں یہ محبت فلک کی طرح طوفانی اور سب کچھ قربان کر دینے والی نہیں تھی۔

ان کی منگنی تقریباً تین سال رہی تھی اور ان تین سالوں میں فلک نے خود کو سلمان کی پسند کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ وہ سلمان کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے کا سوچ ہی نہیں سکتی تھی جو رنگ سلمان کو پسند تھے اس نے بھی وہی پہننا شروع کر دیئے تھے۔ جو رنگ سلمان کو ناپسند تھے وہ جیسے اسکی زندگی سے بھی نکل گئے تھے۔ جو چیز سلمان کو کھانے میں پسند تھی۔ لاشعوری طور پر وہ اس کی پسند بھی بن گئی تھی اور جس چیز سے سلمان بھاگتا تھا۔ وہ بھی اسے اتنا ہی ناپسند کرنے لگی تھی اور یہ سب کچھ سلمان کے کہے بغیر ہوا تھا۔ سلمان نے کبھی اسے کسی

بات پر مجبور نہیں کیا تھا مگر وہ خود ہی اسے خوش رکھنا چاہتی تھی۔ سرتا پاس کی پسند میں دھل جانا چاہتی تھی اس کی دوستیں اس میں آنے والی تبدیلیوں پر حیران تھیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ فلک شیر انگن جو پتا نہیں خود کتنے دلوں کی دھڑکن ہے۔ وہ اپنے آپ کو صرف ایک شخص کے لیے اتنا بدل دے گی۔ اس کی ہر بات میں سلمان الفکر کا ذکر آتا تھا۔ بعض دفعہ اس کی دوستیں اس بات پر اس کا مذاق اڑاتیں مگر فلک کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔

تین سال بعد بڑی دھوم دھام سے اس کی اور سلمان کی شادی ہو گئی تھی۔ شادی سے کچھ عرصہ پہلے ہی سلمان نے اپنے لیے ایک علیحدہ گھر لے لیا تھا اور فلک شادی کے بعد اس گھر میں گئی تھی۔ شادی کے بعد فلک کے دل میں سلمان کے بارے میں جو تھوڑے بہت خدشات تھے وہ بھی ختم ہو گئے تھے، وہ ایک بہت ہی محبت کرنے والا اور خیال رکھنے والا شوہر ثابت ہوا تھا۔ شادی سے پہلے کی جس بے نیازی اور بے پروائی نے فلک کو خوفزدہ کیا تھا۔ وہ شادی کے بعد غائب ہو گئی تھی۔ وہ فلک کا کسی ننھے بچے کی طرح خیال رکھتا تھا۔ شادی سے پہلے کی اس کی کم گونی بھی ختم ہو گئی تھی۔

فلک کو اپنی زندگی پر پہلی بار رشک آنے لگا تھا۔ ٹھیک ہے میں نے اس شخص کے لیے اپنے آپ کو بہت بدلا ہے اسے خوش کرنے اور خوش رکھنے کے لیے بہت کچھ چھوڑا ہے مگر وہ سب بے کار تو نہیں گیا۔ سلمان الفکر کو احساس ہے کہ میں نے اس کے لیے کیا کیا ہے اور اس کے نزدیک میری، ہر قربانی ہر ایثار کی اہمیت ہے۔“

وہ اکثر سوچتی اور مسرور ہوتی رہتی۔ شادی کے بعد سلمان الفکر کے شیر انگن کے ساتھ بھی تعلقات اچھے ہو گئے تھے حالانکہ فلک کو خدشہ تھا کہ شاید سلمان کی اتنا ان تعلقات کی بہتری میں رکاوٹ بنے گی مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اکثر فلک کے ساتھ اس کے گھر جایا کرتا تھا اور میمونہ اور شیر انگن دونوں کی بہت عزت کرتا تھا۔ خود شیر انگن بھی اس کے بارے میں اپنے پچھلے خیالات اور رائے بدلنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ فلک کو اس کے ساتھ اس قدر خوش دیکھ کر اور سلمان کے طور طریقے دیکھ کر وہ اسے پسند کرنے لگے تھے۔

سلمان بہت لبرل قسم کا آدمی تھا اور کچھ بھی حال فلک کا تھا۔ شیر انگن اور میمونہ نے جس ماحول میں فلک کی تربیت کی تھی وہاں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ بچپن میں ایک بار قرآن پاک پڑھ لینے کے بعد فلک نے دوبارہ اس مقدس کتاب کو ہاتھ لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ نماز اور روزے سے بھی وہ اپنی ماں کی طرح بے نیاز تھی۔ اس کا خیال تھا کہ آج کے دور میں اتنا مذہبی ہونا خاصا دقیانوسی کام ہے۔ جب کبھی دوستوں سے اس کی اس

موضوع پر بات ہوتی تو وہ کہتی۔

”دیکھو یارا! مجھے قیامت وغیرہ پر زیادہ یقین نہیں ہے جو کچھ ہوتا ہے دنیا میں ہی ہو گا۔ اچھی یا بری جیسی زندگی بھی گزرنی ہے بس ایک بار ہی گزرنی ہے ایسا بار بار نہیں ہو گا۔ رشنا کو بعض دفعہ اس کی باتوں پر اعتراض ہوتا کیونکہ وہ باقاعدگی سے نہ سہی لیکن نماز وغیرہ پڑھ لیا کرتی تھی۔ فلک اس کے اعتراض پر ہر دفعہ مسکرا کر کہتی۔

”دیکھو رشنا! یہ عبادت وغیرہ بندہ تب کرتا ہے جب اس کی اللہ سے لمبی چوڑی فرمائشیں ہوں یا پھر اس نے اچھے خاصے گناہ کئے ہوں۔ میرے ساتھ تو دونوں مسئلے نہیں ہیں نہ تو میں اللہ سے کچھ مانگتی ہوں اور نہ ہی میں کوئی گناہ کرتی ہوں پھر ہر وقت مصلے پر بیٹھے رہنے کا کیا فائدہ۔“

رشنا ہر بار خاموش ہو جاتی تھی۔ وہ اسے دلیل سے قائل نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ خود اس کا مذہب کے بارے میں علم بہت کم تھا اور وہ فلک کو دلیل کیسے دے سکتی تھی۔ فلک کے برعکس سلمان اس طرح کی باتیں تو نہیں کرتا تھا۔ لیکن نماز، روزے سے وہ بھی کوسوں دور تھا۔ اس کے نزدیک اتنا ہی اسلام کافی تھا کہ بندہ مسلمان ہو اور اس کا نام بھی مسلمانوں والا ہو۔ ہاں زندگی کو ویسے گزارنا چاہئے جیسا زمانہ ہو۔

اس سے پھر وہ دونوں راوی کی سیر کے لیے گئے تھے۔ شادی سے پہلے بھی وہ دونوں اکثر یہاں آیا کرتے تھے۔ فلک کو یہاں دریا کے کنارے پر تہائی اور خاموشی میں آکر بیٹھنا بہت پسند تھا۔ بعض دفعہ جب سلمان اس کے ساتھ نہ ہوتا تو وہ اپنی کسی دوست کو ساتھ لے آتی۔ کشتی کے ذریعے وہ کامران کی بارہ درمی میں چلے گئے۔ دریا کے وسط میں بنی ہوئی یہ مظہر دور کی عمارت اسے بڑی اٹریکٹ کیا کرتی تھی۔ سلمان اور وہ بارہ درمی کے مختلف حصوں میں پھرتے اور باتیں کرتے رہے۔ پھر جب شام ڈھلنے لگی تو وہ دونوں ایک بار پھر کشتی کے ذریعے بارہ درمی سے واپس کنارے پر آ گئے تھے۔

کنارے سے اوپر سڑک پر جانے کے لیے انہوں نے چلنا شروع کیا تھا جب فلک نے پھٹے کپڑوں اور لمبے بالوں اور داڑھی والے ایک فقیر کو دیکھا تھا۔ وہ دریا کے کنارے سے کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا۔ اس کی داڑھی اور بالوں میں کچھ لگا ہوا تھا اور پھٹے کپڑوں میں سے اس کا سیاہ سونکا ہوا جسم نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنی قمیص کے دامن میں کچھ پتھر اکٹھے کئے ہوئے تھے اور وہ وقفے وقفے سے گڑھے میں پتھر پھینک رہا تھا۔ پتھر گرنے پر کچھ اور پانی اچھل کر ادھر ادھر گر رہا تھا۔ ان دونوں کو فقیر کے سامنے گزر کر جانا تھا اور فلک کا خیال تھا کہ ان کے

گزرتے وقت فقیر پانی والے گڑھے میں پتھر نہیں پھینکے گا یہی اطمینان لیے وہ ہاتھیں کرتی ہوئی مسلمان کے ساتھ اس گڑھے کے پاس سے گزرنے لگی اور اسی وقت فقیر نے اپنی گود میں رکھا ہوا سب سے بڑا پتھر اٹھا کر گڑھے میں پھینکا تھا۔ ایک چھپا کے کے ساتھ گدلا پانی اڑ کر فلک کے چہرے اور لباس کو داغدار کر گیا تھا۔ مسلمان دوسری جانب تھا اس کے کپڑوں پر بھی چھیننے پڑے مگر ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی مگر فلک کے سفید لباس پر وہ کچھ بہت نمایاں ہو گیا تھا۔

”یو ایڈٹ! اندھے ہوتے، نظر نہیں آتا تمہیں کہ کوئی گزر رہا ہے۔“ وہ غصے کے عالم میں چلائی تھی۔

”میں واقعی اندھا ہوں۔ مجھے دنیا نظر نہیں آتی۔“

وہ اسکی بات پر ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔ اپنے حلیے کے برعکس اس فقیر کی آنکھوں اور آواز میں بہت سکون، بہت ظہر آؤ تھا۔ اس کا لب و لہجہ بہت شائستہ تھا۔ وہ ان پڑھ نہیں لگتا تھا۔

”اگر اندھے ہو تو یہاں بیٹھ کر لوگوں کو گندا کیوں کر رہے ہوں جاؤ کہیں اور جا کر بیٹھو یا اپنے ہاتھوں پر قابو رکھو۔“ اس کا غصہ پھر عود کر آیا۔ اس نے نشوونکال کر چہرے سے کچھ صاف کرنا شروع کیا تھا۔

”بی بی! تو گندگی سے کیوں ڈرتی ہے۔ تجھے کیا لگتا ہے، یہ کچھ تجھے کسی کی نظر سے اوجھل کر دے گا۔ تجھے لگتا ہے اتنا سا کچھ اس شخص کی محبت کو ختم کر دے گا۔“

اس بار اس نے عجیب سے لہجے میں مسلمان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا تھا۔

”اس شخص کی پرواہ نہ کر۔ اللہ کی پرواہ کر۔ اللہ کو کچھ اور گندگی سے غرض نہیں ہوتی۔ اس کی نظر میں جو ایک بار آ جاتا ہے۔ ہمیشہ رہتا ہے اور اس نظر کو کچھ کی پرواہ نہیں ہوتی۔ یہ دیکھو دیکھو۔“

وہ ایک دم اٹھ کر کچھ کے اس گڑھے کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور پھر اس نے کچھ نکال نکال کر اپنے چہرے اور لباس پر ملنا شروع کر دیا۔

”دیکھو، میں تو کچھ سے نہیں ڈرتا۔ میں تو گندگی سے خوف نہیں کھاتا۔ جانتا ہوں۔ اس کی نظر اس کچھ اور گندگی پر نہیں جائے گی۔ وہ صرف میرے وجود کو دیکھے گا۔“

اس بار بات کرتے ہوئے وہ ہذیبانی کیفیت میں تھا۔ وہ نشو کے ساتھ چہرہ صاف کرتے ہوئے اسے دیکھتی رہی اور اس کے اشتعال میں اضافہ ہوتا گیا تھا۔ ”میں جس کی نظر میں ہوں، میرے لیے کافی ہے۔ مجھے جس کی محبت چاہئے، مل چکی ہے مجھے اور کسی کی محبت کی

پرواہ نہیں ہے۔“

”یہ تو دروازہ ہے، دروازے کا کام رستہ دینا ہوتا ہے یا رستہ روکنا، تیرا رستہ اس نے روک دیا ہے۔ تیرا ہی کیا ہر عورت کا رستہ اس نے روک دیا ہے۔ آگے جانے ہی نہیں دیتا۔ اسے لے کر کیا کرے گی تو یہ کھل نہیں ہے بی بی! یہ کھل نہیں ہے۔ تو کھل کی خواہش کیوں نہیں کرتی وجود کی طلب کیوں ہے تجھے۔ ذات کی چاہ کیوں نہیں ہے؟“ اس کا ہاتھ ایک بار پھر مسلمان کی طرف اٹھا ہوا تھا۔

”تم بھکاری لوگ رستے میں بیٹھ جاتے ہو اور پھر بکو اس کرنا شروع کر دیتے ہو چلو مسلمان۔“

اس نے یک دم مسلمان کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے چلنا شروع کر دیا جو اب تک بالکل خاموشی سے ساری گفتگو سنتا رہا تھا۔

”ہر ایک کو بھکاری بنا کر رستے میں بٹھایا ہوا ہے اور ہر ایک خود کو مالک سمجھتا ہے جب تک ٹھوکر نہیں لگتی، جب تک گھنٹوں پر نہیں گرتا۔ اپنی اوقات کا پتا ہی نہیں چلتا۔ وجود کے نصیب میں ہے بھکاری ہونا، بس ذات بھکاری نہیں ہو سکتی۔ وجود کے مقدر میں مانگتا ہے، ذات کا وصف دینا ہے۔ میں کیا، تو کیا بی بی! سب بھکاری ہیں۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں، کبھی نہ کبھی بھکاری بننا ہی پڑتا ہے۔ مانگنا ہی ہوتا ہے۔ کوئی عشق مانگتا ہے کوئی دنیا اور جو یہ نہیں مانگتا وہ خواہش کا ختم ہو جانا مانگتا ہے۔“

وہ فقیر بلند آواز میں بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ اوپر سڑک کی طرف جاتے ہوئے بھی اس کی بڑبڑاہٹ اس کے کانوں میں آرہی تھی اور اس کے اشتعال میں اضافہ ہو رہا تھا۔

”تم بھی عجیب ہو مسلمان! تم سے اتنا نہیں ہوا کہ اسے جھڑک ہی دو، وہ کس طرح مجھ سے بات کر رہا تھا۔ مگر تم بالکل چپ کھڑے رہے۔“ اس نے یک دم مسلمان سے کہنا شروع کیا تھا۔

”میں کیا کہتا اسے، وہ کوئی پاگل تھا۔ اس سے بحث کر کے مجھے کیا ملتا؟ تم نے بھی تو بحث کی ہے کیا فائدہ ہوا؟ بہتر تھا، تم بات بڑھاتیں ہی نہ خاموشی سے نظر انداز کر کے وہاں سے آ جاتیں۔“

مسلمان نے اس سے کہا تھا۔ وہ اس کی بات پر کچھ اور جھڑک اٹھی۔ ”اے نظر انداز کر کے آ جاتی تاکہ وہ کسی اور کے ساتھ بھی یہی کچھ کرتا، پاگل نہیں تھا وہ، ڈھونگی تھا۔ دیکھا نہیں کس طرح کی باتیں کر رہا تھا۔ کیا باتوں سے اس کے پاگل پن کا پتہ چلتا ہے؟ نئے نئے

طریقے اپنائے ہوئے ہیں ان لوگوں نے بھیک مانگنے کے۔ ہر جگہ بیٹھ جاتے ہیں اور تمہارے جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی ان کا حوصلہ اتنا بڑھ جاتا ہے۔ میرا تو دل چاہ رہا تھا، میں وہی پتھر اٹھا کر اس کے سر پر ماروں۔ اسے پتا تو چلے۔ اندھا ہے وہ الو کا پٹھا۔“ اس کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

”کول ڈاؤن یارا! اب اتنا زیادہ غصہ کرنے کا کیا فائدہ ہے، جو ہو گیا ہو گیا۔ اب ان باتوں کو دہرانے کا کیا فائدہ، گھر چل رہے ہیں، تم کپڑے بدل لینا بلکہ نہا لینا۔ یہ کچھ ختم ہو جائے گی تم خواجواہ اس بات کو سر پر سوار کر رہی ہو۔“

مسلمان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ”خیر میں کسی بھی بات کو خواہ مخواہ سر پر سوار نہیں کیا کرتی۔ جو بات ٹھیک تھی، میں نے وہی کہی ہے۔ آئندہ کم از کم کسی دوسرے کے ساتھ ایسا کرے ہوئے دس بار سوچے گا۔“ اس کا غصہ ابھی کم نہیں ہوا تھا مگر اس نے مزید کوئی بات نہیں کی تھی مسلمان نے بھی اس کے خاموش ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا تھا گھر پہنچنے تک اس کے ذہن سے یہ بات نکل چکی تھی۔

اس واقعہ کو تقریباً چھ ماہ گزر گئے جب اس نے مسلمان میں کچھ تبدیلیاں نوٹ کرنی شروع کی تھیں۔ شادی کے ڈھائی سال اور اس سے پہلے کے تین سال جو اس نے مسلمان کے ساتھ گزارے تھے۔ ان میں اس نے مسلمان کو ایک بے حد عناد سے مزاج کا انسان پایا تھا۔ وہ بڑی سے بڑی بات پر بھی فوری ردِ عمل کا اظہار نہیں کرتا تھا اور نہ ہی غصہ میں آتا تھا بلکہ اپنی ناراضگی کا اظہار بھی بڑے دھیمے لہجے میں کرتا تھا لیکن اب وہ ایک دم چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھڑکنے لگا تھا۔

فلک نے پہلے اس بات پر اتنی توجہ نہیں دی۔ لیکن پھر جب ایسا اکثر ہونے لگا تھا تو وہ کچھ پریشان ہوئی لیکن پھر اس نے یہ سوچ کر سب کچھ نظر انداز کرنے کی کوشش کی کہ ہو سکتا ہے فیکٹری کے کسی معاملے کی وجہ سے وہ پریشان ہو۔ اس نے مسلمان سے یہ پوچھنے کی کوشش کی تھی مگر ان دنوں وہ اس کی کسی بھی بات کا ڈھنگ سے جواب نہیں دیتا تھا۔ وہ ہر وقت جھنجھالیارہتا تھا اور کسی بھی چھوٹی سی بات پر اسے فلک پر اپنا غصہ اتارنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس نے پہلے کی طرح فلک کے ساتھ اس کے میکے جانا چھوڑ دیا تھا بلکہ اسے فلک کے وہاں جانے پر بھی اعتراض ہونے لگا تھا اس کا خیال تھا کہ فلک کو اپنے گھر سے زیادہ اپنے ماں باپ کے گھر میں دلچسپی تھی اور وہ اپنا زیادہ دقت وہاں گزارنا چاہتی تھی۔ جب ایک دو بار اس نے اس طرح کی باتیں کیں تو فلک نے بہتری اسی میں سمجھی کہ وہ فی الحال اپنے والدین کے گھر جانا

چھوڑ دے اس کا خیال تھا کہ اگر اس کی ناراضگی اور رویے میں تبدیلی کی وجہ یہ ہے تو یہ وجہ ختم ہونے کے بعد وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا، اس کے اعتراض اور نکتہ چینیوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ پہلے کی طرح اسے وہ ہر شام اسے اپنے ساتھ باہر لے کر نہیں جاتا تھا اور فلک کے اصرار پر وہ بگڑ جاتا تھا اس کا خیال تھا کہ اسے صرف باہر گھومنے پھرنے سے دلچسپی ہے گھر کا کوئی خیال نہیں۔

یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا اور فلک حقیقت میں پریشان ہو گئی تھی پھر ان ہی دنوں وہ گھر سے رات دیر تک غائب رہنے لگا تھا۔ اس سے پہلے اس کی عادت تھی کہ وہ صبح نو بجے فیکٹری جاتا اور شام پانچ بجے گھر آ جاتا۔ اگر اسے ایمر مرضی میں کہیں اور جانا پڑتا یا فیکٹری میں رکنا پڑتا تو وہ فلک کو اطلاع دے دیا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ پانچ بجے کے بجائے رات دس گیارہ بجے واپس آنے لگا تھا۔ اگر فلک اس سے پوچھنے کی کوشش کرتی تو وہ کہتا۔

”میری مرضی، میں جب چاہوں گھر میں آؤں اور ضروری نہیں ہے کہ میں جہاں جاؤں، تمہیں اطلاع دے کر جاؤں۔ میں تمہارا ملازم نہیں ہوں۔“

فلک اس کی بات سے زیادہ اس کے لہجے پر روہانسی ہو جاتی۔

”لیکن میں پریشان ہو جاتی ہوں۔“

”تم کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں ننھا بچہ نہیں ہوں۔“ وہ بات ہی ختم

کر دیتا تھا۔

فلک اس صورت حال سے بہت پریشان ہو گئی تھی۔ رشنا شادی کے بعد کبھی چلی گئی تھی وہ اس کے ساتھ یہ سب ڈسکس نہیں کر سکتی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے مریم سے بات کی تھی۔ وہ اس کی بات پر جیسے اچھل پڑی تھی۔

”اتنے مہینوں سے مسلمان کا یہ رویہ ہے اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔“

”میں نے تمہیں کیا کسی کو بھی نہیں بتایا۔ میرا خیال تھا وہ کسی وجہ سے پریشان ہے

اس لیے وقتی طور پر اس طرح ہو گیا ہے مگر اب تو۔“

”تم اتنی جو تم نے اسے اتنی ڈھیل دے دی۔ یہ سب اس کے آگے پیچھے

پھرنے کا نتیجہ ہے۔ میرا خیال ہے وہ کسی اور لڑکی کے چکر میں ہے۔“

وہ مریم کے انداز سے پرہکا نکارہ گئی۔

”تم کیا کہہ رہی ہو مریم؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مسلمان اس طرح کا نہیں ہے اور ابھی

تو ہماری شادی کو صرف ڈھائی تین سال ہوئے ہیں۔“ وہ جیسے خوفزدہ ہو گئی تھی۔

”تم اگر حقیقت کا سامنا نہیں کرنا چاہتیں تو اور بات ہے ورنہ اس طرح بات بے بات لڑنا، تم میں نقص نکالنا، تمہارے کاموں پر اعتراض کرنا، راتوں کو دیر تک گھر سے باہر رہنا اس سب کا مطلب ایک ہی ہے کہ ان کی زندگی میں کوئی اور موصوفہ آچکی ہیں۔“
وہ ہونق بنی مریم کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”تو پھر اب میں کیا کروں مریم؟ اب کیا ہوگا؟“

کچھ لمبے گزرنے کے بعد اسے مریم کی باتوں پر یقین آنے لگا تھا۔

”کچھ نہیں ہوگا، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ تم ذرا خود پر پہلے سے زیادہ دھیان دو، ذرا اچھے اور ٹھیک ٹھاک قسم کے کپڑے پہنو۔ اس پر زیادہ توجہ دو۔ ہو سکے تو اس کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے کہیں باہر چلی جاؤ جن باتوں پر اسے اعتراض ہے، وہ چیزیں ہونے ہی نہ دو کوشش کرو کہ اسے کسی بات پر اعتراض کا موقع ہی نہ ملے اور پھر بھی اگر وہ ٹھیک نہیں ہوتا تو اس سے صاف صاف بات کرو کہ اس کے اس رویے کی کیا وجہ ہے وہ کیا چاہتا ہے۔“

مریم نے اسے جیسے گرتا نہ شروع کر دیئے تھے۔ وہ بڑے انہماک سے اس کی باتیں سنتی رہی، اس کے گھر سے واپسی پر وہ سیدھا گھر جانے کے بجائے بیوٹی پارلر چلی گئی تھی۔ اس نے وہاں جا کر اپنی ہمسر اشائل تبدیل کروایا۔

بالوں میں اسٹریکس ڈلوائیں۔ آئی براؤز کی شپ کو کچھ اور ٹیکھا کر دیا۔ واپس گھر آنے کے بعد اس نے سلمان کا پسندیدہ لباس پہنا تھا مگر میک اپ کرنے کے بعد اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو دیکھا اسے یقین تھا کہ وہ کبھی بھی اتنی خوبصورت اور فریش نہیں لگی تھی جتنی آج لگ رہی تھی۔

وہ رات گزارا بچے آیا تھا اور خلاف معمول اس نے فلک کو لاؤنج میں دیکھا تھا۔ اس نے کچھ حیرانی سے اس کی تیاریوں کو دیکھا تھا اور پھر ایک لفظ بھی بولے بغیر بیڈروم میں چلا گیا۔ وہ کچھ دل گرفتہ ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اتنی خوبصورت لگ رہی ہے کہ وہ چند لمحوں تک تو اس سے نظر نہیں ہٹا پائے گا مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کی نظر بہت سرسری تھی۔

وہ اس کے پیچھے بیڈروم میں چلی آئی۔ ”میں کھانا لگا دوں؟“ خود پر قابو پا کر اس نے بڑے ہشاش بشاش انداز میں پوچھا تھا۔

وہ ایک بار پھر ٹھٹھکا تھا۔ ”کیا میں تمہیں احمق نظر آتا ہوں کہ اس وقت کھانا کھانے بیٹھوں گا۔“

”لیکن میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔“

”کیوں نہیں کھایا؟ روز تو کھا لیتی ہو تم پھر آج اس خاص عنایت کی وجہ کیا ہے؟ بہر حال کھانا نہیں کھایا تو کھالو۔ یہ تمہارا مسئلہ ہے۔“ وہ بیڈ پر بیٹھا ہوا شوژ اتار رہا تھا۔
”میں نے آج تمہاری پسند کی ڈشز بنوائی ہیں۔“ وہ اب مایوس ہو رہی تھی۔
”مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے ان ڈشز میں اور ہاں ایک بات اور۔“ وہ واش روم کی طرف جاتے جاتے مڑا تھا۔

”کیا سارا دن اس تماشے سے تمہارا دل نہیں بھرتا جو اب تم رات کو بھی اسے لا دکر بیٹھ گئی ہو۔ تم بیوی ہو، ماڈل یا ایکٹریس نہ بنو۔“ اس کا اشارہ اس کے میک اپ اور کپڑوں کی طرف تھا۔ وہ سن ہو گئی تھی۔

”اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ پہلے تو۔ کیا واقعی کوئی دوسری لڑکی۔“

وہ ایک بار پھر خوفزدہ ہو گئی تھی۔ سلمان الصر کے معمولات کو اس کی کسی ”کوشش“ نے نہیں توڑا تھا۔ وہ جس طرح چاہتا رہتا جہاں چاہتا جاتا، جب چاہتا گھر آتا اور جب دل چاہتا گھر نہ آتا۔ دن یہ دن فلک کی فرسٹریشن میں اضافہ ہوتا گیا تھا۔

”تمہیں کیا ہوا ہے، مجھے بتاؤ۔ سلمان تمہیں کیا ہوا ہے؟“

وہ اس دن اس کے انتظار میں رات کے دو بجے تک بیٹھی رہی تھی اور اس کے آتے ہی اس نے اس سے پوچھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جواب دیئے بغیر سیدھا بیڈروم میں چلا گیا تھا۔ وہ لپکتی ہوئی اس کے پیچھے گئی۔ سلمان اپنی ٹائی کھول رہا تھا۔

”سلمان! میرے ساتھ اس طرح کیوں کر رہے ہو؟ میں نے ایسا کیا کر دیا ہے؟“
وہ اس کے مقابل آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ سر دنگروں سے اسے دیکھتا رہا پھر بازو پکڑ کر سامنے سے ہٹا کر ڈرینگ میں چلا گیا۔ وہ برف کے جیسے کی طرح وہیں کھڑی رہی۔

”میں تمہارے سامنے آتی تھی تو سلمان! تمہارا سانس رک جاتا تھا۔ میں بالمقابل آتی تھی تو تمہاری نظر کو اسیر کر لیتی تھی تمہارے وجود کو پہناتا نہ کر دیتی تھی۔ تم میرے معمول بن جاتے تھے۔ اب تم میں یہ طاقت کہاں سے آگئی کہ تم مجھے سامنے سے ہٹا دو۔ میرا جادو توڑ دو۔ مجھ سے نظر چرا جاؤ۔ سلمان الصر میرا خدشہ ٹھیک ہے۔ تمہارے اور میرے درمیان کوئی تیسرا آ گیا ہے، نہیں آگئی ہے۔ کوئی فلک سے بڑھ کر، کوئی فلک سے بہتر اور اب تمہارے وجود پر کیا اسکا جادو چلا کرے گا۔“

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ زور زور سے چلائے چیخے اسے بتائے کہ وہ اس سے کتنی

محبت کرتی ہے۔ اسے یاد دلانے کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتا تھا۔ وہ وہیں بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ چند منٹ بعد نائٹ ڈریس میں ملبوس ڈرینگ سے باہر آ گیا تھا۔ فلک نے بیگلی آنکھوں کے ساتھ اس کے چہرے کو پڑھنا شروع رک دیا تھا اسے وہ بے حد تھکا بہت بچھا بچھا لگا تھا۔ سلمان نے اپنے بیڈ کی طرف جاتے ہوئے ایک نظر اس کے چہرے پر دوڑائی تھی۔ اس کے گال آنسوؤں سے بھیگ رہے تھے وہ آنکھیں چرا کر اپنے بیڈ کی طرف چلا گیا۔ فلک کے دل پر جیسے کسی نے گھونہ مارا تھا۔

”تو اب میرے آنسوؤں میں بھی اتنی طاقت نہیں رہی کہ یہ تمہیں باندھ لیں۔ تمہیں ہلنے نہ دیں۔ کیا ہر چیز آج ہی بے اثر ہو جائے گی۔“

”فلک! اور کچھ بھی کرو مگر میرے سامنے رویا مت کرو۔ میں تمہارے آنسو برداشت نہیں کر سکتا ہوں، دنیا میں کون سی چیز ہے جو تمہیں رونے پر مجبور کرتی ہے، مجھے بتاؤ۔ میں وہ چیز ہی ختم کر دوں گا۔ میں نے تم سے شادی تمہیں رلانے کے لیے نہیں کی ہے۔ تمہارے آنسو دیکھنے کے لیے نہیں کی ہے۔ تم جانتی ہو تمہاری آنکھوں کو خدا نے آنسوؤں کے لیے نہیں بنایا ہے تمہاری آنکھوں کو بننے کے لیے بنایا گیا ہے۔ فلک! رونے کے لیے نہیں۔ تم روتی ہو تو مجھے لگتا ہے جیسے دنیا میں کچھ بھی باقی نہیں رہا، جیسے دنیا ختم ہو گئی ہے۔“

اسے یاد آ رہا تھا، یہ سب اسی شخص نے تو کہا تھا اور آج اس کو میرے آنسو نظر نہیں آئے۔ آج میرے آنسو دیکھ کر کیا اس کے لیے دنیا ختم نہیں ہوئی؟ کیا اس کا سب کچھ باقی رہ گیا ہے۔

وہ ایک دم سسک سسک کر رونے لگی تھی۔ وہ بیڈ پر لیٹ کر لائٹ آف کر چکا تھا۔

”فارگاڈ سیک بند کر دیو رونا دھونا۔ کیا چاہتی ہو تم، کیا میں یہاں نہیں آیا کروں۔ کیا اس گھر سے چلا جاؤں کہیں۔“

وہ ایک دم اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔ وہ بیڈ پر اٹھنا سر پکڑے ہوئے بیٹھا تھا۔ فلک نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آن کر دی۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی تھی۔ وہ اپنے بیڈ سے اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”تمہیں میں اتنی بری کیوں لگنے لگی ہوں سلمان! بات کرتی ہوں تو تمہیں اچھا نہیں لگتا۔ ہنستی ہوں تو تمہیں برا لگتا ہے۔ روتی ہوں تو تم چلاتے ہو۔ اتنی نفرت کیوں ہو گئی ہے تمہیں مجھ سے ایسے تو کبھی بھی نہیں تھے۔ تم مجھے دیکھنا نہیں چاہتے میری آواز سننا نہیں چاہتے تم ایسے نہیں تھے۔ سلمان! تم کبھی بھی ایسے نہیں تھے۔“

اس نے بات کرتے ہوئے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ اسے جیسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ بیڈ سے اٹھ گیا تھا۔

”میں خود نہیں جانتا، مجھے کیا ہو گیا ہے؟“

اس نے فریج کے پاس جا کر پانی کی بوتل نکالی تھی اور اسے کھول کر پانی کے چند گھونٹ پیے۔ وہ بیڈ پر بیٹھی بنا پلکیں جھپکائے اسے دیکھتی رہی، وہ اب بوتل ہاتھ میں لئے بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

”کیا تم کسی اور سے محبت کرنے لگے ہو؟“

اس نے سانس روکتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔ وہ ایک دم اپنی جگہ ٹھہر گیا تھا۔ اس کے چہرے پر رکست خوردگی تھی۔ تھکے تھکے قدموں سے وہ آ کر اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ ابھی تک سانس روکے پلکیں جھپکائے بغیر اس کے جواب کی منتظر تھی۔

”کیا کوئی اور؟“ اس نے ایک بار پھر پوچھنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔

”ہاں فلک! میں کسی اور سے محبت کرنے لگا ہوں۔“

اسے پہلی بار پتہ چلا تھا، کانوں میں سیسہ اترنا کسے کہتے ہیں۔ وہ بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھے گئی۔ ”کیا فلک کے سوا سلمان الہر کو کسی سے محبت ہو سکتی ہے؟ کیا فلک کے ہوتے ہوئے سلمان الہر کو کسی سے محبت ہو سکتی ہے؟“ وہ جیسے گنگ ہو گئی تھی۔

”اب کیا پوچھنا چاہئے؟ وہ کون ہے؟ کیسی ہے؟ یا پھر یہ کہ تمہیں اس سے محبت کیسے ہوئی؟ کیوں ہوئی؟ یا یہ کہ تم اس سے کہاں ملے؟ کیوں ملے؟ یا پھر یہ کہ تم نے مجھ سے یہ سب کیوں چھپایا؟ مجھے دھوکا کیوں دیا؟“

وہ سوالوں کا انبار ذہن میں لیے لرزتے جسم کے ساتھ وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔

”میں نہیں جانتا، یہ سب کیسے ہو گیا۔ میں تمہیں دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا، تمہارے ساتھ بے وفائی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر میرے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ یقین کرو فلک! میں نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے نہیں کیا۔“

وہ سر ہاتھوں میں تھامے بول رہا تھا۔ وہ کسی جیسے کی طرح اسے دیکھتی رہی۔

”وہ میری فیکٹری میں کام کرتی ہے، پیکنگ ڈیپارٹمنٹ میں اس کا نام تابندہ ہے۔“

”کیا وہ بہت خوبصورت ہے؟“ اسے اپنی آواز کسی کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی

”خوب صورت؟ تم نہیں جانتیں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے۔ میں اسے اگر دن میں ایک بار نہ دیکھوں تو یقین کرو، میں کچھ اور دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ یقین کرو فلک! میں چاہوں بھی تو کچھ اور دیکھ نہیں پاتا۔ مجھے کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ تم نے کبھی کسی چمکاڈو کو دن کے وقت دیکھا ہے فلک! میں اس کا چہرہ دیکھے بغیر بالکل ویسا ہی ہو جاتا ہوں۔“

وہ بول رہا تھا، فلک کا چہرہ آنسوؤں سے ایک بار پھر بھیگنے لگا تھا۔

”سلمان! کیا وہ تم سے، مجھ سے زیادہ محبت کرتی ہے؟“ اس نے ڈوبتے ہوئے

جہاز کے کسی بادبان کو کھینچنے کی کوشش کی تھی۔

”ہاں، وہ کرتی ہے، وہ دنیا میں سب سے زیادہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ یہی

کہتی ہے اور مجھے اس کی باتوں پر یقین ہے۔“ وہ اب اس کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔

”کوئی تمہیں مجھ سے زیادہ کیسے چاہ سکتا ہے؟“

”وہ چاہتی ہے، تابندہ چاہتی ہے۔ میں جانتا ہوں۔“

”وہ جھوٹ بولتی ہے سلمان! وہ غلط کہتی ہے۔“ اس نے کسی ننھے بچے کی طرح

روتے ہوئے سلمان کا ہاتھ پکڑا تھا۔ اس نے ایک جھکے سے ہاتھ چمڑا لیا۔

”تمہیں، وہ جھوٹ نہیں بولتی۔ تابندہ کبھی جھوٹ بول ہی نہیں سکتی۔ مجھے اس کے

ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف پر یقین ہے۔ میں نہیں جانتا، ایسا کیوں ہے مگر فلک! وہ بولتی

ہے تو میرا دل چاہتا ہے، اس پر اعتبار کرنے کو۔ میرا دل گواہی دیتا ہے اس کے ایک ایک لفظ

کی سچائی کی۔ اس پر یقین کرنا یا نہ کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے جیسے اس سے محبت کرنا یا نہ

کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔“ وہ کسی آری کے ساتھ اسے کاٹ رہا تھا۔

”تم اس سے محبت کیسے کر سکتے ہو سلمان! تم تو مجھ سے محبت کرتے تھے۔“ اس

نے جیسے اسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔

”مجھے نہیں پتا میں تم سے محبت کرتا تھا یا نہیں مگر مجھے اس سے محبت ہے۔ نہیں محبت

نہیں مجھے عشق ہے، یاد ہے۔ تم نے ایک بار کہا تھا فلک! محبت تو رگوں میں خون بن کر بہتی

ہے۔ میں نے اسے دیکھا تو مجھے پتا چلا، یہ کیسے ہوتا ہے؟ فلک! میں اسے دیکھتا ہوں تو پچنانا ناز

ہو جاتا ہوں، وہ جو کہتی ہے میں وہی کرتا ہوں۔ وہ جو چاہتی ہے۔ مجھ سے وہی ہوتا ہے۔ میں

اس کی آواز نہ سنوں تو مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی وہ ہنستی ہے تو اس کے ہر تہقے کے ساتھ

میرے دل کی ایک دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ وہ قدم اٹھائے تو میرا دل چاہتا ہے میں زمین بن

جاؤں۔ صرف اس لیے کہ اس کے پیروں کے نیچے آ جاؤں وہ مجھ پر سے گزرے اس کے

پیروں کو بھی اگر کوئی چیز چھوئے تو وہ میرا وجود ہو۔ وہ رے کے تو میرا دل چاہتا ہے، دنیا کی ہر

حرکت کرنے والی چیز کو روک دوں، ہر چیز کو چاہے وہ انسان ہو یا مشین یا پھر ہوا یا بہتا پانی۔

میں اسے سب کچھ دے دینا چاہتا ہوں سب کچھ، ہر چیز جو میرے پاس ہے۔ میں اسے دے

دینا چاہتا ہوں چاہے وہ اسے رکھے یا آگ لگا دے یا کسی کو دے دے۔ مجھے پرواہ نہیں بس

میں اسے خوش کرنا چاہتا ہوں۔ اسے بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے، مجھے اس سے عشق ہے۔ تم نہیں

جانتیں فلک وہ اگر ایک خنجر لے کر میرے وجود کو کاٹنا شروع کر دے۔ ایک ایک پور، انگلی،

ہاتھ، کلائی، بازو، کہنی، کندھا تو میں اسے اپنا ایک ایک حصہ دیتا رہوں گا۔ کسی ہچکچاہٹ،

کسی اعتراض کے بغیر اسے حق ہے چاہے تو مارے چاہے تو کاٹے چاہے تو جلادے۔ مگر سب

اپنے ہاتھ سے کرے اپنے ہاتھ سے میں نہیں جانتا فلک، یہ سب کیسے ہوا ہے؟ کیوں ہوا ہے

مگر یہ سب ہو چکا ہے۔ میں تابندہ کے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں میں سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔ ہر

چیز کے بغیر رہ سکتا ہوں۔ مگر اس کے بغیر نہیں۔ اس کے بغیر رہوں گا تو نہ مجھے کچھ نظر آئے گا،

نہ میں کچھ سن سکوں گا نہ کچھ بول سکوں گا۔ میں ایسی زندگی گزارنا نہیں چاہتا فلک! میں ایسی

زندگی گزارنا نہیں چاہتا۔“

وہ اب رو رہا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا اس نے کبھی سلمان انصر کو روتے دیکھا ہو، یوں

بلک بلک کر پھوٹ پھوٹ کر زار و قطار اور وہ بھی ایک عورت کے لیے۔ ایک دوسری عورت

کے لیے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اسے بتائے کہ میرے لیے تم وہی سب کچھ ہو جو وہ تمہارے

لیے ہو گئی ہے۔ میں بھی تمہیں دیکھے بغیر اندھی ہو جاتی ہوں۔ میں بھی تمہاری آواز سے بغیر

کچھ اور سننے کے قابل نہیں رہتی۔ میں بھی تم سے باتیں کیے بغیر کسی دوسرے سے بات نہیں کر

سکتی پھر تمہیں یہ سب کچھ پتا کیوں نہیں چلا۔ مگر وہ بتے آنسوؤں کے ہاتھ خاموش بیٹھی

اسے دیکھتی رہی تھی۔

”میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں فلک! تم اجازت دو گی تو بھ؟ نہیں دو گی تو

بھی میں اس سے شادی کر لوں گا۔ مگر میں چاہتا ہوں یہ کام تمہاری رضامندی سے ہو۔ ہم

دونوں نے بہت سادقت اکٹھے گزارا ہے۔ اچھا دقت گزارا ہے۔ میں تمہیں تکلیف نہیں دینا

چاہتا۔ میں تمہیں ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا مگر میں تابندہ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم تو محبت کرتی

ہو مجھ سے۔ جو محبت کرتے ہیں وہ تو بہت بڑی بڑی قربانیاں دے دیتے ہیں کیا تم مجھے اس

سے شادی کی اجازت نہیں دے سکتیں۔“

وہ اب اس کا ہاتھ تھامے اس سے کہہ رہا تھا۔ صور اسرافیل کیسا ہو گا؟ وہ اب

پڑے گا۔ تابندہ کو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔“

”میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔ خودکشی کروں گی۔“

”یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہوگا۔ تم جو چاہو کر سکتی ہو۔“

”تم نہیں جانتے تم میرے لیے کیا ہو؟“

”مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“

”تابندہ میں ایسا کیا ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔“

”یہ میں نہیں جانتا بس میں اس سے محبت کرتا ہوں۔“

”پھر تم نے مجھ سے شادی کیوں کی تھی؟“

”پتا نہیں، مجھے نہیں کرنی چاہئے تھی، اگر مجھے علم ہوتا کہ میری زندگی میں تابندہ

آئے گی تو میں بھی تم سے شادی نہ کرتا۔“

”میرا وجود تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔“

”نہیں، یہ میرے لیے۔ کچھ نہیں ہے سب کچھ تابندہ ہے۔“

ہر مہرہ باری باری بنتا گیا تھا۔ اس کا سانس گھٹنے لگتا تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر

آگئی۔ لاؤنج میں خاموشی بھی تھی اور تاریکی بھی یہی دونوں چیزیں اس کے اندر تھیں۔ وہ

لائٹ آن کر کے صوفہ پر بیٹھ گئی۔

”دنیا میں تم سے زیادہ مکمل کوئی دوسری لڑکی نہیں ہے۔“ بہت عرصہ پہلے سلمان کی

کہی ہوئی ایک بات اس کے کانوں میں گونجنے لگی تھی۔

”اور اب مجھ سے زیادہ بہتر، زیادہ مکمل تمہیں کوئی دوسری مل گئی ہے۔“

اس نے اپنی آستین سے چہرہ رگڑا تھا۔ پھر اس کے دل میں پتا نہیں کیا آئی۔ وہ

اٹھ کر واش روم میں آگئی۔ دیوار پر لگے ہوئے لمبے چوڑے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر

اس نے اپنے آپ کو دیکھا تھا۔ پھر اس نے اپنے بالوں میں لگا ہوا کلپ اتار دیا۔ اس کے سیاہ

سلکی اسٹپس میں کئے ہوئے بال کا ندھوں پر بکھر گئے تھے۔ اس نے واش بیسن کے ٹل میں

سے پانی لے کر چہرے پر چھینٹنے مارے تھے، پھر تولیہ اسٹینڈ سے تولیہ لے کر چہرے کو خشک

کیا۔

”کیا میں خوبصورت نہیں رہی؟“ اس نے جیسے آئینے سے سوال کیا تھا۔ ”کیا میں

بدصورت ہوگئی ہوں؟ کیا میری آنکھیں اب دلوں کو تسخیر کرنے کے قابل نہیں رہیں؟ کیا میری

مسکراہٹ اپنی کشش کھو چکی ہے؟ کیا میرے ہونٹ اور ناک حسن نہیں صرف گوشت کے

اندازہ لگا سکتی تھی۔

”میں بھی تو تم سے محبت کرتی ہوں، اتنی نہیں بلکہ اس سے زیادہ محبت جتنی وہ لڑکی

تم سے کرتی ہے۔“

اس نے اپنے مہروں کو آگے بڑھانے کی آخری کوشش کی تھی۔ وہ مایوسی سے اس کا

ہاتھ جھٹک کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”مگر مجھے تمہاری محبت کی ضرورت نہیں ہے، مجھے اس کی محبت کی ضرورت ہے۔“

”میں نے کون سی غلطی کی ہے سلمان؟“

”مجھے نہیں پتا بس مجھے اس سے محبت ہے۔“

”میں نے تمہارے لیے کیا نہیں کیا، پچھلے تین سال میں کیا نہیں کیا؟“

”مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے، مجھے بس وہ چاہئے۔“

”میں نے پچھلے تین سال میں زندگی کو ویسے گزارا ہے۔ جیسے تم نے چاہا ہے پھر بھی

تم مجھ سے خوش نہیں ہو۔ بیزار ہو گئے ہو۔“

”تو میں کیا کروں، میں نے تم سے نہیں کہا تھا تم نے یہ سب اپنی مرضی سے کیا۔ مگر

مجھے صرف تابندہ کی ضرورت ہے۔“

”تم مجھے بتاؤ۔ میں کیا کروں کہ تم خوش ہو جاؤ۔ مجھ سے محبت کرنے لگو مجھے ٹھکراؤ۔“

”مجھے تمہاری ضرورت ہی نہیں۔ مجھے تمہاری کوئی بات کوئی چیز خوش نہیں کر سکتی

کیونکہ تم تابندہ نہیں ہو۔“

”میں نے تم سے محبت کی ہے، جو محبت کرتے ہیں، کیا نہیں اس طرح ٹھوکر ماری

جاتی ہے۔ کیا تم مجھے اس طرح چھوڑ دو گے؟“

”جو بھی چیز میرے اور تابندہ کے درمیان آئے گی، میں اسے چھوڑ دوں گا۔ مجھے

پرواہ نہیں ہے کہ کوئی مجھ سے محبت کرتا ہے یا نہیں۔ میرے لیے بس وہ کافی ہے۔“

”میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔“

”مگر مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تابندہ کی ضرورت ہے۔ میں اس کے

بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ تمہیں ہانپنا نہیں چاہتی کسی کے ساتھ،

تمہاری محبت میں کسی برداشت نہیں کر سکتی۔“

”تم چاہو گی تو میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا لیکن تمہیں مجھ سے دستبردار ہونا ہی

لو تھڑے ہیں؟ کیا میری دودھیار رنگت میں کوئی فرق آ گیا ہے؟“ وہ ایک ایک چیز کو ہاتھ لگا کر سوچتی رہی۔

”کچھ بھی نہیں بدلا، کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ نہ آنکھیں نہ ہونٹ نہ رنگت نہ ناک نہ چہرہ نہ بال نہ جسم، کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ پھر اس کا دل کیسے بدل گیا ہے، نظر کیسے بدل گئی ہے۔“ اس نے آئینے کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ آئینہ حسن دکھا رہا تھا سلک کی سیلیولیس سفید نائلی میں ملبوس سنگ مرمر سے تراشیدہ ایک وجود جو سر سے پاؤں تک حسن میں ڈھلا ہوا تھا۔

”کہیں کوئی عیب، کوئی نقص“ اس نے تلاش کرنا شروع کیا تھا۔ ”ہر چیز مکمل ہے پھر بھی اس نے مایوسی سے آئینے کو دیکھا تھا۔“ اگر عشق حسن سے ہوتا ہے تو میں حسن ہوں پھر وہ..... وہ تائبندہ۔“

ایک آگ اس کے وجود کو اپنے حصار میں لینے لگی تھی۔

”ہاں کوئی تو بات ہوگی اس میں، کوئی تو چیز ہوگی اس میں جو سلمان کو مجھ میں ملی جو اسے مجھ سے دور لے گئی۔ جس نے اس کا دل مجھ سے پھیر دیا۔ مجھے بھی تو دیکھنا چاہئے۔ کیا ہے اس عورت میں جس نے سلمان انصر کو یوں مسمرانز کر دیا ہے کہ اسے دنیا نظر نہیں آتی۔ فلک شیر آنگن نظر نہیں آتی۔ مجھے بھی تو دیکھنا چاہئے۔ کیا ہے ان قدموں میں جن کے نیچے وہ اپنے وجود کو مٹی بنا کر بکھیر دینا چاہتا ہے۔ صرف اس چاہ میں کہ وہ قدم اس مٹی کو چھوئیں۔ کیا وہ میرے پیروں سے زیادہ خوبصورت ہو سکتے ہیں۔“

اس نے اپنی نائلی کو اٹھا کر جھک کر اپنے پیر دیکھے تھے۔ وہ اتنے ہی دودھیاء، اتنے ہی نرم و نازک، اتنے ہی مکمل تھے جتنا اس کے وجود کا کوئی دوسرا حصہ۔

”مجھے بھی تو دیکھنا چاہئے، وہ کیسا وجود ہے جس کے نام وہ اپنی ساری زندگی کر دینا چاہتا ہے۔ وہ کیسے ہاتھ ہیں جو اسے خنجر سے کاٹ دیں تو اسے شکایت نہیں ہوگی۔ وہ کون سے ہونٹ ہیں جو بات کریں تو اسے دنیا میں کچھ اور سنائی نہیں دیتا، وہ کون سا وجود ہے جو رکے تو وہ ہوا کو روک دینا چاہتا ہے۔“ وہ ایک پھر پکھل رہی تھی۔

”اور اگر وہ..... وہ عورت مجھ سے زیادہ خوبصورت ہوئی تو..... تو پھر میں کیا کروں گی۔ کیا اسے سلمان پر قابض ہونے دوں۔ کیا اس کا رستہ خالی چھوڑ دوں۔ میں کیا کروں گی۔ کیا کروں گی؟ ہاں میں اس حسن کو ختم کر دوں گی، جس نے سلمان کو پاگل بنا دیا ہے۔ میں اسے اس قابل نہیں چھوڑوں گی کہ وہ اسے دوبارہ دیکھے۔ دوبارہ اس کی طرف جائے۔ میں اس کا وہ چہرہ ہی بگاڑ دوں گی جس نے سلمان کو اپنا اسیر کیا ہے۔ وہ آنکھیں مٹا دوں گی جس نے۔“

وہ آئینے کے سامنے کھڑی کسی پاگل کی طرح خود سے باتیں کر رہی تھی۔

بہت دیر بعد وہ تھکے تھکے قدموں سے واش روم سے باہر نکل آئی۔ لاؤنج کے صوفہ پر لیٹ کر اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ آنسو ایک بار پھر چہرے پر پھیلنے لگے۔

”تم جانتے ہی نہیں، تمہیں یا تمہاری محبت کو کھونے سے بڑھ کر کوئی نشتر نہیں ہے، جو کوئی مجھے لگا سکتا ہے۔ کیا نہیں ہے میرے پاس؟ سب کچھ ہی تو ہے۔ اب اگر نہیں ہے تو صرف تم نہیں ہو۔ میں تو تمہیں اپنے سائے کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی۔ کسی دوسری عورت کے ساتھ کیسے کر لوں۔ کیسے برداشت کر لوں کہ میرے علاوہ تم کسی اور سے بات کرو۔ کسی عورت کا ہاتھ تھامو۔ کسی اور کے آنسو پونچھو۔ کسی اور کو اپنا نام دو۔ تائبندہ سلمان! نہیں میں، تو تمہارے لباس کی ایک دھجی تک کسی کو نہیں دے سکتی۔ تمہارے پورے وجود کو کس طرح دے دوں اور وہ بھی اپنے ہاتھ، اپنی مرضی سے یہ نہیں کر سکتی۔ سلمان انصر! بس میں یہ نہیں کر سکتی۔ تمہارے بدلے چاہے کوئی مجھ سے سب کچھ لے لے مگر مجھے تمہارا وجود چاہئے۔ تمہیں میں کسی کو نہیں دے سکتی۔ اس عورت کو کیا محبت ہوگی تم سے اس کو تو پیسہ چاہئے ہوگا۔ میں اسے پیسہ ہی دوں گی۔ تمہیں خرید لوں گی اس سے اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر میں اس کے چہرے کو تیزاب سے جلا دوں گی۔ اسے اس قابل ہی نہیں چھوڑوں گی کہ تم دوبارہ کبھی اس پر نظر ڈالو۔“ وہ روتے روتے پتا نہیں کس وقت سو گئی تھی۔

صبح جس وقت اس کی آنکھ کھلی، گھر میں نوکر آچکے تھے۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آئی، کمرہ خالی تھا۔ وہ وہاں نہیں تھا، اس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے دس بج رہے تھے۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں آ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ بہت دیر تک وہ اسی طرح آنکھیں کھولے چھت کو گھورتی ہوئی وہاں پڑی رہی پھر وہ اٹھ کر واش روم میں گھس گئی تھی۔ شاور لینے کے بعد خاص طور پر منتخب کئے ہوئے کپڑے پہن کر وہ باہر نکلی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اس نے اپنے بالوں میں رولرز لگانے شروع کئے وہ آج بہت خاص بن کر وہاں جانا چاہتی تھی۔ بہت ہی خاص بن کر وہ اس عورت کو دکھانا چاہتی تھی کہ سلمان انصر کی بیوی کیا ہے، فلک کیا ہے۔

آدھ گھنٹے بعد میک اپ مکمل کرنے کے بعد اس نے رولرز اتار کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا تھا۔ بہت دیر تک وہ اپنے عکس سے نظریں نہیں ہٹا سکی۔ ذمردی رنگ کی سلک کی ساڑھی اور ڈارک گرین گلر کے کھلے گلے کے نیٹ کے بلاؤز میں وہ ایک مکمل عورت لگ رہی تھی۔ کسی خامی، کسی کمی کے بغیر۔ اس نے بت سنجیدگی سے ایک بار پھر خود پر نظریں دوڑائی تھیں پھر اس نے Chanel-5 نکال کر گردن کے دونوں اطراف میں

اس کا اسپرے کیا۔ پرس اور گلاسز اٹھا کر وہ بیڈروم سے نکل آئی تھی۔

”راستے میں سے تیزاب کی ایک بوتل خرید لیتا۔“

فیکٹری چلنے کا حکم دینے کے بعد اس نے ڈرائیور سے کہا تھا۔ ڈرائیور نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ مگر جواباً کچھ نہیں کہا۔ ایک دکان سے تیزاب کی بوتل خریدنے کے بعد اس نے فلک کو تھما دی۔ اس نے کچھ دیر تک اسے ہاتھ میں تھامے رکھا تھا۔ پھر اس کا ڈھلنا کھول کر کارک نکال دیا۔ بوتل کا ڈھکن بند کر کے اس نے اسے اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا۔ فیکٹری پہنچنے کے بعد وہ مسلمان کے آفس کی طرف نہیں گئی تھی بلکہ ایڈمن آفس کے کمرے میں چلی گئی تھی۔

الیاس صاحب اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر گڑبڑا گئے تھے۔

”میڈم! آپ یہاں؟“

”ہاں، مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ آپ بیٹھ جائیں۔“

وہ خود کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تھی۔ الیاس صاحب کچھ نزوں ہو کر بیٹھ گئے۔

”بیکنگ ڈپارٹمنٹ میں تابندہ نام کی کوئی لڑکی ہے؟“

چند لمحے دفتر کا جائزہ لینے کے بعد اس نے بہت سرد لہجے میں ان سے پوچھا تھا۔ وہ اس کے سوال پر کچھ اور نزوں ہو گئے تھے۔

”میڈم! وہاں تو بہت سی لڑکیاں ہوں گی، جن کے نام تابندہ ہیں آپ کس لڑکی کا پوچھ رہی ہیں؟“ اس نے اپنی نظریں ان کے چہرے پر گاڑ دیں۔ وہ اور پریشان ہوئے تھے۔

”میں مسلمان انصر والی تابندہ کا پوچھ رہی ہوں۔“

اتنے ڈائریکٹ ریفرنس پر ان کے چہرے پر پسینے آنے لگے تھے۔

”کیوں کیا یہاں ایسی کوئی لڑکی نہیں ہے، جس کے ساتھ مسلمان انصر۔“ اس نے تلخ لہجے میں کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”میڈم! دیکھیں، مجھے تو اس بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔ میں تو۔“

اس نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔ ”اگر مجھے گھر میں بیٹھ کر اس چکر کا پتا چل سکتا ہے تو میں یہ تو نہیں مان سکتی کہ آپ کو ان سب باتوں کا پتا نہ ہو۔ آفسز آل آپ ایڈمن آفسر ہیں۔ باس اور درکرز کے روابط کا آپ کو پتا نہیں ہوگا تو کس کو پتا ہوگا۔ بہر حال، میں آپ کو کوئی الزام نہیں دے رہی ہوں۔ میں صرف اس لڑکی سے ملنا چاہتی ہوں۔ آپ اسے بلوائیں۔“

اس نے جیسے بات ہی ختم کر دی تھی۔ اس بار الیاس صاحب کے چہرے پر ندامت

نمایاں تھی۔

”میڈم! میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں لیکن میں بے بس تھا۔ میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ آپ درکر کو تو سمجھا سکتے ہیں مگر باس کو نہیں۔ میں نے مسلمان صاحب سے بات کی تھی کہ ان کے اور اس لڑکی کے بارے میں بہت سی باتیں ہو رہی ہیں، مگر انہیں اس کی پرواہ ہی نہیں ہے۔ وہ اسے ہر روز چھٹی کے وقت ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ وہ بیکنگ کا کام کرتی تھی مگر مسلمان صاحب نے اسے شعبہ کا انچارج بنا دیا ہے۔ میرے بات کرنے پر صاحب نے مجھے بری طرح جھڑک دیا ان کا خیال ہے کہ مجھے ان سے سب چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہئے۔ مجھے صرف اپنے کام سے کام ہونا چاہئے۔“

الیاس صاحب نے اپنی صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔

”آپ اسے بلائیں۔“ اس نے ایک بار پھر ان سے کہا تھا۔ انہوں نے نیل بجا کر

چیز اسی کو بلایا اور پھر اسے اس لڑکی کو بلانے کے لیے بھیج دیا۔

چیز اسی کے جانے کے بعد انہوں نے ایک بار پھر کچھ کہنے کی کوشش کی تھی مگر اس

نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔

”میں یہاں آپ کی وضاحتوں کے لیے نہیں آئی ہوں، آپ خاموش رہیں۔“ اس

نے بڑے خشک لہجے میں ان سے کہا تھا۔ وہ سرخ چہرے کے ساتھ سر جھکا کر رہ گئے۔ وہ تیز

ہوتی ہوئی دھڑکن کے ساتھ اس لڑکی کا انتظار کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تھا۔ دروازہ کھلنے

کی آواز پر وہ بے اختیار اپنی سیٹ سے کھڑی ہو کر پیچھے مڑی اور پھر جیسے وہ پتھر کی ہو گئی تھی۔

”سر! آپ نے مجھے بلوایا ہے؟“ اس نے الیاس صاحب سے کہا تھا۔

”ہاں میڈم تم سے.....“

”اسے بھجوادیں۔“ وہ جیسے کسی پاتال سے بولی تھی۔ سب کچھ دھواں دھواں ہوتا

جا رہا تھا۔ اسے اپنا جسم مقلوب ہوتا ہوا لگا تھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے فلک کو دیکھتی ہوئی

کمرے سے نکل گئی تھی۔ وہ سانس رد کے بے حس و حرکت کسی جسمے کی طرح ابھی تک ویسے

ہی کھڑی تھی۔

”تم جانتیں نہیں وہ کیا ہے۔ میں اگر اسے نہ دیکھوں تو میں کچھ اور دیکھنے کے قابل

نہیں رہتا۔ تم نے کبھی کسی چگاڈز کو دن کے وقت دیکھا ہے۔ میں اس کا چہرہ دیکھے بغیر بالکل

دیباقتی ہو جاتا ہوں۔“ اس کے کانوں میں کسی کی آواز آرہی تھی۔

”یاد ہے تم نے ایک بار کہا تھا فلک! محبت تو رگوں میں خون بن کر بہتی ہے۔ میں

نے اسے دیکھا تو مجھے پتا چلا، یہ کیسے ہوتا ہے۔ وہ قدم اٹھائے تو میرا دل چاہتا ہے۔ میں زمین

بن جاؤں تاکہ اس کے پیروں کو بھی اگر کوئی چیز چھوئے تو وہ میرا وجود ہو۔ تم نہیں جانتیں فلک! وہ اگر ایک خنجر لے کر میرے وجود کو کاٹنا شروع کر دے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اسے حق ہے چاہے تو مارے، چاہے تو کاٹے چاہے تو جلادے۔ مگر سب کچھ اپنے ہاتھ سے کرے۔“ ہر لفظ اس کے چہرے کو تاریک کرتا جا رہا تھا۔

ہر ایک کو بھکاری بنا کر رستے میں بٹھایا ہوا ہے اور ہر ایک خود کو مالک سمجھتا ہے جب تک ٹھوک نہیں لگتی، جب تک گھٹنوں پر نہیں گرتا اپنی اوقات کا پتا ہی نہیں چلتا۔ وجود کے نصیب میں ہے بھکاری ہونا بس ذات بھکاری نہیں ہوتی۔ وجود کے مقدر میں مانگنا ہے۔ ذات کا وصف دینا ہے۔ میں کیہ تو کیا بی بی! سب بھکاری ہیں۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں، کبھی نہ کبھی تو بھکاری بننا ہی پڑتا ہے۔ مانگنا ہی ہوتا ہے۔ کوئی عشق مانگتا ہے کوئی دنیا اور جو یہ نہیں مانگتا، وہ خواہش کا ختم ہونا مانگتا ہے۔“

اس کا وجود جیسے کسی زلزلے کی زد میں تھا۔

”اس کی نظر میں جو ایک بار آ جاتا ہے۔ ہمیشہ رہتا ہے اور اس نظر کو کچھ کی پرواہ نہیں ہوتی۔“

چھ ماہ پہلے دریا کے کنارے اس فقیر کے کہے گئے لفظ اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

”ہاں، ساری بات نظر ہی کی تو ہے جس سے اس نے مجھے محروم کر دیا ہے اور اس عورت کو نواز دیا ہے ورنہ مسلمان انصر کبھی اس عورت کو تو نہ چاہتا۔ مگر یہ تو اللہ ہے نا جس نے میرے چہرے سے نظر اٹھالی ہے پھر مسلمان انصر کو کیا نظر آئے۔“ وہ بو بڑانے لگی تھی۔

”میڈم! آپ ٹھیک تو ہیں؟“

اسے الیاس صاحب کی آواز آئی تھی۔ اس نے پلٹ کر انہیں دیکھا تھا۔ الیاس صاحب کو اس کی آنکھوں میں وحشت کا ایک عجیب عالم نظر آیا تھا۔ وہ نارٹل نہیں لگ رہی تھی۔ وہ چند لمحے کچھ کہے بغیر انہیں دیکھتی رہی پھر کرسی سے اپنا بیگ اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔

”مرد تو دروازہ ہے۔ دروازے کا کام رستہ دینا ہوتا ہے یا رستہ روکنا۔ تیرا رستہ اس نے روک دیا ہے۔ تیرا ہی کیا ہر عورت کا رستہ اس نے روک دیا ہے۔ آگے جانے ہی نہیں دیتا۔ اسے لے کر کیا کرے گی تو۔ یہ کُل نہیں ہے بی بی! یہ کُل نہیں ہے۔ تو کُل کی خواہش کیوں نہیں کرتی وجود کی طلب کیوں ہے۔ تجھے ذات کی چاہ کیوں نہیں ہے۔“

ذہن کی دیوار پر کچھ لفظ بار بار ابھر رہے تھے۔ ایک آواز بار بار گونج رہی تھی وہ

چپ چاپ گھر آ گئی تھی۔ کمرے میں آ کر اس نے ایک ایک زیور اتار کر پھینکنا شروع کر دیا تھا۔ کسی جنونی کی طرح وہ سب کچھ اتارتی گئی تھی۔ کاشن کا ایک سوٹ پہن کر چہرہ دھو کر وہ واپس واش روم سے کمرے میں آ گئی تھی۔ کمرے میں ہر طرف چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ گھڑی، نیکلس، انگوٹھیاں، بریسلیٹ، چوڑیاں، ایئر رنگز وہ خالی نظروں سے ان سب چیزوں کو دیکھتی رہی تھی۔ پھر صوفے سے ٹیک لگا کر کارپٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ ٹیوب لائٹس کی روشنی کمرے میں بکھری ہوئی جیولری کو چمکا رہی تھی۔ وہ کسی بت کی طرح ان پر نظریں گاڑے بیٹھی تھی۔ وہ نہیں جانتی، کتنی دیر وہ اس طرح بیٹھی رہی تھی۔

وہ رات کے وقت واپس گھر آیا تھا۔ کمرے میں داخل ہوئے۔ عی! وہ کمرے میں بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھ کر چونکا تھا۔ وہ صوفے سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔

”تم آج فیکٹری آئی تھیں؟“ اپنا بریف کیس بیڈ پر اچھال کر وہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور پیروں سے سر تک اس کے دراز قد و وجود کو دیکھا تھا۔

”تم تابندہ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں؟“ اس بار اس کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ جارحانہ تھا۔

”میں تمہیں اجازت دیتی ہوں مسلمان! تم تابندہ سے شادی کر لو۔“

چند لمبے بعد جب وہ بولی تو اس کا جواب مسلمان کو حیران کر گیا تھا۔ وہ اب اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ لاؤنج میں آ گئی۔ فون کا ریسیور اٹھا کر اس نے اپنے گھر کا نمبر ملانا شروع کیا تھا۔

”اوہ فلک! یہ تم ہو۔ اس وقت کس لئے فون کیا ہے؟ خیریت تو ہے؟ خاموش کیوں ہو؟“

اس کی می نے فون اٹھاتے ہی اس کی آواز پہچان لی تھی۔

”می! آپ کہتی تھیں۔ آپ نے مجھے زندگی میں سب کچھ سکھایا ہے۔ کبھی کسی چیز کی کمی نہیں رکھی۔ آپ جھوٹ بولتی ہیں می! آپ نے۔ مجھے سب سے بڑی۔ سب سے اہم چیز نہیں سکھائی۔“

وہ بول رہی تھی۔ ”کیا ہوا میری جان کیا نہیں سکھایا۔ تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے؟“

”می! آپ نے مجھے اللہ سے، اللہ سے محبت کرنا نہیں سکھایا۔ آپ نے، آپ نے مجھے اس کو ڈھونڈنا نہیں سکھایا۔ آپ نے مجھے کنگال کر دیا می آپ نے مجھے بھکاری بنا دیا۔ ایسا کیوں کیا می! ایسا کیوں کیا؟“

کیوں کیا می! ایسا کیوں کیا؟“

وہ اب چیخ رہی تھی۔ چلا رہی تھی۔ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔
 ”آپ نے مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ می! مجھے تو کوئی اٹھانے والا
 ہی نہیں رہا۔ آپ نے مجھے دنیا میں اکیلا کر دیا۔ می آپ نے مجھ پر ظلم کیا۔“
 وہ پاگلوں کی طرح چیختی جا رہی تھی۔ گھر کے ملازم لاؤنج میں اکٹھے ہو گئے تھے۔
 اس کی چیخوں کی آواز سن کر سلمان بھی لاؤنج میں آ گیا تھا۔ ریسپور اب اس کے ہاتھ سے
 چھوٹ چکا تھا۔ وہ نیم غشی کے عالم میں اب بھی وہی چلا رہی تھی۔
 ”مجھے اللہ کی محبت نہیں دی۔ مجھے..... مجھے، اس کو ڈھونڈنا نہیں سکھایا مجھے گرا دیا۔
 اس کی نظر سے گرا دیا۔“



اس نے بہت آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دی تھیں، کمرے میں اس کے بیڈ کے
 پاس می بیٹھی تھیں اور تھوڑی دور کچھ فاصلے پر ایک آدی پاپا کے پاس کھڑا تھا، وہ اس سے کچھ
 باتیں کر رہے تھے، اس کی آنکھیں کھلی تھیں لیکن ذہن ابھی غنودگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے
 اپنے اردگرد کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔
 ”کمرہ..... یہ کون سا کمرہ ہے۔ ہاں یاد آیا، یہ تو میرا کمرہ ہے۔ اپنے گھر میں یعنی
 میں سلمان کے گھر میں نہیں ہوں۔“

اس نے آہستہ آہستہ ہر چیز کو پہچانا شروع کر دیا۔ کسی نے بھی اس کے پاس آنے
 کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے اعصاب پر ایک عجیب نشہ آور کیفیت سوار تھی۔ تھوڑی دیر بعد
 پاپا اور وہ آدی اس کے پاس آ گئے تھے پھر اس نے اپنے بازو میں ہلکی سی چھین محسوس کی تھی
 اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

”دس پندرہ منٹ تک یہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ آہستہ آہستہ نارمل ہو رہی ہیں۔ میرا
 خیال ہے اب یہ پہلے کی طرح نہیں چیخیں گی۔“ اس نے اپنے کانوں میں کسی کی آواز سنی تھی۔
 شاید اسی آدی کی۔ اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ غنودگی بڑھتی جا رہی تھی۔ پلکیں اور بوجھل ہو
 گئی تھیں۔

دوبارہ جب اسے ہوش آیا۔ تب بھی کمرے میں وہی لوگ تھے۔ می، پاپا اور وہ
 آدی مگر اب اسے آنکھیں کھلی رکھنے میں دقت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولی تھیں
 اور کچھ دیر سب کو دیکھنے کے بعد اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ می نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی مگر اس
 آدی نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا۔

”یہ اب بالکل ٹھیک ہیں اور اگر اٹھ کر بیٹھنا چاہتی ہیں تو انہیں بیٹھنے دیں بلکہ چلنے
 پھرنے دیں باہر جانے دیں، اس بستر میں قید کرنے کی کوشش نہ کریں انہیں ایسی کوئی تکلیف
 نہیں ہے کہ جو چلنے پھرنے یا اٹھنے بیٹھنے سے بڑھ جائے۔“
 اس آدی نے می سے کہا تھا۔
 ”کیسی ہیں آپ؟ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟“
 وہ آدی اب اس سے مخاطب تھا۔ وہ سپاٹ آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
 ”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ کچھ دیر بعد بولی تھی۔ ایک بار پھر اسے سب کچھ یاد آنا
 شروع ہو گیا تھا۔

”میرا خیال ہے، انہیں ابھی فی الحال میری مزید ضرورت نہیں ہے۔ آپ تھوڑی
 دیر بعد ان کی مرضی پوچھ کر انہیں ہلکا پھلکا کھانا کھلا دیں۔ یہ اب بالکل ٹھیک ہیں۔ میں اب کل
 صبح انہیں دیکھنے آؤں گا۔“

اس آدی نے کہا اور پھر وہ ایک بیگ پکڑ کر پاپا کے ساتھ باہر نکل گیا تھا۔ می اٹھ کر
 اس کے پاس بیڈ پر آ گئیں۔ انہوں نے اسے گلے سے لگا کر اس کا ماتھا چوما تھا۔
 ”اللہ کا شکر ہے، تمہیں ہوش آ گیا ہے۔“
 ”اب اس ہوش کا کیا فائدہ؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔ می اس کا چہرہ
 دیکھتی رہیں۔

”مجھے کیا ہوا تھا؟“ اس نے ان سے پوچھا تھا۔
 ”تمہارا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ ایک ہفتے تمہیں ہاسپٹل میں رکھا تھا پھر گھر
 لے آئے۔ تمہیں جب بھی ہوش آتا تھا۔ تم چلانے لگتی تھیں۔ تمہیں مسلسل ٹریکولائزرز پر رکھا ہوا
 تھا۔ کیا ہوا ہے فلک؟ ایسی کون سی بات ہو گئی تھی جسے تم نے اپنے اعصاب پر اس طرح سوار کر
 لیا۔ کیا سلمان سے کوئی جھگڑا ہوا تھا؟“ وہ اب دھیمی آواز میں اس سے پوچھ رہی تھیں۔
 ”نہیں، کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے باہر لے جائیں۔ باہر لان میں، میرا دم گھٹ رہا
 ہے یہاں۔“

وہ ایک دم بیڈ سے اٹھنے لگی تھی۔ اس کی می نے اس کا بازو تھام لیا۔ زمین پر قدم
 رکھتے ہی وہ چکرائی تھی۔ می نے اسے بیڈ پر بٹھا دیا۔ چند منٹوں بعد اس نے ایک بار پھر
 کھڑے ہونے کی کوشش کی تھی اس بار وہ اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گئی۔ می کے ساتھ
 چلتے ہوئے وہ باہر لان میں آ گئی۔ می نے اسے لان میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بٹھا دیا تھا۔ کچھ

دیر بعد وہ اندر جا کر اس کے لیے کچھ پھل اور جوس لے آئیں۔ اس نے جوس کا گلاس خود ہی اٹھا کر پی لیا تھا پھر وہ سیب کی قاشیں کھاتی رہی۔

اب اندر چلیں؟

مئی نے کچھ دیر بعد اس سے پوچھا تھا۔ شام کے سائے بڑھ رہے تھے۔
”نہیں، ابھی مجھے بیٹھنا ہے۔“

وہ اسی طرح کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔ مومنہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ ان کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔ وہ پہلے جیسی فلک نہیں لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور آنکھوں کی چمک بجھ گئی تھی۔ دودھیارنگت زردی مائل ہو گئی تھی۔ وہ کسی بت کی طرح پلکیں جھپکائے بغیر سامنے دیوار پر چڑھی ہوئی بوگن ویلیا کی تیل کو دیکھ رہی تھی۔
”مئی!“ اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آئی تھی۔ میونہ چونک گئیں اس نے ایک بار پھر انہیں پکارا۔

”مئی! یہ مرد عورت کے لیے کیا ہوتا ہے؟“ میونہ اس کے سوال کو سمجھ نہیں پائی تھیں۔ وہ ابھی بھی بوگن ویلیا کو گھور رہی تھی۔

”ہتا ہے مئی! مرد عورت کے لیے کیا ہوتا ہے۔ دروازہ ہوتا ہے دروازے کا کام رستہ روکنا ہوتا ہے یا رستہ دینا اور مئی اس دروازے نے میرا رستہ روک لیا ہے۔ میرا ہی نہیں ہر عورت کا رستہ روک لیا ہے۔ آگے جانے ہی نہیں دیتا۔ آج تک آگے جانے نہیں دیا۔ اسی لیے تو عورت پیغمبر ہوتی ہے نہ ولی۔ وہ دروازہ کھولنے کی کوشش ہی نہیں کرتی، وہیں اسی دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھی رہتی ہے۔ اسے ہی چومتی رہتی ہے سجدہ کرتی رہتی ہے۔ دروازہ پھر رستہ کیوں نہ روکے۔“

وہ اب بوگن ویلیا کو دیکھتے ہوئے بول رہی تھی اور اس کی باتیں میونہ کو باہر سے اندر تک ہلا رہی تھیں۔

”فلک! کیا کہہ رہی ہوں۔ کیوں اس طرح کی باتیں کر رہی ہو؟“

”ہتا ہے مئی! عورت تیل کی طرح ہوتی ہے اور مرد دیوار کی طرح۔ تیل ساری عمر دیوار کو ڈھونڈتی رہتی ہے جس کے سہارے وہ اوپر جا سکے نظروں میں آسکے جہاں تک دیوار جاتی ہے۔ وہ بھی بس وہیں تک جاتی ہے۔ تیل کو لگتا ہے دیوار نہ ہوتی تو وہ زمین پر رتی رہتی لوگوں کے پیروں تلے آتی، مگر ان کی نظروں میں نہیں آتی۔ وہ ساری عمر دیوار کی مشکور رہتی ہے۔ اسے سایہ دیتی ہے۔ اپنے پھولوں سے سجاتی ہے، مہکاتی ہے، جب سوکھنے لگتی ہے تو بھی

ساتھ ہی چمکی رہتی ہے۔ کسی چھپکلی کی طرح۔ ختم ہونے کے بعد بھی اسے دیوار کے علاوہ کسی دوسرے کا سہارا نہیں چاہئے اور دیوار..... مئی! دیکھیں دیوار کا کتنا فائدہ ہوتا ہے۔ اس کا وجود تیل ڈھک دیتی ہے۔ اس کے سامنے ایک آڑ بنا دیتی ہے ہر چیز سے اسے محفوظ کر دیتی ہے۔ اسے سایہ دیتی ہے۔ رونق دیتی ہے پھولوں سے سجاتی ہے مہکاتی ہے اور خود ختم ہونے تک اس کی احسان مند رہتی ہے اور دیوار وہ تو بس سہارا دینے کا فائدہ اٹھاتی ہے بس سہارا دینے کا اور ساری عمر..... مئی! دیکھیں ساری عمر جب تک تیل ختم نہیں ہو جاتی۔“

”فلک! تم اندر چلو۔“

”پھر جب وہ مرد اسے مل جاتا ہے تو اسے لگتا ہے۔ اسے پوری دنیا مل گئی ہے۔ ہر چیز جیسے اپنے ٹھکانے پر آگئی ہے۔ سب کچھ جیسے مکمل ہو گیا ہے۔ اس کے لیے وہ مرد بس وہ مرد سب کچھ ہوتا ہے۔ ان داتا، مالک، آقا سب کچھ۔ اسے لگتا ہے زندگی میں اب اسے جو کچھ ملنا ہے۔ اسی کے طفیل ملنا ہے۔ اسی کے سہارے ملنا ہے۔ اسی سے ملنا ہے۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد اس کو خوش کرنا ہوتا ہے۔ وہ دن کو رات کہے تو وہ رات کہتی ہے، وہ آگ کو پانی کہے تو وہ پانی کہتی ہے۔ اسے لگتا ہے دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے حکم سے ہوتا ہے اس کے وجود کی وجہ سے ہوتا ہے اللہ اس کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ بس وہ مرد ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ آنکھ، کان، ناک، منہ، پیر، ہاتھ، دل، دماغ سب کچھ وہی ہوتا ہے۔ اسے لگتا ہے، رزق اللہ نے نہیں دینا اس مرد نے دینا ہے اور پھر..... پھر جب وہ مرد اسے چھوڑ دیتا ہے۔ ٹھوکر مار دیتا ہے تو اسے لگتا ہے کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ دنیا میں کچھ رہا ہی نہیں۔ بس دنیا اس ایک مرد کی وجہ سے ہی تو قائم تھی۔ وہ نہیں تو دنیا نہیں یوں جیسے سارا نظام ہی ختم ہو گیا ہو۔ اسے اللہ یاد نہیں آتا۔ اسے یاد ہی نہیں آتا کہ اللہ نے اسے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے..... مرد کی عبادت کے لیے نہیں، اپنی چاہ کے لیے پیدا کیا ہے۔ مرد کی چاہ کے لیے نہیں اور عورت تو عورت تو..... ایک مرد کے لیے مرثی ہے۔ اسے مرد سے آگے تو کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ اللہ چھوڑ دے اسے پرواہ نہیں مگر وہ ایک مرد چھوڑ دے تو وہ مر جاتی ہے۔ اللہ اس سے محبت نہ کرے تو اسے فکر نہیں مگر وہ مرد محبت کرنا چھوڑ دے تو اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اللہ ناراض ہو جائے تو اسے دھیان نہیں آتا مگر مرد ناراض ہو جائے تو وہ سولی پر لٹک جاتی ہے۔ مرد کو منانے کے لیے وہ دو جہاں ایک کر دیتی ہے اور اللہ کو منانے کے لیے وہ ایک مرد نہیں چھوڑ سکتی۔ مرد کو منانے کے لیے وہ ہر رشتہ چھوڑنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ ماں کا، باپ کا، بہن کا، بھائی کا۔ ہر ایک کا اور اللہ کے لیے۔“

”فلک! اب بس چپ ہو جاؤ۔ کچھ نہ کہو۔ اس طرح کی باتیں کہاں سے سیکھ لی ہیں تم نے۔“ میمونہ اب روہا نسی ہو گئی تھیں۔

”مئی! میں نے اس سے کہا میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ ہر چیز سے زیادہ محبت۔ اس نے کہا مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ اگر میں اللہ سے یہ کہتی تو کیا وہ بھی یہی جواب دیتا۔ میں نے اس سے کہا میں نے کون سی غلطی کی ہے؟“ اس نے کہا ”میں نہیں جانتا۔“ میں اللہ سے یہ پوچھتی تو کیا وہ میرے سوال کا جواب نہ دیتا؟ میں نے اس سے کہا میں نے تمہارے لیے پچھلے تین سال میں کیا نہیں کیا اس نے کہا۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں، اگر میں اللہ کے لیے کچھ کرتی تو کیا اللہ کو بھی پرواہ نہ ہوتی؟ میں نے اس سے کہا۔ میں نے پچھلے تین سال ویسے زندگی گزارا ہے جیسی تم چاہتے تھے۔ اس نے کہا میں کیا کروں۔ میں تین سال اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارتی تو کیا اللہ یہ کہتا؟ میں نے اس سے کہا تم مجھے بتاؤ میں کیا کروں کہ تم خوش ہو جاؤ۔ مجھ سے محبت کرنے لگو۔ اس نے کہا مجھے تمہاری ضرورت ہی نہیں ہے۔ مجھے تمہاری کوئی بات، کوئی چیز خوش نہیں کر سکتی۔ میں اللہ سے یہ کہتی تو کیا وہ بھی یہی کہتا؟ مئی اللہ اور انسان میں یہی فرق ہے۔ اللہ ٹھوکر نہیں مارتا انسان بس ٹھوکر ہی مارتا ہے۔

مرد کو خوش کرنے کے لیے کیا کیا کرتی ہے عورت۔ اندر بدل دیتی ہے، باہر بدل دیتی ہے۔ دل بدل دیتی ہے وجود بدل دیتی ہے، صرف اس لیے کہ وہ خوش رہے۔ ناراض نہ ہو، اس کی نظر نہ بدلے۔ اللہ کو خوش کرنے کے لیے وہ باطن کیا ظاہر کو بدلنے پر تیار نہیں ہوتی۔ اللہ کہتا ہے۔ سر کو ڈھانپ لو۔ مرد کہتا ہے سر کو مت ڈھانپو۔ میری بیوی کو ماڈرن ہونا چاہئے۔ وہ اللہ کی نہیں سنتی۔ مرد کی سنتی ہے۔ اللہ کہتا ہے اپنے وجود کو ڈھانپو، اپنی زینتوں کو چھپاؤ، مرد کہتا ہے ایسا مت کرو تا کہ میرے ساتھ چلتی پھرتی اچھی لگو۔ وہ اللہ کی نہیں مانتی مرد کی مانتی ہے، وہ کہتی ہے مرد کے ساتھ رہنا ہے۔ ساری عمر بسر کرنی ہے، اس کی نہیں مانتی گے تو کس کی مانتی گے۔ مرد کی بیوی ہے، یہ رشتہ تو کبھی بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ اللہ کی تو مخلوق ہے یہ رشتہ تو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ وہ دائمی رشتہ کی فکر نہیں کرتی۔ ساری عمر عارضی رشتوں کو روتی رہتی ہے۔ ان کی فکر کرتی ہے اللہ نے تو عورت کو غلام نہیں بنایا۔ مجبور نہیں بنایا۔ مخلوم نہیں بنایا اس نے خود بنالیا ہے، اپنا محور ”ذات“ کو نہیں ”وجود“ کو بنالیا ہے۔“

میسونہ نے اس کے گالوں پر آنسوؤں کو بہتے دیکھا تھا۔

”فلک! فلک! مت روؤ میری جان۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں پھر تم۔“

”مئی! مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں بس رونا چاہتی ہوں۔ آپ نے کبھی

کیڑے کو دیکھا ہے؟ مئی! مجھے اپنا وجود ایک کیڑا لگتا ہے۔ محتاج، بے کس، مجبور۔“ اس نے چہرے کو ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔ ”مجھے یقین نہیں آتا مئی چھبیس سال۔ پورے چھبیس سال میں اللہ کے بغیر کیسے رہتی رہی ہوں۔ چھبیس سال اللہ مجھے کیسے برداشت کرتا رہا ہے۔ میرے غرور، میرے فخر، میری انا، میری خود پرستی۔ مئی! کیسے.....؟ آخر کیسے وہ یہ سب نظر انداز کرتا ہے۔ جن سے وہ محبت کرتا ہے۔ ان پر آزمائشیں ڈالتا ہے۔ چھبیس سال تک اسے میرا خیال ہی نہیں آیا۔ سب کچھ دیتا رہا بغیر مانگے بغیر چاہے، کسی مصیبت، کسی تکلیف، کسی تنگی، کسی آزمائش کے بغیر یعنی چھبیس سال تک میں اللہ کی محبت کے بغیر جیتی رہی اور آپ آپ سب مجھ پر رشک کرتے رہے۔ میرے مقدر پر۔“

وہ گفتگوں کے بل چہرے کو ہاتھوں میں چھپائے لان میں بیٹھ گئی تھی۔ ایک بار پھر وہ اسی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔

”میں انسانوں کی محبت پر شاکر رہی۔ بس انسانوں کی محبت پر..... مجھے اللہ کا خیال ہی نہیں آیا۔ آپ نے ظلم کیا مجھ پر مئی! آپ نے ظلم کیا۔“ میسونہ تم صم اسے بلکتے ہوئے دیکھتی جا رہی تھیں۔ ان کا وجود کسی کلیشہ کی طرح سرد ہوتا جا رہا تھا۔



سلمان کی تابندہ کے ساتھ شادی دونوں خاندانوں کے لیے دھماکے سے کم نہ تھی۔ فلک کی ذہنی کیفیت کی وجہ اب سب کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ چند ہفتے فلک کی خیریت دریافت کرنے آتا رہا تھا اور پھر پیک دم اس نے آنا چھوڑ دیا تھا پھر فلک کے والدین کو اس کی دوسری شادی کی اطلاع مل گئی تھی۔ وہ سلمان کے پاس گئے تھے اور انہوں نے اسے بے نقط سنائی تھیں۔

”میں نے فلک سے دوسری شادی کی اجازت لی ہے۔ آپ اس سے پوچھ سکتے ہیں۔“ وہ بے حد مطمئن تھا۔ میسونہ اور شیر انگن جملے بھٹے گھر واپس آ گئے تھے۔

”تم نے اسے دوسری شادی کی اجازت کیوں دی؟ تمہیں یہ سب کچھ ہمیں بتانا چاہئے تھا۔ میں دیکھتا وہ کیسے اس عورت سے شادی کرتا ہے۔ میں ان دونوں کو گولی نہ مراد دیتا تو پھر کہتیں تم۔ مگر تم نے اجازت کیوں دی؟“

شیر انگن گھر آ کر اس پر بگڑنے لگے تھے۔ وہ اس خبر پر بالکل ناراض تھی یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

”مجھے کیا فرق پڑتا ہے پایا! وہ جس سے چاہے شادی کرے میرے لیے میرا اللہ کافی ہے۔“ اس کا انداز شیرازہ کن کو تپتا گیا تھا۔

”تم پاگل ہو گئی ہو۔ کیا دنیا میں نہیں رہتی ہو؟“

”میں نے جو کیا ٹھیک کیا۔ مجھے کوئی بچھتاوا نہیں ہے مجھے فرق نہیں پڑتا اس کی دوسری شادی سے، اس کی زندگی میں ایک اور عورت آگئی تو کیا۔“

وہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ جو تلخ کپڑوں میں ہمیشہ کی طرح کرہ بند کئے بیٹھی تھی۔

رشنا کو جب اس کے بارے میں پتا چلا تھا تو وہ اس سے ملنے آئی تھی۔ فلک کو دیکھ کر اسے شاک لگا تھا وہ جیسے ایک پرچھائیں بن کر رہ گئی تھی۔

”کیا حال بنا لیا ہے تم نے اپنا فلک؟ اس طرح تو مر جاؤ گی۔“ وہ اس کے بالوں کو ہاتھوں سے سنوارنے لگی تھی۔

”نہیں مردوں گی رشنا! میں نہیں مردوں گی۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”مجھے یقین نہیں آتا کہ مسلمان..... اس طرح کر سکتا ہے۔ وہ تو تم سے بہت محبت کرتا

تھا پھر اسے کیا ہو گیا۔“ وہ اس کے پاس کارپٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

”اس کا قصور نہیں ہے رشنا! اس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ تو وہی دیکھ رہا ہے جو اللہ سے دکھا رہا ہے۔ وہی کر رہا ہے جو اللہ کو ماننا چاہتا ہے۔ مجھے اپنے حسن، اپنے وجود پر بڑا غرور تھا نا..... اللہ نے مجھے میری اوقات دکھائی ہے۔“

رشنا نے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔ وہ بے حد تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔

”جانتی ہو رشنا! میرے ساتھ کیا ہوا۔ میں نے سوچا تھا مسلمان کو مجھ سے چھیننے والی مجھ سے بڑھ کر نہیں تو میرے برابر ضرور ہوگی۔ میں یہی سوچ کر اسے دیکھنے گئی تھی فیکٹری، میں نے سوچا تھا اس سے کہوں گی مسلمان کے بدلے جتنی پیہ چاہے لے لے اور اگر وہ میری بات نہ مانتی تو میں اس کے چہرے پر تیزاب ڈال دیتی۔ میں نے اسے بلوایا تھا۔ وہ کمرے میں آئی اور میں نے اسے دیکھا۔ جانتی ہو، رشنا وہ کیسی تھی، ایک موٹے اور بھدے جسم والی۔ سیاہ رنگت والی عورت۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اس کے ٹیڑھے میڑھے دانت اس کے چہرے کو اور بھی بدصورت کر رہے تھے۔ اس نے اپنے چہرے کو میک اپ کی دکان بنا لیا ہوا تھا، کوئی بھی مرد اسے دیکھ کر جان سکتا تھا کہ وہ کس کردار کی عورت ہے مگر مسلمان کو اس کے چہرے پر کچھ اور نظر آ رہا تھا۔ میں پتھر کی ہو گئی تھی اسے دیکھ کر جان گئی تھی۔ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ساری بات نظر کی ہوتی ہے اور اللہ نے مجھ

سے وہ چھین لی تھی۔ مجھے لگا تھا کسی نے پوری دنیا کی گندگی میرے وجود پر اچھال دی تھی۔ مجھے کسی سے کئی شکوہ نہیں رہا تھا نہ مسلمان سے نہ تانبندہ سے میں جان گئی تھی۔ اللہ کن کہتا ہے تو چیزیں کیسے ہو جاتی ہیں۔ مجھے پتا چل گیا تھا اللہ دل کیسے پھیر دیتا ہے۔ وہ تو عورت تھی۔ بدصورت سی مگر عورت تھی۔ اللہ چاہتا تو زمین پر پڑے ہوئے ایک پتھر کے لیے مسلمان کے دل میں وہ عشق ڈال دیتا جو اس کے دل میں میرے لیے تھا۔ اللہ نے بتایا ہے مجھے چھبیس، سال تم میرے بغیر رہ سکتی ہو اپنے آقا، اپنے مالک، اپنے معبود کے بغیر تو پھر اس شخص کے بغیر بھی رہ سکتی ہو۔ اگر اللہ کی محبت کے بغیر جی سکتی ہو تو کسی بھی شخص کی محبت کے بغیر جی سکتی ہو۔ می پاپا سمجھتے ہیں میرے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔ مسلمان کی بے وفائی کی وجہ سے..... مجھے سایکاٹرسٹ کے پاس لے کر پھرتے ہیں۔ چھبیس سال اللہ کا نام نہیں لیا تو کس کو خیال نہیں آیا کہ میں ابنازل ہوں۔ اب چند ماہ سے اللہ کا نام لے رہی ہوں تو ہر ایک کو میں پاگل کیوں لگنے لگی ہوں۔ تم بتاؤ کیا میں پاگل ہوں؟“

رشنا نے سر جھکا لیا۔ فلک کے چہرے پر ایک پھکی سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ اس نے رشنا کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پھر وہ خاموش ہو گئی۔ دوبارہ نہیں بولی۔



وہ دریا کے کنارے پر وہیں آگئی تھی۔ جہاں اس نے اس فقیر کو دیکھا تھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ اس کے دل پر جیسے ایک گھونٹہ پڑا تھا۔ پتا نہیں اسے کیوں آس تھی کہ وہ وہاں ہوگا۔ اس کے انتظار میں، اسے کچھ بتانے، اس کے اعصاب پر ایک عجیب سی تھکن سوار ہو گئی تھی۔ وہ گڑھا بھی، بھی وہیں تھا اس کی طرح پانی اور کچھڑ سے بھرا ہوا۔ وہ اس کے پاس آ کر ریت پر بیٹھ گئی تھی۔

”یہاں کیوں بیٹھ گئی ہو فلک؟ اٹھ جاؤ۔“ میونہ نے اسے بیٹھتے دیکھ کر کہا تھا۔

وہ گڑھے کو گھور رہی تھی پھر اس نے اپنا ہاتھ گڑھے میں ڈال رکھا کچھ بھرا پانی ہاتھ میں لیا تھا۔ اسے یاد آیا تھا اس دن وہ فقیر کس طرح کچھڑ اپنے چہرے اور الوں پر ملنے لگا تھا۔

”دیکھو۔ میں تو کچھڑ سے نہیں ڈرتا، میں تو گندگی سے خوف نہیں سماتا جانتا ہوں اس کی نظر اس کچھڑ اور گندگی پر نہیں جائے گی وہ صرف میرے وجود کو دیکھے گا۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے کچھڑ بھرا ہاتھ اپنے چہرے پر ملانا شروع کر دیا۔ میونہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی تھیں۔

”کیا کر رہی ہو تم فلک؟“ وہ حواس باختہ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے پرس سے ٹشو نکال

کر اس کا چہرہ صاف کرنا چاہا تھا۔ اس نے ہاتھ پکڑ لیا۔

”رہنے دیں می! کچھ دیر تو اس کچھڑ سے میرے چہرے کو سجا رہنے دیں۔“ اس نے گھٹنوں میں اپنا منہ چھپا لیا تھا۔

”میں جس کی نظر میں ہوں۔ میرے لیے کافی ہے۔ مجھے جس کی محبت چاہئے مل چکی ہے۔ مجھے اور کسی کی محبت کی ضرورت نہیں ہے۔“ اسے یاد تھا۔ اس دن یہاں اس نے یہی کیا تھا۔

”تجھے وجود کی طلب کیوں ہے؟“ ذات“ کی چاہ کیوں نہیں ہے؟“ کوئی آواز ایک بار پھر لہرائی تھی۔

”اب مجھے ذات کی چاہ ہے تو ذات کیوں نہیں ملتی۔“ اس نے اپنے کچھڑ بھرے ہاتھ کو دیکھا تھا۔ اب اسے اپنے آپ سے گھن آ رہی تھی۔ اس روز اسے بھکاری کے وجود سے گھن آئی تھی۔ اب اسے پتا چل رہا تھا کہ کب کچھڑ کچھڑ نہیں لگتی۔ گندگی گندگی نہیں رہتی وجود کی طلب کیسے ختم ہو جاتی ہے۔

”ہر ایک کو بھکاری بنا کر رستے میں بٹھایا ہوا ہے۔ ہر ایک خود کو مالک سمجھتا ہے۔ جب تک ٹھوکریں نہیں لگتی۔ جب تک گھٹنوں کے بل نہیں گرتا۔ اپنی اوقات کا پتہ ہی نہیں چلتا۔“

”فلک پھر رونے لگی ہو۔ چلو گھر چلیں۔ میرا خیال تھا تم یہاں آ کر ریلیکس ہو جاؤ گی۔ خوش ہو گی مگر تم یہاں آ کر بھی..... چلو گھر چلیں۔“

میونہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھالیا تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے ان کے ساتھ چلنے لگی۔ سڑک پر چڑھنے سے پہلے اس نے ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ پیچھے کوئی بھی نہیں تھا۔



اس کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ کوئی سائیکالٹریسٹ اسے نارمل نہیں کر سکا تھا۔ وہ سارا دن جہاں بیٹھتی بیٹھتی رہتی جب اذان کی آواز آتی تو کسی معمول کی طرح اٹھ کر نماز پڑھنے لگتی۔ میونہ اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی، اور اس کی باتیں پھر اسی ایک محور ایک مرکز کے گرد گھومنے لگتیں۔ اللہ، خدا، رب، مالک، آقا، معبود، میونہ کو لگتا وہ جب تک ایسی باتیں نہیں چھوڑے گی تب تک نارمل نہیں ہو سکتی۔ اس کے سلوٹوں سے بھرے ہوئے کپڑے اور جیولری اور میک اپ سے خالی چہرہ انہیں وحشت میں مبتلا کر دیتا۔ انہیں وہ پہلے والی فلک یاد آ جاتی جس کی ایک ایک چیز نفاست کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ وہ اسے بیوٹی پارلر لے جانے کی

کوشش کرتی تھیں تو وہ چلانے لگتی۔ وہ اسے کسی فنکشن میں لے جانا چاہتیں تو وہ کمرہ بند کر لیتی۔

”اس طرح کمرے میں بند رہ کر تم مر جاؤ گی فلک! خود کو اس طرح تباہ نہ کرو کہیں آیا جایا کرو کہیں باہر چلو۔“

انہوں نے ایک دن اس سے کہا تھا۔ وہ خالی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہی۔

”باہر جانے سے کیا ہو گا می؟ کیا مل جائے گا باہر؟“ کچھ دیر بعد اس نے تھکے تھکے انداز میں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا تھا۔

”اندروں کر اس طرح گھر میں بند ہو کر کیا مل رہا ہے تمہیں؟“

اس کی امی آج بحث کے موڈ میں تھیں۔

”ہاں، کچھ نہیں مل رہا اندروں کر بھی مگر باہر جا کر لوگوں کو دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔ میں کہیں چھپ جانا چاہتی ہوں می! اس طرح کہ دو باہر کسی کو نظر آؤ نہ کوئی مجھے دیکھ سکے۔“

اس کا لہجہ اتنا عجیب تھا کہ میونہ ہول کر رہ گئی تھیں۔

”سلمان کو بھول جاؤ، دفع کر دو اسے۔ اس کے لیے کیا جوگ لے لو گی۔“ انہوں نے جیسے اسے بہلانے کی کوشش کی تھی۔ وہ تہہ لگا کر ہنس پڑی۔

”سلمان! سلمان کو کون یاد کرتا ہے می! اس کے لیے کون جوگ لیتا ہے۔ وہ تو انسان ہے انسانوں کے لیے کون جوگ لیتا ہے۔ جوگ تو بس۔“

وہ بات ادھوری چھوڑ کر رونے لگی تھی۔

”تم صبر کیوں نہیں کر لیتیں فلک! سب کچھ بھول کیوں نہیں جانتیں؟“ وہ ایک تک ماں کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”آپ کو کیا پتا می! ہر چیز پر صبر نہیں آتا ہر نقصان صبر کرنے والا نہیں ہوتا۔ آپ کو کیا پتا میرے پاس کیا نہیں رہا۔ میرے پاس ایک تنکا تک نہ رہے اور لوگوں کو پوری دنیا مل جائے تو مجھے پرواہ نہیں پر جب سوچتی ہوں کہ لوگوں کو می لوگوں کو، اللہ مل رہا ہے تو مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ صبر آ ہی نہیں سکتا اور میرے علاوہ اس وقت سب کے پاس اللہ ہے کوئی محروم ہے تو میں ہوں خالی ہاتھ ہوں تو میں ہوں بد قسمت ہوں تو میں ہوں۔“

وہ ایک بار پھر بچوں کی طرح زار و قطار رو رہی تھی۔ میونہ بے بسی سے اسے دیکھتی رہیں۔ وہ جانتی تھیں اب وہ کئی گھنٹے اسی طرح بلند آواز سے روتی رہے گی۔ بال بکھرائے، سر پر ہاتھ رکھے، گیلے گالوں، لرزتے وجود، بلند سسکیوں اور آنکھوں میں لہرائی وحشت کے ساتھ وہ فلک کا صرف سایہ لگ رہی تھی۔ ایک پرانا اور بد صورت سایہ۔

اس دوپہر سائیکا ٹرسٹ کے بلیک سے واپسی پر می نے گاڑی کا رخ لبرٹی کی طرف موڑ لیا تھا۔ انہیں کچھ ضروری چیزیں خریدنی تھیں۔ پارکنگ میں گاڑی پارک کرنے کے بجائے انہوں نے باہر ہی سڑک کے ایک کنارے پر گاڑی پارک کر دی تھی۔

”نہیں، مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔“ اس نے می کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔

”میں گاڑی میں ہی بیٹھتی ہوں۔ آپ کو جو لینا ہے لے آئیں۔“

می گاڑی سے اتر کر چلی گئی تھیں۔ وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر سڑک پر چلی ہوئی ٹریفک کو دیکھتی رہی، سڑک پر گاڑی کا ایک جھوم تھا وہ بے تاثر آنکھوں سے کسی روباٹ کی طرح انہیں دیکھتی رہی۔ پھر اچانک اس نے دس بارہ سال کے چھوٹے سے قد اور دبے پتلے وجود کے ایک بچے کو پھینے پرانے کپڑوں اور ٹوٹی ہوئی چپل پہنے بازو پر کچھ اخبار لٹکائے اپنی گاڑی کی طرف آتے دیکھا تھا۔ وہ بچہ پاس آ کر ایک اخبار ہاتھ میں پکڑ کر کھڑکی کے شیشے پر دستک دینے لگا۔ اسے کسی اخبار میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی وہ اس طرح راستے میں اخبار لیا کرتی تھی۔ مگر آج بے اختیار اس نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر دیا تھا۔

”اخبار لے لیں باجی!“ اس بچے کی آواز بھی اس کے وجود ہی کی طرح نجیف تھی، وہ اخبار اس کے سامنے لہرا رہا تھا مگر اس کی نظریں گاڑی کے اندر ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔

فلک کو کوئی عجیب سا احساس ہوا تھا۔ ڈلیش بورڈ کے ایک کونے میں اس نے کچھ روپے پڑے دیکھے تھے۔ می اکثر اپنی گاڑی میں اوپر تھوڑی بہت رقم اس طرح گلو کپارٹمنٹ اور ڈلیش بورڈ کے اوپر ضرور رکھتی تھیں۔ اس نے وہ روپے اٹھا کر اسے بچے کے ہاتھ میں تھما دیئے اس نے کچھ حیرانی سے فلک کو دیکھا تھا یوں جیسے اسے فلک سے یہ توقع نہیں تھی۔

”یہ روپے رکھ لو، مجھے اخبار کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس نے نرم آواز میں اس بچے کو مخاطب کیا تھا۔

”مگر یہ تو بہت زیادہ ہیں۔“ بچے کی آواز میں کچھ گھبراہٹ تھی۔

”پھر بھی رکھ لو۔“

اس نے روپے اس کے ہاتھ میں تھما دیئے تھے۔ اس بچے کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے ایک چمک ابھری تھی پھر وہ سوکانوٹ جیب میں ڈال کر کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا۔ فلک نے ایک بار پھر گاڑی کا شیشہ ادھر چڑھا لیا۔ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے وہ اس بچے کو دور جاتا دیکھتی رہی۔ چلپلاتی ہوئی دھوپ نے اس کے پورے وجود کو پینے سے شرابور کیا ہوا

تھا۔ اسے اس بچے پر ترس آیا تھا، پتا نہیں کون سی مجبوری اسے اس عمر میں یوں خوار کر رہی تھی۔ بچہ بہت دور چلا گیا تھا مگر اس کی نظریں ابھی بھی اس پر مرکوز تھیں پھر اچانک اس نے بچے کو بھاگ کر سڑک کر اس کرنے کی کوشش کرتے دیکھا اور پھر بائیں سمت سے آنے والی گاڑی نے اسے بہت زور سے چند فٹ اوپر اچھال دیا تھا فلک کے حلق سے بے اختیار چیخ نکلی تھی۔ وہ اب اسے نظر نہیں آ رہا تھا سڑک پر گزرے والی ٹریفک نے اسے اس کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ اس نے چند گاڑیوں کو اس جگہ رکتے دیکھا جہاں وہ گرا تھا، پھر فٹ پاتھ پر چلنے والے کچھ لوگ بھی تقریباً بھاگتے ہوئے اس جگہ کی طرف گئے تھے۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی۔

”کیا بات ہے فلک؟ کہاں جا رہی ہو؟“ می گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ رہی تھیں۔

”وہاں می! وہاں ایک بچے کا ایک سیڈنٹ ہو گیا ہے۔“

اس نے ہاتھ اٹھا کر گاڑی کے کھلے دروازے سے دور اس جگہ کی طرف اشارہ کیا تھا جہاں اب رش بڑھتا جا رہا تھا۔ می اپنی سیٹ سنبھال چکی تھیں۔

”ایسے ایک سیڈنٹ ہوتے رہتے ہیں۔ تم بھلا وہاں جا کر کیا کرو گی؟“ انہوں نے ڈور ہینڈل کو پکڑ کر اس کی طرف والا دروازہ بند کر دیا تھا۔

”می وہ بچہ..... پتا نہیں وہ۔“

آواز اس کے حلق میں اٹک گئی تھی۔ می نے کار اشارٹ کر لی تھی۔

”اتنے لوگ ہیں وہاں، لے جائیں گے اسے ہسپتال۔ ہم بھلا کیا کر سکتے ہیں وہاں جا کر، اور ویسے بھی مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے۔ سزا نور کے گھر جانا ہے ان کے بوتیک کا افتتاح ہے۔“

وہ بے یقینی سے می کے چہرے کو دیکھتی رہی، گاڑی اب سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

”کیا انہیں کچھ محسوس نہیں ہوا؟ کچھ بھی نہیں؟ آخر کیوں؟ کیا وہ انسان نہیں تھا۔“

می اس کی سوچوں سے بے خبر اپنی باتوں میں مصروف تھیں۔ اس نے اپنے اندر خلا کو ایک بار پھر پھیلتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ ”یہ بے حسی ہمارے وجود، ہماری کلاس کا حصہ کیوں بن گئی ہے؟ چوٹ کھانے والا اپنا نہ ہو تو کیا اسکی پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔ میری کلاس میز کی بات کرتی ہے، ایٹی کیلس کا ڈھنڈورا بیٹتی ہے، کیا انسانی ہمدردی منہ ز سے باہر کی کوئی چیز ہے کیا زندگی گزارنے کے لیے کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور بات کرنے کا طریقہ آنا ہی کافی ہے؟“ سوالات کی ایک بھر مار نے اسے نئے سرے سے گھیر لیا تھا۔

”اور پھر اللہ اتنا درد لگتا ہے تو ہمیں اس بات کا شکوہ کرنے کا کیا حق ہے۔“
اس نے اپنی ماں کے چہرے کو دیکھا تھا۔ وہ اب بھی مسلسل بول رہی تھیں۔ اس کی
کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر اس بچے کا چہرہ آ گیا تھا۔ گاڑی
کے ساتھ ٹکرانے کے بعد اچھلتا ہوا اس کا وجود اور ہوا میں لہراتے ہوئے اخبارات اس نے
اپنے وجود کو ریت کا ڈھیر بننے محسوس کیا تھا۔

”مٹی! چپ ہو جائیں۔ فارگا ڈسک چپ ہو جائیں۔ بند کر دیں یہ ساری باتیں
میرا دم گھٹ رہا ہے، بس خاموش ہو جائیں۔ یہ سب کچھ مجھے نہ بتائیں۔“
وہ پاگلوں کی طرح کانوں پر ہاتھ رکھ کر ایک دم چیخنے لگی تھی۔ میونہ کچھ خوفزدہ ہو کر
خاموش ہو گئی تھیں۔

”ابھی تو سائیکلائرسٹ کے ساتھ سیشن کروا کر لائی ہوں اور پھر بھی آدھ گھنٹہ بعد ہی
اس کا یہ حال ہو گیا ہے۔“ میونہ نے مایوسی سے سوچا تھا۔

اگلے کئی دن تک وہ گم سم اپنے کمرے میں قید رہی تھی۔ وہ کوشش کے باوجود اس
بچے کو اپنے ذہن سے محو نہیں کر سکی تھی۔ وہ جیسے اس کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔ ”پتا نہیں اسے
کتنی چوٹ آئی تھی پتا نہیں وہ زندہ بھی ہو گا یا۔“

وہ آگے کچھ نہ سوچ پاتی۔ اس دن عصر کی نماز پڑھنے کے بعد وہ اپنے کمرے کی
کھڑکیوں کے پاس رکھی ایزی چیئر کے اوپر آ کر بیٹھ گئی۔ کھڑکی کے باہر لان میں مدہم
آوازیں ابھر رہی تھیں۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے آواز کو
پہچاننے کی کوشش کی تھی پھر اس نے الفاظ کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ آواز اس کے ڈرائیور
کی بیٹی رضیہ کی تھی۔ جو نوٹے پھونے تلفظ کے ساتھ انگلش کا کوئی سبق دہرا رہی تھی۔

”ابو بن ادہم ایک عابد و پرہیزگار شخص تھے۔ ایک رات کو اچانک ان کی آنکھ کھل
گئی۔ ان کا کمرہ نور سے روشن تھا۔ انہوں نے ایک فرشتے کو دیکھا جو اپنی سنہری کتاب میں
کچھ لکھ رہا تھا۔“

بہت آہستگی سے فلک نے اپنی بند آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس کی سماعتیں اب
کھڑکی کے باہر کو نیچے والی آواز پر مرکوز تھیں۔ رضیہ تقریباً ہر لفظ کو بہت برے طریقے سے ادا
کر رہی تھی مگر وہ پھر بھی لفظوں کو پہچان رہی تھی۔

”ابو بن ادہم نے فرشتے سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہا ہے تو اس نے کہا کہ ان لوگوں
کے نام لکھ رہا ہوں جو اللہ سے محبت کرتے ہیں۔“ فلک اب سانس تک روک چکی تھی۔ اس کا

دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ رضیہ اب لڑکھڑاتی آواز کے ساتھ رک رک کر بول رہی تھی۔
”ابو بن ادہم نے پوچھا کیا اس فہرست میں ان کا نام بھی شامل ہے؟ فرشتے نے
نفی میں جواب دیا تو ابو بن ادہم نے درخواست کی کہ ان کا نام ان لوگوں میں شامل کر لیا جائے
جو اپنے ساتھی انسانوں سے محبت کرتے ہیں۔“

فلک کو اپنی آنکھوں میں کچھ کرچیاں سی چبھتی محسوس ہوئی تھیں۔
”فرشتے نے ابو بن ادہم کا نام لکھا اور غائب ہو گیا، اگلی رات فرشتہ پھر آیا اور اس
نے ابو بن ادہم کو ان لوگوں کی لسٹ دکھائی جن سے اللہ محبت کرتا ہے۔
ابو بن ادہم کا نام اس لسٹ میں سب سے اوپر جگہ گرا رہا تھا۔“

رضیہ ایک بار پھر اپنے سبق کو شروع سے پڑھنے میں مصروف تھی اور فلک اندر کسی
پتھر کے بت کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ گالوں پر پھسلتا ہوا گرم پانی اس کی گود میں رکھے ہوئے
ہاتھوں پر گر رہا تھا۔

”اور میں تم تک کسی انسان کے لیے کچھ کیے بغیر ہی پہنچنا چاہتی تھی پھر تم رستہ کیسے
دکھاتے؟ اور اب اگر میں لوگوں کے ذریعے تم تک آؤں تو کیا تم مجھے مل جاؤ گے؟ کیسے لوگ
ہوتے ہیں، اللہ جن سے تو محبت کرتا ہے، جنہیں تو چاہتا ہے، جنہیں تو مل جاتا ہے؟ کیا ابو بن
ادہم جیسے لوگ؟ اور ان کی طرح کیسے بنا جاتا ہے؟ اللہ تو بتا ان میں کیا خاص چیز ہوتی ہے؟“
اس کا ذہن جیسے کسی گرداب میں پھنسا ہوا تھا۔

”ہاجی! یہ گھر ہے اس کا۔“ بلاآ خرایک گھر کے سامنے پہنچ کر وہ لڑکا رک ہی گیا تھا۔
اس نے آگے بڑھ کر ایک جھگی کے دروازے پر دستک دی تھی فلک طائرانہ نظروں سے اس خستہ
حال جھگی کا جائزہ لیتی رہی۔ چند لمحوں بعد سترہ اٹھارہ سال کی ایک لڑکی نے دروازہ کھولا تھا۔
”یہ ہاجی ماجد سے ملنا چاہتی ہیں۔“ اس کے ساتھ آنے والے بچے نے جیسے اس
کا تعارف کروایا تھا۔ اس لڑکی کے چہرے پر تعجب اور سراسیمگی اکٹھی ابھری تھی، وہ بچہ چلا گیا
تھا۔

”تم ماجد کی بہن ہو؟“ فلک نے اس سے پوچھا۔
”ہاں!“ اس لڑکی کا جواب مختصر تھا۔
”میں اندر آ جاؤں؟“ فلک نے اس سے اجازت طلب کی تھی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے
دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

فلک دروازہ پار کر کے اندر آگئی تھی۔ جھلکی کی ہر چیز اپنے مکینوں کی خستہ حالی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ اندر عجیب سی گھٹن اور جس تھا یوں جیسے وہاں ہوا کا گزر کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ فلک کو بے اختیار اپنا چہ کمال کا گھریا آیا تھا۔ اس کا ہاتھ روم بھی اس کمرے سے زیادہ بڑا تھا۔ لڑکی کی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کہاں بٹھائے۔ سادہ لباس میں ملبوس ہونے کے باوجود وہ اپنے چہرے اور حلیے سے اسے کوئی معمولی عورت نہیں لگی تھی۔ اس نے کچھ بوکھلاہٹ کے بعد ایک جھلنگاسی چارپائی اس کے سامنے بچھا دی تھی، فلک چارپائی پر بیٹھنے کے بجائے مٹی سے لپے ہوئے فرش پر بیٹھ گئی تھی۔ لڑکی جیسے سکتے میں آگئی تھی۔ پھر کچھ ہچکچاہٹ کے بعد وہ خود بھی فلک کے پاس ہی فرش پر بیٹھ گئی تھی۔

”تمہاری امی کہاں ہیں؟“ اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پوچھا تھا۔

”وہ کچھ گھروں میں کام کرتی ہیں، وہاں گئی ہوئی ہیں۔“

”اور ابو؟“

”انہیں مرے دو سال ہو گئے ہیں۔“

فلک ایک لمحے کو چپ ہو گئی تھی۔ ”کتنے بہن بھائی ہو؟“

”تین بہنیں اور دو بھائی۔“ اس نے لڑکی کے چہرے پر ایک سائے کو گزرتے دیکھا تھا۔

”ماجد کے مرنے کا مجھے بہت افسوس ہوا۔ دوسرا بھائی کیا اس سے بڑا ہے؟“

”نہیں، وہ سات سال کا ہے۔“

”تم سب سے بڑی ہو؟“

”ہاں، باقی دو اماں کے ساتھ لوگوں کے گھر کام کرنے جاتی ہیں۔ میں گھر پر ہوتی ہوں۔ کپڑے سیتی ہوں لفافے بناتی ہوں اور بھی بہت سے کام کرتی ہوں، تمہیں کوئی کام کروانا ہے کیا؟“

فلک گم سم اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی آس تھی۔ یوں جیسے..... فلک نے اپنا بیگ کھولا تھا پھر ایک پیکٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

”یہ کچھ روپے ہیں، تم اپنی امی کو دے دینا۔ میں دوبارہ آؤں گی۔ تم لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا وہ لڑکی کو ہکا بکا چھوڑ کر وہاں سے نکل آئی تھی۔“

اس دن وہ اس بچے کے بارے میں پوچھنے کے لیے اسی سڑک پر آئی تھی۔ سڑک پر اخبار بیچنے والے بچوں سے اس نے اس بچے کے بارے میں پوچھا تھا اور یہ جان کر وہ دل گرفتہ سی ہو گئی تھی کہ وہ بچہ مر چکا ہے۔ ”کیا تم مجھے اس کا پتا بتا سکتے ہو؟“ فلک نے ایک بچے

سے کہا تھا وہ بچہ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد اسے اس علاقے میں لے آیا تھا جہاں جھکیوں اور ٹولے چھوٹے مکاناتوں کا پورا جہاں آباد تھا اور پھر وہ ماجد کے گھر پہنچ گئی تھی۔

اپنے گھر واپس آتے ہوئے اسے پہلی بار اپنے گھر کے در و دیوار مانوس نہیں لگ رہے تھے، اسے آدھے گھنٹے پہلے دیکھی ہوئی وہ جھلکی یاد آگئی تھی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے کسی نے اسے حلق سے دیوچ لیا تھا۔

”لوگ کن کن چیزوں کے بغیر رہ رہے ہیں اور میں۔ مجھے لگتا ہے کہ دنیا میں کسی پر قیامت ٹوٹی ہے تو وہ میں ہی ہوں۔ چھ کنال کے بیگلے میں رہ کر، آٹھ آٹھ لاکھ کی گاڑیوں میں پھر کر، اپنے وجود کو آسانٹوں سے سجا کر اور اپنے پیٹ کو دنیا کی ہر نعمت سے بھر کر آخر مجھے کس اللہ کی تلاش ہے۔ وہ آخر مجھ پر نظر کرے تو کیوں کرے۔ مجھ سے محبت کرے تو کیوں کرے۔ مرد محبت کرے تو تحائف کا ڈھیر عورت کے سامنے لگا دیتا ہے۔ اس کے لیے بے تحاشا روپیہ خرچ کرتا ہے اسے ہولٹز میں لے کر جاتا ہے۔ وہ کسی چیز کی طرف اشارہ کرے تو یہ ممکن نہیں کہ وہ اسے خرید کر نہ دے۔“

عورت مرد سے محبت کرتی ہے تو اس مرد کے اشارے پر چلتی ہے۔ وہ اس سے روپیہ مانگے تو وہ سو جھوٹ بول کر ہر قیمت پر اسے روپیہ دیتی ہے۔

اللہ سے انسان محبت کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اللہ بھی اس سے محبت کرے مگر محبت کے لیے وہ کچھ دینے کو تیار نہیں۔ اللہ کے نام پر وہی چیز دوسروں کو دیتا ہے جسے وہ اچھی طرح استعمال کر چکا ہو یا پھر جس سے اس کا دل بھر چکا ہو۔ چاہے وہ لباس ہو یا جوتا۔ وہ خیرات کرنے والے کے دل سے اتری ہوئی چیز ہوتی ہے اور اس چیز کے بدلے وہ اللہ کے دل میں اترنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے اس پرانے لباس، گھسی ہوئی چپل یا ایک پلیٹ چاول کے بدلے اسے جنت میں گھر لے جائے۔ اللہ اس کی دعائیں قبول کرنا شروع کر دے۔ اس کے بگڑے کام سنورنے لگیں۔ وہ جانتا ہے، اللہ کو دلوں تک سرنگ بنانا آتا ہے پھر بھی وہ اللہ کو دھوکا دینا چاہتا ہے اور میں میں فلک شیرا لگن صرف آنسو بہا کر، مصلے پر بیٹھ کر، صرف اللہ کا نام لے لے کر اللہ کی محبت حاصل کرنا چاہتی ہوں اس کی نظر چاہتی ہوں مگر اس کے لیے کرنا کچھ نہیں چاہتی۔“

کوئی اس کے دل کو جیسے مٹھی میں لے رہا تھا۔ لاؤنج کے اندر جانے کے بجائے وہ باہر دروازے کے پاس بیٹھ گئی۔ سامنے نظر آنے والا وسیع و عریض لان جیسے اسے ہولا رہا تھا۔ اس نے اپنی قمیص کے دامن کو پکڑ کر دیکھا۔ لباس سادہ تھا مگر قیمتی تھا۔ اسے یاد تھا چند ماہ پہلے اس نے کراچی سے سلمان کے ساتھ گرمیوں کے ملبوسات کی شاپنگ کی تھی تب ابھی وہ واقعہ

پیش نہیں آیا تھا۔ اسے اس کپڑے کی قیمت یاد نہیں تھی مگر یہ یاد تھا کہ وہ قیمت ہزاروں میں تھی۔

”یہ تو کل ہے؟ یہ قناعت ہے؟ یہ میرے ہے؟ یہ عاجزی ہے؟ اور مجھے چاہئے اللہ۔“

اس کا دل ڈوب گیا تھا۔ قیص کو اس نے ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ پاؤں میں پہنے جوتے پر اس کی نظر پڑی تھی۔ اس نے داہنے پیر کا جوتا اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ اسے یاد آیا تھا آج وہ جس علاقے سے ہو کر آئی تھی۔ وہاں اس نے بہت سی عورتوں اور بچوں کے پیروں میں معمولی سی چپل تک نہیں دیکھی تھی اور یہ اس جوتے کی قیمت بھلا کیا ہوگی؟ اس نے سوچنے کی کوشش کی تھی۔ اسے یاد نہیں آیا۔ وہ ہر بار شاپنگ پر جانے پر دو چار جوتے ضرور لیا کرتی تھی اور مہینے میں چھ سات بار وہ شاپنگ پر چلی جایا کرتی تھی۔ اسے یاد بھی نہیں تھا کہ یہ جوتا اس نے کب خریدا تھا مگر وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ اس کا کوئی جوتا بھی ایک ہزار سے کم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے جوتا گر گیا تھا۔ وہیں دیوار کے ساتھ پیشانی ٹیک کر اس نے سسکیوں کے ساتھ رونا شروع کر دیا تھا۔ شاید کسی ملازم نے اندر جا کر اس کی کمی کو اطلاع دی تھی وہ تقریباً بھاگتی ہوئی باہر آئی تھی۔

”فلک! تم واپس آگئیں؟ کیا ہوا ہے میری جان؟ کیوں اس طرح رو رہی ہو؟“

انہوں نے اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا تھا۔

”مئی! آپ کو پتا ہے مجھے اللہ کیوں نہیں مل سکتا۔ میرے اور اللہ کے درمیان خواہشوں کی دیوار ہے۔ آسانسٹوں کی دیوار ہے۔ میں نے اپنے ارد گرد دنیا کی اتنی چیزیں اکٹھی کر لی ہیں کہ اللہ تو میرے پاس آ ہی نہیں سکتا ابو بن ادھم کو اس کی محبت کی چاہ تھی۔ اسے اس نے اپنی محبت دے دی۔ میری تمنا یہ چیزیں تھیں۔ آسانسٹات تھیں، سلمان تھا۔ مجھے اس نے بس یہ سب کچھ ہی دیا جسے وہ اپنی محبت دے دیتا ہے اسے پھر اور کسی چیز کی خواہش ہی نہیں ہوتی اور جسے دنیا دیتا ہے اس کی خواہش بھوک بن جاتی ہے۔ کبھی ختم ہی نہیں ہوتی۔ مئی ابو بن ادھم جیسے لوگ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں اور میرے جیسے لوگ۔“

وہ ان کے کندھے پر سر رکھ کر بلیک بلیک کر رونے لگی تھی۔

”کون ابو بن ادھم؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ مئی اب

پریشان ہو رہی تھیں۔

”مئی! مجھے بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کچھ بھی نہیں جن لوگوں کی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ انہیں سب کچھ مل جاتا ہے۔ میرے جیسے لوگ تو ساری زندگی سمجھنے کی کوشش ہی کرتے رہ جاتے ہیں۔“

”تمہیں پھر دورہ پڑ گیا ہے پھر وہی جنون سوار ہو گیا ہے۔“ اس کی مئی نے ایک گہری سانس لے کر کہا تھا۔

”یہ جنون نہیں ہے۔ مئی! یہ جنون نہیں ہے۔“ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی تھی۔

”یہ جنون ہے۔“ اس نے زمین پر پڑا ہوا جوتا انہیں دکھاتے ہوئے کہا تھا۔ ایک عجیب سی وحشت اس پر سوار ہو گئی تھی۔

”یہ جنون ہے۔“ اب وہ اپنی قیص پکڑ کر انہیں دکھا رہی تھی۔

”یہ لاکھوں کی گاڑیاں جنون ہے۔“ اس نے پورج کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ”یہ کروڑوں کے گھر جنون ہیں۔ آئیں میں آپ کو دکھاؤں اور کیا کچھ جنون ہے۔“ وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی انہیں گھر کے اندر لے گئی۔ ”یہ کارپٹ جنون ہے جن پر چلتے ہوئے ہمیں لوگوں کے پیروں میں چھپتے ہوئے پتھر اور کانٹے محسوس نہیں ہوتے۔ یہ عالی شان اور قیمتی فرنیچر جنون ہے جن پر بیٹھ کر ہمیں اپنا وجود بھی اتنا ہی عالی شان اور قیمتی لگنے لگتا ہے۔“ وہ لاؤنج میں آ کر چلانے لگی تھی۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے فلک“ مئی اب گھبرار رہی تھیں۔

”ہاں مئی! میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں پاگل ہو گئی ہوں۔ میرے اور آپ جیسے سارے لوگ پاگل ہی تو ہوتے ہیں ہم لوگوں نے چیزوں سے اتنا عشق کیا ہے کہ اس دنیا میں رہنے والے انسانوں کی زندگی کو عذاب بنا دیا ہے۔ ہم سب پاگلوں نے مل کر۔ آئیں میں دکھاؤں مجھے کن چیزوں نے پاگل بنایا ہے۔ وہ ایک بار پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی اپنے بیڈروم میں لے آئی۔ روتے ہوئے اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے ہوئے پرفیوم ان کی طرف اچھالنے شروع کر دیئے تھے۔“

”یہ بھی جنون ہے مئی! میرے اور آپ جیسے لوگ اپنے اندر کی بدبو کو چھپانے کے لیے یہ پرفیوم خود پر انڈھیلتے ہیں۔ اپنے چہرے اور وجود کو میک اپ سے رنگتے رہتے ہیں۔“ اس نے اب اپنی داڑھی روپ کھول کر کپڑے باہر پھینکنے شروع کر دیئے تھے۔

”یہ ہے جنون مئی! یہ ابو بن ادھم جیسے لوگ لباس سے جسم کو چھپانے کا کام لیتے ہیں۔ ہمارے جیسے لوگ جسم کو دکھانے کا۔ یہ ہنگے کپڑے پہن کر ہمیں چھتروں میں پھرنے والے لوگ جانور لگتے ہیں۔“ اس کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔

”یہ جنون ہے مئی۔“ اب اس نے اپنی دراز کھول کر زیور کمرے میں اچھالنے شروع کر دیئے تھے۔ ”یہ جنون ہے۔ یہاں کتنے لوگ ہیں مئی جو ایک وقت کے کھانے کے لیے صبح

سے شام تک جانوروں کی طرح کام کرتے ہیں پھر بھی بہت دفعہ انہیں کچھ کھانے کو نہیں ملتا جو رات کو سوسیں تو انہیں یہ بھی یقین نہیں ہوتا کہ صبح تک جھگی کی ہلتی ہوئی چھت ان کے گھر کو گھر رہنے دے گی۔ یا بلے کا ڈھیر بنا دے گی۔ ماجد جیسے بچوں کے لیے کوئی بچپن سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ ان کی زندگی پیدائش سے مرنے تک صرف بڑھاپا ہوتا ہے اور میرے جیسے لوگ روپیہ صرف زندگی کی بنیادی ضروریات پر ہی خرچ نہیں کرتے پھر انہیں اپنے وجود پر زیور بنا کر لٹکا بھی لیتے ہیں۔ جسم کے ہر حصے پر، پاؤں میں اٹھلیوں میں۔ کلائیوں میں، کانوں میں، ناک میں، گردن میں، ماتھے پر، سر پر، کیا حق پہنچتا ہے می! مجھے اور آپ جیسے لوگوں کو یہ ظلم کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے۔ پھر ڈاکے کیوں نہ پڑیں ہم جیسے لوگوں کے گھروں پر دن دہاڑے سڑک پر ہمارا زیور کیوں نہ لوٹا جائے۔“

وہ اب بلک رہی تھی۔ اس کی دم بخود اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر بیڈروم ریفریجریٹر کھول دیا تھا۔

”یہ چیزیں ہیں می! جنہوں نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ ان چیزوں کو کھانے کے بعد ہمیں روٹی کے سوکھے ٹکڑوں سے پیٹ بھرنے والے کیڑے لگتے ہیں، انسان نہیں۔“

”یہ سب خدا کی رحمت ہے۔ اس کا فضل ہے۔ وہ جسے چاہے دے ہمیں دیا ہے تو ہمیں اسے خرچ کرنے کا حق ہے، تمہیں شکر کرنا چاہئے کہ خدا نے تمہیں ان سب چیزوں سے محروم نہیں کیا۔“

میونہ پہلی بار بلا خرمیت کر کے بولی تھیں۔

”می! دولت فضل نہیں ہے آزمائش ہے۔ کھانے کی چیزوں سے بھرا ہوا یہ فریج رحمت نہیں ہو سکتا، کپڑوں سے بھری ہوئی یہ وارڈ رو ب رحمت نہیں ہو سکتی، جیولری سے بھرے ہوئے یہ دراز اور روپے سے بھرا ہوا یہ لاکر بھی رحمت نہیں۔ یہ گاڑیاں، یہ بیٹلے، یہ سب کچھ رحمت نہیں ہے۔ فضل نہیں ہے می اصراف ہے، کمینگی ہے، خود غرضی ہے، ذلالت ہے۔ آپ کے اور میرے پاس یہ رحمت اور فضل ہے تو اس گھر کے نوکر ہماری اترن کیوں پہنتے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے کوارٹروں میں کیوں رہتے ہیں۔ اس رحمت اور فضل کی حفاظت کے لیے جو گاڑ گیسٹ پر کھڑے ہیں۔ وہ ٹوٹی ہوئی سائیکلوں پر کیوں جاتے ہیں۔ اس گھر میں رہنے والے نوکروں کے بچے چیزوں کے لیے کیوں ترستے ہیں، ہم نے اللہ کی رحمت اور فضل میں سے انہیں کیا دیا؟ اپنی اترنیں، بچا ہوا کھانا، جھڑکیاں، تنخواہوں میں سے کٹوتی۔ آپ نے کبھی نوکروں کے بچوں سے پوچھا کہ وہ اسکول کس طرح جاتے ہیں۔ اگر پیدل جاتے ہیں تو آپ

نے کبھی اپنی ان دس گاڑیوں میں کسی ایک پر چند گھنٹوں کے لیے انہیں سفر کرنے دیا۔ اگر اسکول نہیں جاتے تو آپ نے کبھی جاننے کی کوشش کی کہ کیوں نہیں جاتے۔ میں سوچتی ہوں، کاش اللہ مجھے کچھ نہ دیتا پھر میں اس سے یہ سب کچھ مانگتی، مانگنے کا ہی سہی مگر اس کے اور میرے درمیان کوئی رشتہ تو ہوتا، چھبیس سال میں ایک بار ہی سہی کبھی میں اس سے کچھ مانگتی تو..... اور پھر وہ مجھے وہ چیز دے دیتا تو میں خوش ہو کر اسے اور یاد کرتی۔ اس کا شکر یہ ادا کرتی اور اگر وہ میری دعا قبول نہ کرتا تو بھی میں شکر کرتی۔ اس کی رضا پر خوش رہتی اور یہ شکر گزاری، یہ صبر اسے کتنا خوش کرتا۔ می! یہ لوگ جو ہمیں کیڑے اور جانور لگتے ہیں، یہ خدا کے نزدیک کیا ہیں کاش آپ کو بھی بتا چلا جاتا۔“

وہ اب کارپٹ پر گھنٹوں کے بل گرے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپنے دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ میونہ بے بسی سے اس کے پاس کھڑی تھیں اس عمر میں اکلوتی اولاد کو اس طرح خوار ہوتے بھی دیکھنا تھا۔ انہیں بے اختیار رونا آیا تھا۔



اگلے تین ہفتے وہ ہاسپٹل رہی تھی۔ ایک بار پھر وہ نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو گئی تھی۔ اس بار کچھلی بار کی نسبت اس کی کیفیت زیادہ خراب تھی۔ جب تک وہ ٹریکولائزرز کے زیر اثر رہتی۔ سب کچھ ٹھیک رہتا۔ مگر جب بھی وہ ہوش میں آتی، چیخنے چلانے لگتی۔ اس کے سر میں درد ہوتا۔ وہ دم گھٹنے کی شکایت کرتی۔ اس کی بھوک پیاس ختم ہو گئی تھی۔ تین ہفتے بعد آہستہ آہستہ وہ نارمل ہوتی گئی تھی۔ شیراٹکن ڈاکٹر سے مشورہ کے بعد اسے گھر لے آئے تھے۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے امریکہ بھجوادیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ ماحول کی تبدیلی اس کی ذہنی حالت کو بہتر کر دے گی۔

اس صبح میونہ نے اسے کمرے سے کچھ بیگز کے ساتھ نکلنے دیکھا تھا تو وہ ہول گئی تھیں۔ ”کہاں جا رہی ہو فلک؟“

”تھوڑی دیر میں آ جاؤں گی می۔“ وہ آج خلاف معمول بہت پرسکون لگ رہی تھی۔

”مگر کہاں رہی ہو اور ان بیگز میں کیا ہے؟“ میونہ کو تسلی نہیں ہوئی تھی۔

”میری چیزیں ہیں، کسی کو دینے جا رہی ہوں۔“

”کس کو دینے جا رہی ہو؟“

”جن کو ضرورت ہے۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں می! ان چیزوں کے بغیر کیسے رہا جاتا ہے، کل رات میں نے ایک کتاب میں پڑھا کہ جن کا دل مومن ہوتا ہے۔ وہ خدا کے نام پر

کچھ بھی دے سکتے ہیں۔ کسی ملال کے بغیر، میں دیکھنا چاہتی ہوں می! کیا میرا مومن کا دل ہے۔ کیا اپنی بہترین اور پسندیدہ چیزیں دوسرے کو دینے پر مجھے ملال ہوتا ہے؟“ میمونہ اسے روکنا چاہتا تھا مگر وہ کامیاب نہیں ہوئی تھیں۔ وہ چلی گئی تھی۔

”وہ جو کرتی ہے، اسے کرنے دو۔ اگر یہ سب کرنے سے وہ ٹھیک ہو سکتی ہے تو یہ سب کچھ ہنگامہ نہیں ہے۔ دے دینے دو جو دینا چاہتی ہے۔“

اس کے جانے کے بعد انہوں نے گھبرا کر شیر الگن کو فون کیا تھا اور انہوں نے اسے یہ جواب دیا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی تھیں۔

پھر یہ سب کئی ہفتے ہوتا رہا تھا۔ اس نے اپنی تقریباً تمام چیزیں مختلف اداروں کو عطیہ کر دی تھیں۔ وہ روز صبح گھر سے پیدل نکل جاتی، کبھی ایس او ایس ویلج جا کر پورا دن وہاں بچوں کو پڑھاتی رہتی یا پھر چھوٹے بچوں کو سنبھالتی، کبھی فاؤنٹین ہاؤس جا کر شیز و فرینڈز کے مریضوں کی دیکھ بھال کرتی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے ویکنوں میں سفر کرنا سیکھا تھا۔ لوگوں کے ہجوم میں دھکے کھاتے ہوئے سڑکتے ہوئے اپنے لیے جگہ بناتے ہوئے اس نے اس تکلیف کو محسوس کیا تھا، جو اس کے ارد گرد نظر آنے والے عام لوگوں کا مقدر تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ اپنے چیزیں خریدنے ان معمولی بازاروں کی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں جانے لگی تھی پہلے جن کے تصور سے بھی اس کا دم گھٹتا تھا۔ اپنے وجود کو سرسے پاؤں تک ایک سیاہ چادر سے چھپائے وہ لوگوں کے چہرے حسرت سے دیکھتی ہر چہرے کو دیکھ کر اسے یوں لگتا جیسے اللہ اس سے ہی محبت کرتا ہوگا۔

اس دن اپنے گھر کی طرف آتے ہوئے اسے اچانک کچھ یاد آیا تھا۔ اس نے سڑک پر چلتے ہوئے اچانک پیروں سے چپل اتار کر پیدل گرم سڑک پر چلنا شروع کر دیا تھا۔ گرم سڑک اور اس پر پڑے ہوئے پتھر اس کے پیروں کے ٹکڑوں کو کھلسانے لگے تھے۔ سڑک پر اکا دکا ٹریفک آ رہی تھی۔ وہ گیلی آکھوں اور جلتے ٹکڑوں کے ساتھ دوڑتی چلتی رہی پھر جب تکلیف اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تو اس نے چپل پیروں میں بہن لی۔

”اور جب حضور ﷺ اپنے صحابہوں رضوان اللہ علیہم کو ہدایت دیتے تھے کہ وہ آسائش کو عادت نہ بنائیں اور کبھی کبھار ننگے پاؤں بھی چلیں تو وہ انہیں اس تکلیف سے مانوس کرنا چاہتے تھے جسے میں برداشت نہیں کر سکتی اور جو بہت سے لوگوں کا مقدر ہوتی ہے۔“

اسے اپنے پیروں میں اب بھی جلن محسوس ہو رہی تھی اور اب اسے ان لوگوں کے گندے اور ننگے پیروں سے گھن نہیں آ رہی تھی جو کسی جوتے سے بے نیاز سامان کندھوں پر

اٹھائے ادھر ادھر جاتے اسے نظر آتے تو اسے وحشت ہوتی۔ گھر آ کر اس نے الماری میں پڑے ہوئے چند آخری جوتے بھی نکال لیے تھے۔

”ایینہ! یہ لو یہ جوتے تم بہن لینا۔“ وہ جوتے لے کر گھر کے پیچھے سرونٹ کو اڑھائی تھی اور وہاں اس نے اپنی نوکرانی کے پیروں میں اتنی عقیدت اور عاجزی سے جھک کر وہ جوتے رکھے تھے کہ وہ گھبرا گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی مالک سے کچھ کہتی، وہ وہاں سے آگئی تھی۔

”بی بی کے دماغ کو واقعی کچھ ہو گیا ہے۔“

ایینہ نے نئے جوتے اٹھاتے ہوئے ہمدردی سے اپنی مالک کے بارے میں سوچا تھا۔ اس دن وہ اچھروہ بازار میں کپڑے کی ایک چھوٹی سی دکان پر گئی تھی۔

”مجھے وہ سوٹ دے دیں جو بہت سستا ہو پھر بھی ہر کوئی اس میں نقص نکال کر ناپسند کرتا ہو اور خریدنے سے انکار کر جائے۔“

دکاندار نے حسرت سے اسے دیکھا تھا۔ اس کی اس بات سے اسے اس لڑکی کی دماغی حالت پر شبہ ہوا تھا۔ مگر اس کی شکل و صورت اسے اپنا خیال بدلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ کچھ ہنچکچاتے ہوئے اس نے ایک سوٹ پیس اس کے سامنے رکھ دیا تھا اس نے کچھ کہے بغیر قیمت ادا کی اور کپڑا اٹھا کر باہر نکل آئی۔

میمونہ اور شیر الگن نے جیسے اس کے حال پر صبر کر لیا تھا۔ ان کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ اب وہ پہلے کی طرح معمولی باتوں پر روتی تھی نہ اس پر ڈپریشن کے دورے پڑتے تھے۔ وہ صبح گھر سے نکلتی اور سہ پہر کو مقررہ وقت پر گھر آ جاتی۔ پھر خاموشی سے اپنے کمرے میں بیٹھ کر قرآن پاک کا انگلش ترجمہ پڑھتی رہتی۔ ان کا خیال تھا آہستہ آہستہ وہ نارمل ہوتی جائے گی اور پھر وہ مسلمان سے طلاق لے کر اسے باہر بھجوا دیں گے۔ انہوں نے اس کے منہ سے یہاں آنے کے بعد کبھی مسلمان کا ذکر نہیں سنا تھا۔ اس سے کوئی شکوہ اس کی کوئی شکایت اپنا کوئی بچھتاوا وہ انہیں کچھ بھی نہیں بتاتی تھی۔

رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ رمضان کے پہلے جمعے کو وہ صلوٰۃ التبیح پڑھنے شہر کے وسط میں واقع ایک جامع مسجد میں آئی تھی۔ ویکن سے اترنے کے بعد مسجد کی طرف آتے ہوئے اس نے فٹ پاتھ پر ایک درخت کے نیچے ایک بوڑھے آدمی کو کچھ روپے گنتے دیکھا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر اس آدمی سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ وہ آدمی مختلف مالیت کے مڑے تڑے اور میلے چیلے نوٹ اور سکے فٹ پاتھ پر گن گن کر رکھتا جا رہا تھا۔ ایک بار گنتے

کے بعد اس نے دوبارہ روپے گنتے شروع کر دیئے تھے۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر نظر آ رہا تھا۔ وہ وہیں کھڑی اسے بار بار روپے گنتے دیکھتی رہی۔ وہ یا تو بار بار گنتی بھول رہا تھا یا پھر اس کے روپے کم تھے۔ فلک بے اختیار سی اس پاس آگئی تھی۔

”کیا بات ہے بابا؟“ بوڑھے آدمی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا پھر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”میں روپے کہیں گر گئے ہیں میری کل کی دیہاڑی میں سے۔“

فلک نے چند لمحے اس بوڑھے آدمی کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا تھا اور پھر اپنی چادر کے پلو کو کھول کر اس میں بندھے ہوئے روپے نکال لیے تھے پچاس کا نوٹ بڑا کر اس نے دس روپے دیگن والے کو کرائے کے طور پر دیئے تھے۔ باقی چالیس روپے اس نے پلو میں باندھ لئے تھے۔ اب وہ چالیس روپے اس نے جھک کر اس بوڑھے آدمی کے سامنے رکھ دیئے تھے۔

”یہ لیں بابا“ وہ دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے مسجد کی طرف بڑھ گئی تھی۔ آج وہ پہلی بار ہائل خالی ہاتھ تھے۔ لیکن اسے کوئی رنج نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی وہاں پر اسے چار میل کا فاصلہ پیدل طے کرنا ہوگا۔ وہ بھی روزے کی حالت میں۔ مگر وہ اس چیز کے بارے میں نہیں سوچ رہی تھی۔

صلوٰۃ التیمم کی نماز پڑھنے کے بعد وہ مسجد سے باہر نکل رہی تھی۔ جب اچانک بغیر کسی وجہ کے اس کا دل بھر آیا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل گھر جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ وہ سڑھیوں کے ایک کنارے پر بیٹھ گئی۔ عورتیں مسجد کے اس مخصوص دروازے سے نکل کر جا رہی تھیں وہ گھنٹوں میں سر چھپائے وہیں بیٹھی رہی۔

”تجھے کیا ہوا ہے؟“ کسی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تھا۔ اس نے سر اٹھایا۔ وہ ایک بوڑھی عورت تھی جو اس کے سامنے سڑھی پر کھڑی تھی۔

”پتا نہیں اماں۔“ اس نے کہا تھا۔

”کس کے ساتھ آئی ہے؟“ اس عورت نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا تھا۔

”پتا نہیں۔“

”روتی کیوں ہے؟“ اس عورت کی نظر اب اس کے چہرے پر تھی۔

”یہ بھی پتا نہیں۔“

”کوئی بیماری لگ گئی ہے؟“ اس عورت کی آواز میں اب تشویش تھی۔

”بیماری نہیں اماں! روگ۔“

”ہائے ہائے! اس جوانی میں روگ لگ گیا۔“ اب اس کی آواز میں ہمدردی تھی۔

”یہ روگ جوانی میں ہی کلتے ہیں اماں۔“

”مگر کیوں نہیں جاتی؟“

”مگر ہو تو جاؤں۔“

”مگر چاہئے؟“

”نہیں۔“

”تو پھر؟“ وہ عورت اب حیران تھی۔ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ اس عورت کا چہرہ

دیکھتی رہی۔

”تمہیں کیا بتاؤں اماں کیا چاہئے؟“

”تو بتا تو سہی۔“ عورت نے اصرار کیا۔

”بتانے سے مل جائے گا کیا؟“

”سب کچھ بتانے سے ہی ملتا ہے۔ نہ بتانے سے کیسے ملے گا۔ مانگنا پڑتا ہے۔ کہنا پڑتا

ہے۔ منت کرنی پڑتی ہے، وجود کے نصیب میں ہے بھکاری ہونا بس ذات بھکاری نہیں ہو سکتی۔“

وہ سن ہو گئی تھی۔ ایک سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سے گزر گئی تھی۔ اس نے سر

اٹھا کر بوڑھی عورت کا چہرہ دیکھا تھا۔

”وجود کے مقدر میں مانگنا ہے۔“ ذات“ کا وصف دینا ہے۔ کوئی عشق مانگتا ہے،

کوئی دنیا اور جو یہ نہیں مانگتا وہ خواہش کا نہ ہونا مانگتا ہے۔“

اس نے بے اختیار اس بوڑھی عورت کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے پوری

طاقت سے یوں جیسے وہ غائب ہو جائے گی۔

”تو بتا، تجھے کیا چاہئے؟“ پچھلے ایک سال سے جو فقرے رات دن اس کے کانوں

میں گونجتے رہتے تھے۔ وہ انہیں سننے میں غلطی نہیں کر سکتی تھی۔ پورے دو سال بعد اس نے

ایک بار پھر وہی کلمات اس عورت کے منہ سے سنے تھے جو دریا کے کنارے بیٹھے ہوئے اس

فقیر نے کہے تھے۔

”ہاں تو بتا، تجھے کیا چاہئے؟“ عورت ایک بار پھر سے اس سے پوچھ رہی تھی۔ اس

کا پورا وجود کسی تپے کی طرح لرز رہا تھا۔

”مجھے مل چاہئے۔ مجھے ذات چاہئے۔ مجھے اللہ چاہئے، صرف اللہ چاہئے۔“

وہ کسی ننھے بچے کی طرح اس کا ہاتھ پکڑ کر بلکنے لگی تھی۔

”اس سے کہو۔ مجھے دیکھے اس سے کہو۔ مجھ پر نظر کرے، ایک بار ایک لمحہ کے لیے، میں دیکھنے کے قابل نہیں ہوں پر اس سے کہو مجھے دیکھے اسے کہو میرے گندے وجود پر بھی ایک بار اپنی نظر کرے۔ اسے تو شوکر مارنا نہیں آتا۔ اسے تو دھکارا نہیں آتا۔ وہ تو فرق نہیں کرتا۔ وہ تو آس نہیں توڑتا۔“

اس نے اب عورت کا ہاتھ چھوڑ کر اس کے آگے اپنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔
”تجھے بنایا ہے اس نے تو کیا تجھے چھوڑ دے گا؟ کبھی ماں میلے میں بچے کی انگلی چھوڑتی ہے۔ اگر چھوٹ بھی جائے تو بچہ اتنا بے قرار نہیں ہوتا جتنی ماں ہوتی ہے۔ پھر اللہ انسان کو کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ تجھے کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ اس کی نظر میں جو ایک بار آ جاتا ہے ہمیشہ رہتا ہے۔“

اس نے اس عورت کے منہ سے ایک بار پھر وہی لفظ سنے تھے۔ اس نے سیزمی سے ٹیک لگالی۔ ایک عجیب سی ٹھنڈک اسے اپنے حصار میں لے رہی تھی۔ بہت گہرا سکون اس کے اندر اترتا جا رہا تھا اس کے آنسو تھم گئے تھے۔

”گھر جا، اب اور کیا چاہئے تجھے؟“

اس عورت نے ایک بار پھر اس سے کہا تھا۔ اس نے گہرا سانس لے کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

”پہلی جاؤں گی اماں! اب واقعی اور کیا چاہئے۔“

بڑبڑاتے ہوئے اس نے آنکھیں کھول دیں، سامنے سیزمی پر کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ عورت غائب ہو چکی تھی۔ وہ پرسکون انداز میں وہیں بیٹھی رہی اس نے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔



وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ بہت عرصے بعد اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے وجود کو دیکھا تھا۔ ایک سال نے کتنی بہت سی تبدیلیاں کر دی تھیں۔ ہر چیز میں، باطن میں، ظاہر میں اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تھے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے دائیں ہاتھ سے چہرے کے ہر حصے کو چھوا تھا۔ آج کچھ بھی دلفریب نہیں لگ رہا تھا۔ آج پہلے کی طرح اپنا وجود آئینے میں دیکھ کر اس پر سحر نہیں ہو رہا تھا۔ اسے ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا تھا۔ پورے ایک سال بعد وہ آج بیوٹی پارلر گئی تھی۔ مہی کے ساتھ وہ بہت خوش تھیں اس کے نازل ہو جانے پر مہی نے اس کا فیشن کر دیا تھا، پلکنگ، تھریڈنگ، پلپنگ

وہ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔ اس نے پہلے کی طرح بیوٹیشن کے کام میں بار بار مداخلت نہیں کی تھی نہ ہی کوئی اعتراض کیا تھا۔

بیوٹی پارلر سے نکلنے ہوئے اس نے جسم کے گرد لپٹی ہوئی چادر کو ایک بار پھر اچھی طرح لپیٹ لیا تھا۔ میمونہ کے ماتھے پر کچھ شکنیں ابھری تھیں۔

”کوئی بات نہیں، آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔“ انہوں نے خود کو دل ہی دل میں سمجھایا تھا۔

”تم نے اپنی اسکن کا ستیا ناس کر لیا ہے۔“

گاڑی میں بیٹھ کر انہوں نے فلک سے کہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک پرسکون مسکراہٹ ابھری تھی۔

”اللہ نے میرے دل کے داغ صاف کر دیئے ہیں، چہرے کی مجھے فکر نہیں ہے۔“
میمونہ خاموش رہی تھیں وہ نہیں چاہتی تھیں۔ وہ دوبارہ پہلے جیسی باتیں کرنے لگے۔ اور اب وہ آئینے کے سامنے کھڑی دیکھ رہی تھی اسی وجود کو جس سے اسے عشق تھا، فخر تھا اور اب سب کچھ جیسے دھواں بن کر اڑ چکا تھا۔ عشق بھی، فخر بھی وہ ایک گہری سانس لے کر آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

”فلک! فلک! سلمان آیا ہے۔“

ایک دم میمونہ اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ خوشی ان کے پور پور سے چھلک رہی تھی اس نے ایک لمحے کو نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا تھا پھر نظر ہٹالی۔

”جانتی ہوں می! کہ وہ آ گیا ہے۔ جانتی تھی کہ وہ آ جائے گا۔“

”وہ اس عورت کو طلاق دے آیا ہے۔ معافی مانگی ہے اس نے، کہتا ہے تمہیں لینے آیا ہے۔“ میمونہ نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا تھا۔

”برا کیا اس نے۔“ چند لمحے ماں کا چہرہ دیکھنے کے بعد اس نے کہا تھا۔

”ٹھیک کیا اس نے بالکل ٹھیک کیا۔ اس عورت کے ساتھ یہی ہونا چاہئے۔ تمہیں کیا پتہ اس نے کس طرح دونوں ہاتھوں سے اس کا روپیہ لٹایا ہے۔ تم تو.....“

میمونہ اشتعال میں بول رہی تھیں اس نے ہاتھ اٹھا کر بڑی ملامت سے ان کی بات کاٹی تھی۔

”می! بس آپ چپ ہو جائیں۔ کچھ نہ کہیں نہ اس عورت کے بارے میں نہ روپے کے بارے میں نہ سلمان کے بارے میں۔“

”وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میمونہ نے اس سے کہا تھا۔
 ”بھج دیں اسے۔“ وہ اب بھی اسی طرح پرسکون تھی۔ میمونہ مسکرا کر کمرے سے نکل گئی تھیں۔

پورے ایک سال بعد دروازے سے وہ وجود اندر آیا تھا جسے دیکھ کر اس کی دھڑکن رک جایا کرتی تھی۔ جس کے چہرے سے وہ کوشش کے باوجود نظر نہیں ہٹا سکتی تھی۔ جس کی آواز اس کے ذہن میں نہیں دل میں گونجتی تھی۔ جس سے چند لمحوں سے زیادہ نظریں ملائے رکھنا اس کے لیے بہت دشوار ہو جاتا تھا۔ آج..... آج ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ نہ دل دھڑکنا بھولا تھا نہ اس سے نظر ملانی مشکل ہوئی تھی۔ وہ پرسکون انداز میں اسے کمرے میں آتا دیکھتی رہی۔ وہ شرمندہ تھا یہ اس کے چہرے سے عیاں تھا۔

”السلام علیکم!“ گفتگو میں پہل اس نے کی تھی۔ وہ چونکا تھا۔ وہ ہمیشہ ہیلو کہہ کر مخاطب ہوتی تھی اب چند لمحوں کے لیے وہ کچھ نہیں بول سکا پھر اس نے کچھ جھکتے ہوئے وعلیکم السلام کہا تھا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ وہ کسی معمول کی طرح صوفہ پر بیٹھ گیا تھا۔

”کیسے ہو؟“ وہ اب حیران ہو رہا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟“ اس نے جواباً پوچھا تھا۔

”بہت اچھی ہوں۔“

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا، سیاہ کاشن کے لباس میں ملبوس وہ سیاہ ہی رنگ کی چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ وہ بہت دیر تک اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکا تھا۔ اس کا چہرہ خلاف معمول میک اپ سے عاری تھا اور کوئی بہت ہی خاص کیفیت لئے ہوئے تھا۔

”میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ جانتا ہوں۔ میں یہ بات کہنے کا حق نہیں رکھتا، مگر پھر بھی تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ اس سب کے لئے۔ جو میں نے کیا۔ میں نہیں جانتا، میں نے یہ سب کیسے کیا ہے؟ مگر میں۔“ اس نے وہی آواز میں کہنا شروع کیا تھا۔

”تمہاری جدائی نے مجھے جس چیز سے نوازا ہے۔ اس کے آگے میرے لئے سلمان انصاریا کسی کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ چھبیس سال کے بعد میں نے ایک سال اللہ کے ساتھ گزارا ہے اور اس پورے سال میں میرا دھیان کسی اور طرف گیا ہی نہیں۔ تمہاری طرف بھی نہیں۔ مجھے کوئی دکھ، کوئی افسوس نہیں ہے کہ ایک سال کے لئے تم نے مجھے جو کچھ دیا وہ چھبیس سال نہیں سے سکے۔ میں نے تو اس پورے سال تمہارے بارے میں سوچا ہی نہیں

ہے۔ تم کس کے ساتھ تھے۔ کیوں تھے اس سب کا خیال نہیں آیا پھر تم کیوں شرمندہ ہو؟“

وہ بہت دیر تک کچھ بول نہیں سکا تھا۔ صرف اس کا چہرہ دیکھتا رہا تھا۔

”میرے ساتھ چلو فلک! میں تمہیں لینے آیا ہوں۔“ فلک نے اسے دیکھا تھا۔

”کیا میرے لئے اس شخص کی اہمیت اس کمرے میں لٹکے ہوئے پردوں، کارپٹ، صوفہ بڈ، فرنیچر جیسی نہیں ہوگئی۔ چیزیں ہیں تو ہیں نہ ہوں تو نہ سہی اور میں..... میں کسی زمانے میں اس شخص سے اتنا عشق کرتی تھی کہ اس کے علاوہ مجھے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا اور اب مجھے یہ شخص نظر نہیں آ رہا۔“

اس نے سوچا تھا اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی تھی۔

”میں چلوں گی لیکن تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں جس فلک سے تم نے چار سال پہلے شادی کی تھی۔ وہ مر چکی ہے۔ آج تم جسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو۔ وہ کوئی اور ہے۔

اس فلک کے لئے سب کچھ تم تھے۔ میرے لئے سب کچھ اللہ ہے۔ اس فلک کے پاس صرف ظاہر تھا۔ میرے پاس صرف باطن ہے۔ وہ تماشا دیکھنا بھی پسند کرتی تھی، بننا بھی۔ مجھے یہ

دونوں چیزیں پسند نہیں ہیں۔ وہ سوسائٹی میں زندگی گزارتی تھی۔ مجھے گھر کے اندر گزارنا ہے

اسے نہ عیب چھپانا آتا تھا نہ جسم میں دونوں کو چھپانا چاہتی ہوں تم اگر ان سب باتوں کے

باوجود مجھے ساتھ لے جانا چاہو تو ٹھیک ہے ورنہ واپس چلے جاؤ اپنی اور میری زندگی تباہ کرنے

کی کوشش نہ کرو۔“

وہ بار بار اپنی سارے مہرے آگے بڑھاتی گئی تھی۔

”مجھے تمہاری کسی بات پر اعتراض نہیں ہوگا۔ صرف تم میرے ساتھ چلو۔“

اس نے سلمان کو کہتے سنا تھا اور وہ کھڑی ہو گئی تھی۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد سلمان نے ایک انگلش کیسٹ لگا دی تھی۔ وہ بے حد خوش

تھا۔ فلک نے ایک نظر اسے دیکھا تھا۔ ایک انسان سے محبت ہو جائے تو پھر اس کے بعد

بندے کے دل میں کچھ اور نہیں آ سکتا اور اگر اللہ سے محبت ہو جائے تو پھر انسان کسی اور سے

محبت کرنے کے قابل رہتا ہے؟ وہ بھی کسی انسان سے؟ وجود سے؟ ذات کی چاہ کے بعد وجود

کی طلب ختم ہو جاتی ہے اور میرے ساتھ بیٹھا ہوا یہ شخص یہ بات کبھی نہیں جان سکتا کہ اب

میرے لئے اس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہو گیا ہے۔

میں نے ذات کو چاہا تھا۔ ذات کے بعد وجود کا کوئی رنگ آنکھوں کو بھاتا ہے نہ

دل کو قید کرتا ہے۔

اس شخص کو گمان ہے سب کچھ پھر پہلے کی طرح ہو جائے گا۔

اللہ کے آنے کے بعد یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پہلے میں اس کے ساتھ زندگی جیتی تھی۔ اب زندگی بسر کروں گی اور یہ شخص ساری عمر اس خوش فہمی میں رہے گا کہ پہلے کی طرح اب بھی میرے لئے یہی سب سے اہم ہے۔ مگر اسے کیا پتا، میں نے دروازے کو رستہ روکنے نہیں دیا کم از کم ایک عورت کا تو۔“

وہ گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

جدائی۔

بے بسی..... تنہائی۔

آنسو۔

کسی کی آس۔

خواہش

عشق لا حاصل

یہ سب کیا ہے؟

جنون کے راستے اور

بے نشاں منزل۔

مسلمان انصر اب گانے کی ٹیون کے ساتھ ساتھ سیٹی بجا رہا تھا۔ کھڑکی سے باہر سڑک کو دیکھتے ہوئے فلک کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگنے لگا تھا۔



کوئی لمحہ خواب نہیں ہوتا

”میں وہاں دوبارہ کبھی نہیں جاؤں گی کبھی نہیں۔“ اسے یاد آیا تھا۔ ڈیڑھ سال پہلے اس گھر سے جانے کے بعد اس نے خود سے وعدہ کیا تھا اور اب اس نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔ گاڑی گیٹ کے اندر داخل ہو گئی تھی۔

”تو تمہیں آخر کار یاد آ ہی گئی ہے ہماری۔ دو فون کیسے تھے اور تم پھر بھی تب آئی جب پاپا لینے گئے ہیں۔“

فری نے اسے دیکھتے ہی گلے لگا لیا تھا اور پھر شکوے شروع کر دیے تھے۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی۔ کندھے پر جموتے ہوئے سیاہ سلکی بال اب قدرے لمبے ہو گئے تھے۔

مومی دھیرے سے مسکرائی تھی۔ فری اب اس کی بہنوں اور امی سے ملنے لگی تھی مایوں کے کپڑوں میں وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اسے ساتھ لے کر وہ اوپر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ کمرہ اس کی دوستوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے مومی کا تعارف کروایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد شین بھی آ گئی تھی وہ بھی اس سے گلے ملی تھی۔ فری کی دوستیں ڈھولک بجانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ گھر میں مہمانوں کی چہل پھل بڑھتی جا رہی تھی۔ شام سات بجے نیچے ہال میں آ گئے تھے۔ ڈھولک بجنی شروع ہو گئی تھی۔ وہ کافی دیر تک تالیاں بجاتی رہی پھر وہ تھک گئی تھی تو اٹھ کر باہر لان میں آ گئی۔ لان میں موجود لائٹس آن تھیں کچھ لوگ وہاں بھی موجود تھے مگر وہاں اندر جیسا شور نہیں تھا۔ اسے سکون محسوس ہوا تھا۔

ڈیڑھ سال پہلے جب اس نے یہاں ایک سال گزارا تھا تب بھی وہ اس طرح اکثر لان میں آ کر بیٹھا کرتی تھی خاموشی میں تنہائی میں، ہر چیز پہلے ہی کی طرح تھی۔ وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ لان میں موجود پھولوں اور پودوں کی تعداد میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا اور درخت پہلے سے کچھ بڑے ہو گئے تھے۔ ہاں اور ٹیلیں بھی تو زیادہ پھیل گئی ہیں اس نے عمارت کے

اور چڑھتی ہوئی بیلوں کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ پھر اس نے داہنی جانب والی عمارت پر نظر دوڑائی اور بہت دیر تک وہ اسے دیکھتی رہی تھی۔ ہاں یہ بھی ویسی ہی ہے جیسی ہمیشہ نظر آتی تھی۔ اس عمارت میں بھی لائٹس آن تھیں اور چہل پہل نظر آرہی تھی۔

”واقعی سب کچھ ویسا ہی تو ہے، بدلا کیا ہے اور میں کس چیز کو بدلا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔“ وہ ایک نسبتاً تاریک کونے میں آ کر بیٹھ گئی۔ یہاں سے جانے کے بعد پچھلے ڈیڑھ سال میں اس نے دن میں کئی بار اس جگہ کو یاد کیا تھا۔ اس جگہ کا ایک نقش بھی اس کے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔ وہ ابھی بھی آنکھیں بند کر کے بتا سکتی تھی کہ جس جگہ پر کون سی چیز موجود ہے۔

فری نے تین ہفتے پہلے فون کر کے اسے اپنی شادی کی تاریخ طے ہونے کی اطلاع دینے کے ساتھ آنے کی دعوت دی تھی۔ اس کے چند دنوں بعد اس نے ایک بار پھر فون کیا تھا۔ مگر وہ پھر بہانہ بنا کر نال گئی تھی مگر صبح تایا کے جانے کے بعد اس کے پاس کوئی بہانہ نہیں رہا تھا۔ وہ آنا نہیں چاہتی تھی مگر امی اور باقی بہنیں آنے کے لیے تیار ہو گئی تھیں اور پھر وہ کسی صورت گھر پر نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ لوگ تایا کے ساتھ ہی آ گئے تھے اور اب وہ یہاں بیٹھی ہوئی تھی اپنے اس عہد کے باوجود۔

رات دیر تک سب لوگ ڈھولک بجاتے رہے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ سارے مہمان رخصت ہو گئے وہ بھی اوپر آ کر سو گئی تھی۔ صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر نیچے آ گئی تھی۔ لاؤنج میں نیبلہ آئی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ انہیں دیکھ کر ٹھک گئی تھی۔ وہ امی اور تائی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں۔ وہ واپس اوپر بھاگ جانا چاہتی تھی۔ مگر انہوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔

”آؤ موی! کیسی ہو؟ میں ابھی تمہاری امی سے تمہارا ہی پوچھ رہی تھی۔“ ان کے لہجے میں وہی نرمی تھی۔

وہ ان کے پاس چلی آئی۔ انہوں نے اسے گلے لگا کر اس کا ماتھا چوما تھا۔ وہ ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھی جب فراز اندر آیا تھا۔

”ولید کا کیا بنا، اسے سیٹ مل گئی؟“ اس نے آتے ہی نیبلہ آئی سے پوچھا تھا۔

موی کا دل یک دم جیسے ٹھہر گیا۔ ”نہیں سیٹ کہاں ملی ہے کہہ رہا ہے اب پرسوں آؤں گا۔ صبح فون آیا تھا اچھی بھلی اس نے بنگلہ کروائی ہوئی تھی ایک ہفتے پہلے کی فلائٹ میں، مگر تمہارے ماموں نے کسی فلائٹ سے ملنے کے لیے کینیڈا بھجوا دیا ورنہ وہ کئی دن پہلے آ جاتا۔ اب میں تو دعا کر رہی ہوں کہ کم از کم پرسوں والی فلائٹ کو کچھ نہ ہو۔“ انہوں نے فراز

سے کہا تھا۔

”تو وہ یہاں نہیں ہے، اچھا ہے وہ نہ ہی آئے، اس کی فلائٹ من ہو جائے یا اس کی سیٹ کینسل ہو جائے۔ کاش میرا دوبارہ اس سے سامنا نہ ہو۔“ اس کے دل میں شدت سے خواہش ابھری تھی، وہ وہاں سے اٹھ گئی۔

وہ دو دن اس نے بڑے سکون سے گزارے۔ اس کا سامنا کرنے کا خوف اس کے دل سے ختم ہو گیا تھا۔ تیسرے دن صبح نو بجے وہ ناشتہ کرنے کے بعد کچن سے چائے کا کپ لے کر نکل رہی تھی۔ جب لاؤنج میں سے آنے والی ایک آواز نے اس کے قدموں کو روک دیا تھا۔ وہ کچن کے دروازے سے واپس کچن میں آ گئی تھی۔

”فلائٹ کچھ لیٹ ہو گئی تھی۔ اس لیے سات بجے یہاں پہنچا۔ ناشتہ کرنے کے بعد سویا نہیں، سیدھا یہیں آیا ہوں۔“

پورے ڈیڑھ سال بعد اس نے وہ آواز سنی تھی اور اس نے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ اب قدرے آہستہ آواز میں ٹھہر ٹھہر کر بات کر رہا تھا۔ پہلے کی طرح بلند اور تیز تیز نہیں بول رہا تھا۔ اس نے چائے کا گنگ ٹیبل پر رکھ دیا گنگ سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو اس نے ہاتھ سے محسوس کرنے کی کوشش کی تھی۔ لاؤنج میں سے آنے والی آوازیں اب کم ہو گئی تھیں شاید وہ اوپر گیا تھا۔ فری اور شین سے ملنے وہ کرسی کھینچ کر خاموشی سے بیٹھ گئی مہندی والی شام فری اور شین کی دوستوں اور کزنز کے ساتھ وہ بھی مہندی کی پلیٹ ہاتھ میں لیے نیبلہ آئی کے گھر داخل ہو رہی تھی۔ جب پورچ میں عثمان اور کچھ دوسرے لڑکوں کے ساتھ سفید شلوار قمیص میں ملبوس ولید کو اس نے دیکھا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے عثمان سے باتیں کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ ان لوگوں پر نظر دوڑا رہا تھا۔ اس نے ابھی اسے نہیں دیکھا تھا، وہ باقی لڑکیوں سے پیچھے تھی حواس باختگی کے عالم میں اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

”تم کچھ دیر کے لیے میری پلیٹ پکڑو، میں ابھی آتی ہوں۔“

اس نے اپنے ساتھ چلتی ہوئی ایک لڑکی سے کہا اور پھر واپس چلی گئی۔ واپس فری کے گھر آ کر وہ لان میں گئی اور دونوں گھروں کے درمیان باؤنڈری وال میں موجود چھوٹے سے لکڑی کے دروازے کا ہک اتار کر وہ نیبلہ آئی کے لان میں داخل ہو گئی۔ سامنے جانے کے بجائے وہ گھر کی عقبی سمت گئی اور پھر کچن کا عقبی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی تھی۔ کچن میں چند ملازم موجود تھے انہوں نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔ مگر کچھ کہا نہیں تھا۔ وہ وہاں سے نکل کر ہال کی طرف آ گئی تھی۔ ہال سے ڈھولک اور گانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس

نے ہال میں داخل ہونے سے پہلے دروازے میں رک کر ایک نظر اندر ڈالی تھی۔ ہال میں موجود لڑکوں میں وہ نہیں تھا۔ وہ اطمینان کی سانس لے کر اندر داخل ہو گئی۔ مبین نے اسے دیکھتے ہی اشارہ کیا تھا۔ وہ اس کے پاس چلی گئی۔ ”تم کہاں چلی گئی تھی۔ میں تمہیں ہی تلاش کر رہی تھی۔“

”مجھے ایک کام یاد آ گیا تھا میں گھر گئی تھی۔“ مبین نے کام کی نوعیت نہیں پوچھی تھی وہ بھی سب لڑکیوں کے ساتھ تالیاں بجانے لگی۔

”لڑکے کے بھائیوں کو بلاؤ۔ وہ کہاں فرار ہو گئے ہیں۔“ فری کی ایک دوست نے ایک گانا شروع کرنے سے پہلے کہا تھا۔ وہ تالیاں بجاتے بجاتے رُک گئی۔ وہ ایک بار پھر حواس باختہ ہو گئی تھی۔ پھر کوئی عثمان اور ولید کو اندر بلا لایا۔ ان کے اندر آتے ہی بیٹیوں اور نعروں سے ان کا استقبال ہوا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ لڑکیوں نے ایک بار پھر گیت گانے شروع کر دیے تھے۔ وہ باری باری لڑکے کے پورے خاندان کی مٹی پلید کر رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے تالیاں بجاتی رہی تھی۔ اس نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کہاں کھڑا تھا اور اس نے اسے دیکھا تھا یا نہیں آدھ گھنٹہ تک گانے گانے کے بعد کھانا کھانے کا اعلان ہوا۔ آہستہ آہستہ سب ہال سے نکلنے لگے تھے۔ پچھلے لان میں باری کیو کا انتظام تھا اور اب باہر سے اسٹیئر پور گاؤں کی آوازیں آنے لگیں۔

”موسیٰ! داصف بھائی کا کمرہ دیکھنے چلتے ہیں۔“ عثمان کہہ رہا تھا۔ کچھ فلورل اریجنجمنٹس کردوائی ہیں۔ دیکھتے ہیں کیسا ہے کمرہ۔“ مبین نے اچانک اس کے کان میں کہا تھا اس نے سر ہلا دیا۔

”سارہ! تم بھی چلو گی؟“ اس نے اپنی خالہ کی بیٹی سے پوچھا تھا۔

”ہاں کیوں نہیں“

”تو بس ٹھیک ہے، چلو خاموشی سے چلتے ہیں۔ پتا چل گیا تو سب پہنچ جائیں گے وہاں۔“ مبین نے اٹھتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ وہ ان کے ساتھ چل پڑی، بیڑھیاں چڑھتے ہوئے مبین کو یاد آیا۔

”کمرہ تو لاکڈ ہوگا۔ موسیٰ تم ٹھہرو، میں اور سارہ داصف بھائی سے چابی لے کر آتے ہیں۔“ مبین سارہ کو لے کر واپس اتر گئی۔ وہ اوپر چڑھنے لگی۔ داصف کے کمرے کے دروازے تک پہنچنے کے بعد اس نے غیر محسوس طور پر تاب گھمائی۔ دروازہ لاکڈ نہیں تھا۔

”مبین فضول میں ہی نیچے گئی۔“ اس نے سوچا۔ پھر وہ کمرے میں داخل ہو گئی اسے

حیرانی کا جھٹکا لگا تھا۔ کمرہ ویل ڈیکورڈ تھا۔ مگر وہاں کوئی فلورل اریجنجمنٹ نہیں تھی۔ اس نے کندھے جھٹکے تھے۔ وہ کسی طور پر بھی شادی والا کمرہ نہیں لگ رہا تھا۔ وہ مبین کا انتظار کرنے لگی۔ پھر وہ اسٹڈی کے دروازے تک آئی تھی اور اس نے اسٹڈی کا دروازہ کھول دیا۔ سب کچھ بالکل پہلے ہی کی طرح تھا۔ کتابیں اسٹڈی ٹیبل اور اس پر موجود کمپیوٹر مگر اب وہاں پڑی ہوئی چیزوں میں پہلے جیسی بے ترتیبی نہیں تھی۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر دروازہ بند کر دیا۔ مبین ابھی تک نہیں آئی تھی اسے کچھ بے چینی ہونے لگی تھی۔

تب ہی اچانک کوئی دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ وہ ساکت ہو گئی۔ وہ ولید تھا اس کے پیچھے اس کا کوئی دوست تھا۔ اس نے اپنے پورے وجود میں ایک سنسنی سی محسوس کی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر اس پر نظر س جمائے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے ہوا تھا۔

”یہ داصف کا کمرہ نہیں ہے۔“ بہت سرد آواز میں اس سے کہا گیا تھا وہ سن ہو گئی تھی۔

”یہ داصف بھائی کا کمرہ ہے۔“ اس نے اپنی بات پہ زور دینے کی کوشش کی تھی۔

”نہیں یہ داصف کا نہیں میرا کمرہ ہے۔“ اس بار اسے اپنے بیروں تلے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی تھی۔

”مگر یہ اسٹڈی تو۔“ اس نے بے یقینی سے ہاتھ سے اسٹڈی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”یہ میری اسٹڈی ہے۔ داصف کا کمرہ اگلے کمرے کے ساتھ ہے۔“ اس نے ایک نظر اسٹڈی کے دروازے پر ڈالی اور پھر سر جھکا کر غیر متوازن قدموں سے کمرے سے نکل گئی تھی۔ ولید نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ چند لمحے باہر دروازے کو دیکھتی رہی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ گئی تھی۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا مبین اور سارہ اندر کھڑی تھیں۔

”تم کہاں تھیں؟ کب سے انتظار کر رہے ہیں تمہارا۔ ذرا دیکھو اچھا ڈیکوریٹ کیا گیا ہے۔“

اس نے موسیٰ پر نظر پڑتے ہی کہا تھا۔ وہ کہیں اور پہنچی ہوئی تھی اسے یاد تھا، وہ ہمیشہ اسی اسٹڈی میں جایا کرتی تھی جہاں وہ کچھ دیر پہلے گئی۔ مگر داصف کا کمرہ اور اسٹڈی یہ تھے وہ کمرے میں کچھ بھی نہیں دیکھ پارہی تھی۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ مبین اور سارہ کمرے میں چل پھر رہی تھیں۔

”چلو اب نیچے چلتے ہیں۔“ مبین نے کچھ دیر بعد کہا۔

”ابھی کھانا بھی کھانا ہے اور تم ایک بات یاد رکھو خبردار تم لوگوں نے اب کوئی گانا ولید کے خلاف گایا یا کسی میں اس کا ذکر کیا۔ میں نے پہلے برداشت کر لیا اب نہیں کروں گی۔“

”دو آدمیوں کے لیے ناشتہ؟ کیا فراز بھائی دو آدمیوں کا ناشتہ کر کے بیچ کھیلنے جائیں گے؟“
ناشتہ بناتے ہوئے اس کا ذہن اسی سوال میں اٹکا رہا۔ مگر کمرے سے آتی ہوئی آواز سن کر اس کی یہ حیرانی دور ہو گئی تھی۔

”تو فراز بھائی کے کوئی دوست آئے ہیں۔“ اس نے سوچا۔ ”پتا نہیں مجھے اندران کے سامنے جانا چاہیے یا نہیں مگر فراز بھائی نے کہا تھا کہ میں کمرے میں آ جاؤں۔“ اسے یاد آیا۔

اسے یہاں آئے دو دن ہوئے تھے اور وہ تایا کے گھر کا ماحول دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ ان کے مقابلے میں تایا کا گھر اتنا بہت آزاد خیال تھا۔ دو دن سے وہ کئی لوگوں کو یہاں آتے جاتے دیکھ رہی تھی اور ہر ایک اسی طرح یہاں آتا تھا جیسے وہ بہت عرصے سے وہاں آ رہا ہو۔ اسے کچھ الجھن ہو رہی تھی مگر وہ جانتی تھی اسے اب وہیں رہنا تھا اور الجھن..... وہ سب کچھ ذہن سے جھٹک دینا چاہتی تھی۔ وہ کمرے سے باہر آنے کے بعد دوبارہ لاؤنج میں آ گئی۔

”مجھے صبح سے کسی نے کھانے کے لیے کچھ نہیں دیا۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔“
ایک آواز اس کے کانوں میں دوبارہ لہرائی اس کا دل یک دم جیسے کسی نے ٹٹھی میں لے لیا تھا۔

”سو تیلے ہونے سے مر جانا زیادہ بہتر ہے۔“ کسی نے پھر کہا تھا اسے یاد آیا جب وہ اپنے نھیال سے پہلی بار اپنے گھر آئی تھی تو کئی دنوں تک وہ بھی اپنے اندر اتنی ہمت پیدا نہیں کر پائی تھی کہ اپنی امی سے کھانے کے لیے کچھ مانگ لے۔ وہ کھانے کے وقت بھی خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھی امی کے بلانے کا انتظار کرتی رہتی اور بعض دفعہ وہ انتظار ہی کرتی رہ جاتی۔ امی کو اسے بلانا یاد ہی نہیں رہتا تھا یا پھر شاید اور جب اسے کھانے کی نیل پر بلایا بھی جاتا تھا تو وہ وہاں بہت سہمی ہوئی بہت محتاط رہتی جو امی اس کی پلیٹ میں ڈال دیتیں، وہ اسی سے پیٹ بھر لیتی۔ دوبارہ کوئی چیز مانگنے کا حوصلہ اس میں نہیں ہوتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی جھجک ختم ہونے لگی تھی۔ وہ بھوک لگنے پر امی سے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ مانگ لیا کرتی تھی۔ امی کچھ کہے بغیر ایک خاموش نظر کے ساتھ اس کی ضرورت پوری کر دیا کرتی تھیں مومی کو وہ خاموش نظر کبھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ پھر جب بڑی ہوتی گئی تو کھانا پکانے اور سرور کرنے کی ذمہ داری خود بخود ہی اس کے کندھوں پر آ گئی۔ تب بھی وہ منتظر ہی رہتی تھی کہ کبھی امی اسے اپنے دوسرے بچوں کی طرح اصرار کر کے کھانا کھلائیں اس سے کہیں کہ وہ فلاں چیز بھی کھائے کیونکہ یہ اس کے لیے اچھا ہوگا مگر ایسا موقع کبھی نہیں آیا تھا۔ امی کے پاس اس کے لیے اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی تھی یا پھر شاید۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے کھانے کے بارے میں

لا پرواہ ہوتی گئی تھی۔ کیا کھانا، ہے، کس وقت کھانا ہے؟ اس کے بارے میں اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ یہ سوچنے کی ضرورت ہی کبھی نہیں پڑی اور آج جب ولید نے یہ سب کہا تھا تو اسے بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔ اسے اس سے بے پناہ ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

”فراز بھائی نے کہا تھا کہ وہ ارمخان ماموں کا بیٹا ہے تو کیا اس کی امی کی بھی ڈتھ ہو چکی ہے اور اگر امی کی ڈتھ نہیں ہوئی تو پھر وہ یہاں کیوں ہے اپنی امی کے پاس کیوں نہیں چلا جاتا۔ اس کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے یہاں اپنی سوتیلی امی کے پاس رہ رہا، وہ تو مرد ہے۔ وہ تو مجبور نہیں ہے پھر وہ گھر چھوڑ کر کہیں چلا کیوں نہیں جاتا۔ ایسے لوگوں کے ساتھ کیوں رہ رہا ہے؟“

اس کے ذہن میں بار بار سوال آرہے تھے اور ان سوالوں کے ساتھ ولید کے ابو اور امی کی ہولناک شکلیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے اچانک اس کی نظر وال کلاک پر پڑی اس وقت چہن چہن رہے تھے۔

”مجھے صبح سے کسی نے کچھ کھانے کے لیے نہیں دیا بہت بھوک لگی ہے مجھے۔“ اسے ایک بار پھر اس کی بات یاد آئی تھی۔

”صبح سے مگر وہ تو شاید یہاں ساڑھے پانچ بجے آ گیا تھا پھر صبح سے کسی نے۔“ وہ کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔ بہت دیر تک وہ وہیں لاؤنج میں بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔



شام کو وہ فری کے ساتھ لان میں بیٹھی ہوئی تھی جب وہ فراز بھائی کے ساتھ آیا تھا۔ فری کو لان میں دیکھ کر وہ سیدھا وہیں آئے تھے۔ ”یہاں تو عیش ہو رہے ہیں بھئی۔ چائے چل رہی ہے۔“ فراز نے پاس آتے ہی کہا تھا۔

”آپ بھی عیش کر لیں۔ میں دو کپ اور منگوا لیتی ہوں۔“ فری نے پودوں و پانی دیتے ہوئے ملازم کو بلایا تھا۔

”کیا بیٹا آپ کے بیچ کا؟ آج تو صبح ہی چلے گئے تھے۔“ ملازم کے جانے کے بعد فری نے پوچھا تھا۔

”کیا بننا تھا۔ بھئی پچھلی دفعہ وہ جیت گئے تھے، اس دفعہ ہم ہار گئے۔“ ولید نے پلیٹ سے بسکٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”اور پھر بھی تم لوگ ہر ہفتہ بیچ کھیلنے جاتے ہو۔“ فری نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔
”وہ بھئی ہم جیتنے تھوڑی جاتے ہیں۔ ہم تو کھیلنے کے لیے جاتے ہیں۔ انجوائے

منٹ کے لیے۔“ اس بار فراز نے کہا تھا۔

”ہاں دوسری ٹیم کی انجوائے منٹ کے لیے کیپ اٹ اپ۔“

فری نے کیونکس ایک دفعہ پھر سنبھال لی تھی۔ ملازم نے کپ لاکر ٹیبل پر رکھ دیئے۔ مومی نے اپنا کپ ٹیبل پر رکھ دیا اور ان دونوں کے لیے چائے بنانے کے لیے کپ اٹھایا تھا، جب فراز نے اسے روک دیا۔

”ڈونٹ بی سو فار مل مومی! یہاں یہ سب کچھ نہیں چلتا۔ تم اپنی چائے پوہم اپنے خود بنالیں گے۔“ اس نے کچھ جھینپ کر اپنا کپ اٹھالیا۔

”ہاں، ان لوگوں کو میز آتے ہیں نہ ہی اب یہ سیکھنے کے قابل رہے ہیں۔ اب تو جہاں ہیں جیسے ہیں کی بنیاد پر انہیں ٹریٹ کرنا چاہئے۔“ فری نے کیونکس ناخنوں پر لگاتے ہوئے کہا تھا۔

”اور تم ولید! تم ذرا اپنا حال دیکھو۔ بڑا شوق ہے تمہیں۔ پھنز کھیلنے اور کرکٹ بننے کا اور تمہیں اتنی سمجھ نہیں ہے کہ کٹ میں بیچ کھیلنے جایا کرو۔ ایسے ہی چلے جاتے ہو منہ اٹھا کر۔ حلیہ دیکھو ذرا اپنا لگتا ہے باہر کسی سڑک پر جھاڑو دے کر آئے ہو۔“ اب فری اسے ڈانٹ رہی تھی۔ مومی نے ایک نظر اس پر دوڑائی۔ اس کے کپڑے واقعی گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ بالوں پر بھی اچھی خاصی دھول نظر آ رہی تھی اور پسینے اور مٹی نے مل کر اس کے چہرے پر بھی ٹھیک ٹھاک میک اپ کر دیا تھا۔ فراز کا حلیہ اس سے بہت بہتر تھا۔ ولید پر فری کے تبصرے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی طرح پرسکون انداز میں چائے اور سکٹ کھاتا رہا۔

”جس دن میرا پرائز بانڈ نکلے گا، اس دن میں کٹ خرید لوں گا۔ بہر حال مشورہ

نوٹ کر لیا ہے۔“

”کٹ خریدنے کے لیے تمہیں کون سے خزانے کی ضرورت ہے۔ مہنگی نہیں تو سستی

سہی، چار پانچ ہزار کی تو بات ہے ویسے تو تم۔“

ولید نے ایک چیخ کے ساتھ اس کی بات کاٹی تھی۔

”چار پانچ ہزار اور یہ چار پانچ ہزار آئیں گے کہاں سے؟ تم جانتی ہو، میں ابھی ایک

ایک روپے کے لیے ترستا ہوں۔ میرے پاس چار پانچ ہزار ہوں تو میں کٹ کے بجائے ایک

اچھا سوٹ نہ لے لوں۔ دو چار سستی شرٹس نہ لے لوں۔ ایک عدد جینز یا ایک اچھا میجر برش نہ

لے لوں۔ کیسے منہ اٹھا کر کہہ دیا ہے تم نے کہ صرف چار پانچ ہزار کی تو بات ہے۔“ اس کی آواز

میں مومی کو خنقی محسوس ہوئی تھی مگر فری پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”معاف کرو بابا! میں بھول گئی تھی کہ دنیا میں ایک واحد غریب تم ہی تو رہ گئے ہو۔

جس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ بہر حال آئی ٹیرس پر کھڑی اشارے کر رہی ہیں۔ میرا خیال ہے۔ تمہیں بلار ہی ہیں۔ صبح سے غائب ہو اب ذرا جا کر وضاحتیں پیش کرو۔“

فری نے بات کرتے کرتے سامنے اشارہ کیا تھا۔ ولید نے فوراً پلٹ کر دیکھا پھر کھڑا ہو گیا مومی نے بھی مڑ کر دیکھا تھا۔ ولید کے گھر کے ٹیرس پر ایک عورت کھڑی تھی۔ ولید کو کھڑے ہوتے دیکھ کر وہ وہاں سے غائب ہو گئی تھی۔

”اب تو بھی اٹھ جا فراز اور میرے ساتھ چل کر اس رسوائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ جو مستقبل کے اشارے پیشین کو اپنی سوتیلی ماں کے ہاتھوں برداشت کرنی پڑے گی۔“ اس نے فراز کو کندھے سے کھینچا تھا۔ مومی نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

”شرم کرو ولید! تم بات کیسے کرتے ہو؟“ فری نے اسے گھورا تھا مگر اس پر اثر نہیں ہوا تھا۔

”کیوں سچ نہ کہوں کیا۔ کیا رسوا نہیں کرتیں مئی جوتے مارتی ہیں سو الگ۔ اب جاتے ہی لمبے چوڑے سوال ہوں گے۔ کہاں گئے تھے؟ کس سے پوچھ کر گئے تھے؟ اتنی دیر کہاں لگائی؟ واپس آنے کی کیا ضرورت تھی؟ انہی دو ستوں کے پاس کیوں نہیں رہ گیا جن کے پاس گیا تھا؟ اٹھ فراز! اب میرے ساتھ چل کر ذرا جھوٹ بھی بول، تیری ضد پر ہی صبح کھڑکی کے راستے نکل کر آیا تھا۔ اب تو ساتھ چل کر بتا کہ زندگی کے رہنما اصولوں پر کون سا سیمینار اینڈ کر کے آئے ہیں۔“

وہ فراز کو بازو سے کھینچتا ہوا لے گیا تھا۔ فری مسکرا رہی تھی۔ مومی انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

”ان کی امی سوتیلی ہیں؟“ اس نے کچھ دیر بعد فری سے پوچھا تھا۔ وہ ایک بار پھر کیونکس لگانے میں مصروف ہو چکی تھی۔

”ان کی؟ اچھا اس ولید کی۔ ہاں اس کی امی سوتیلی ہیں۔“ وہ مومی کے سوال پر کچھ چونکی تھی پھر اس نے کہا تھا۔

”ڈنہ تھ ہو گئی ہے ان کی امی کی؟“ اس نے آہستہ آواز میں پوچھا تھا۔ ”نہیں بھئی

ڈنہ تھ کہاں؟ اصل میں یہ ارمغان ماموں کی دوسری بیوی کا بیٹا ہے۔ اس کی امی کسی بنک میں

فیجر تھیں۔ ارمغان ماموں کا کافی آنا جانا تھا۔ وہاں سنا ہے وہ کافی خوبصورت تھیں۔ یہ ولید

بھی تو ان ہی کی طرح ہے۔ ماموں کو محبت ہو گئی تھی ان سے۔ پہلے سے شادی شدہ تھے انہوں

نے دوسری شادی چھپ کر کی، شروع میں تو نبیلہ آئی کو پتا ہی نہیں چلا پھر بعد میں جب پتا چلا تو انہوں نے بڑا ہنگامہ کیا مگر امغان ماموں نے دوسری بیوی کو طلاق دینے سے انکار کر دیا۔ نبیلہ آئی کے تب دو بیچے تھے۔ ظاہر ہے، وہ گھر چھوڑ کر تو نہیں جاسکتی تھیں۔ اس لئے بے چاری رو دھو کر چپ ہو گئیں۔ تین سال تک ماموں کی دوسری شادی چلتی رہی پھر پتہ نہیں کیا وجہ ہوئی۔ لیکن ان کی دوسری بیوی نے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ ماموں نے ان کا یہ مطالبہ پورا کر دیا۔ ولید شروع میں اپنی ماں کے پاس ہی تھا۔ ماموں نے اسے لینے کی کوشش نہیں کی پھر کچھ عرصہ کے بعد اس کی امی نے دوسری شادی کر لی اور ولید کو ماموں کے پاس بھیج دیا تب تین سال کا تھا یہ۔ تب سے اب تک یہیں ہے ماموں کے پاس۔“ فری آہستہ آہستہ اسے تفصیل بتاتی گئی۔

”اپنی امی کے پاس نہیں جاتے یہ؟“ اسے ولید سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

امی کے پاس کب سے جاسکتا ہے۔ وہ تو امریکہ میں ہیں۔ ان کے اپنے ہیں۔ پاکستان تو شاید وہ بہت کم ہی آتی، اور انہوں نے کبھی ولید سے رابطہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کریں بھی تو ولید تو مشکل ہے، ہی جائے گا اور وہ اگر جانے پر تیار ہو بھی جائے تو نبیلہ آئی تو اسے مار ہی دیں۔ وہ تو کبھی آئے۔“

”فری بی بی! آپ کا فون آیا ہے۔“ ملازم نے آ کر اسے اطلاع دی تھی۔

”میرا فون۔ اچھا بھیجی میں اندر جا رہی ہوں۔“ وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر کیونکس اٹھا کر اندر چلی گئی تھی۔ وہ گم صدمی دہیں بیٹھی رہی۔

”اور اس کی سوتیلی امی اسے بچھنے پر تیار کیسے ہوں گی؟ اس کی امی کی وجہ سے ان کی ازدواجی زندگی تباہ ہوتے ہوتے رہ گئی اور ولید کو وہ اس عورت کی نشانی سمجھتی ہوں گی جس نے ان کے شوہر پر ڈورے ڈالے اور ان کا گھر تباہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس میں ولید کا کیا قصور ہے۔ وہ تو بے گناہ ہے وہ تو پہلے سے ہی مظلوم ہے۔ کیا اس کا دل نہیں چاہتا ہوگا کہ وہ اپنی امی سے ملے۔ ان کے پاس رہے مگر اس کی امی اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھتیں۔ کیا اسے اس بات سے تکلیف نہیں ہوتی ہوگی اور اس کی سوتیلی امی یہ باتیں سمجھتی ہی نہیں۔ اسے تنگ کرنے سے کیا ہوگا لوگ ماں باپ کی سزا اولاد کو دینے کی کوشش کیوں کرتے ہیں اور ولید کے ابو، وہ کیوں ان کو ایسی باتوں سے نہیں روکتے۔ نبیلہ آئی کا نہ سہی مگر ان کا تو وہ سگا بیٹا ہے پھر ان کو اس کی پرواہ کیوں نہیں ہے۔“ وہ سوچنے لگی تھی۔

”اور مجھے لگتا تھا دنیا میں سب کچھ صرف میرے ساتھ ہی ہوا ہے باقی ساری دنیا تو

بہت خوش ہے۔“

اس کی امی بھی اس کی پیدائش کے ایک سال بعد ایک حادثے میں وفات پا گئیں تھیں۔ اس کے ابو نے امی کی وفات کے آٹھ ماہ بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ مومنہ کو نانی نے اپنے پاس ہی رکھا۔ وہ اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ابو نے بھی دوسری شادی کے بعد اسے لینے پر اصرار نہیں کیا۔ کیونکہ تب وہ بہت چھوٹی تھی اور ان کا خیال تھا کہ مومنہ نضیال میں ایڈجسٹ ہو چکی ہے۔ اس لئے وہ اسے ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ نانی کے پاس ہی رہی پھر نانی کی وفات ہو گئی۔ ایک دفعہ پھر ماموں کے ساتھ اس کے باپ کی میٹنگ ہوئی تھی اور آخر میں طے پایا تھا کہ وہ اپنے باپ کے پاس چلی جائے کیونکہ اسے مستقل طور پر رکھنے پر کوئی تیار نہیں تھا حالانکہ مومنہ کا خیال تھا کہ اس نے کبھی کسی کو تنگ نہیں کیا وہ ایک بہت بے ضرری مخلوق تھی۔ خاموش، فرمانبردار، تعاون کرنے والی۔ پھر بھی اس کے لئے نضیال میں جگہ نہیں بن پائی۔

”دیکھو، تمہاری امی بہت اچھی ہیں۔ بہت پیار کرنے والی ہیں۔ تم انہیں بالکل تنگ مت کرنا۔ ان کی ہر بات ماننا پھر وہ تم سے بھی بہت پیار کریں گی۔ تم سب سے بڑی ہو۔ اس لیے چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال رکھنا بھی تمہاری ذمہ داری ہے۔ تم تو بہت سمجھدار ہونا۔“ اسے ابھی تک یاد تھا پہلی بار نضیال سے اپنے گھر لے جاتے ہوئے ابو سارا راستہ اسے سمجھاتے رہے تھے کہ اسے گھر میں کس طرح رہنا ہے کس طرح بات کرنا ہے کس طرح چلنا ہے۔ دوسروں کے ساتھ کیسے پیش آنا ہے۔ وہ ان کی ہر بات پر سر ہلاتی گئی۔ اس کے لئے یہ سب کچھ مشکل نہیں تھا۔ اس کی تربیت تو نضیال میں نانی پہلے ہی اسے دے چکی تھیں۔ دس سال وہ نضیال میں اسی تابعداری اور خاموشی کے ساتھ رہی تھی جس کی تلقین اس کے ابو سے کر رہے تھے۔ گھر پہنچنے پر گاڑی سے اترنے کے بعد ابو نے اس کا ہاتھ اور بیک پکڑ لیا تھا اور پھر اندر لے گئے تھے۔ وہاں پہلی بار اس نے اپنی ماں سے ملاقات کی تھی۔

”یہ مومنہ ہے شمیمہ! امی کو سلام کرو مومی۔“ اس کے ابو نے ایک عورت سے اس کا تعارف کروایا تھا۔ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں سلام کیا تھا۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس عورت کے چہرے پر نمودار ہوئی۔ اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد اس نے مومنہ کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

”بلال! آپ کپڑے پہنچ کر لیں۔ میں چائے لاتی ہوں۔“

وہ عورت پھر فوراً اس کے ابو کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ اس کے ابو نے اس کا بیک

وہیں رکھ دیا اور پھر خود ایک دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ اس کی امی بھی ان کے پیچھے چلی گئی تھیں۔ مومنہ خاموشی سے اپنے بیگ کو پکڑ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی امی چند منٹ بعد دوبارہ نمودار ہوئی تھیں اور ایک نظر اس پر ڈالتے ہوئے ایک دوسرے کمرے میں غائب ہو گئی تھیں۔ مومنہ کو بعد میں پتا چلا کہ وہ چکن ہے۔ پندرہ منٹ بعد اس کے ابو دوبارہ آئے تھے۔

”آؤ تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں مومنہ۔“

انہوں نے ایک بار پھر بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ پھر وہ اسے ایک کمرے میں لائے تھے جہاں پہلے ہی دو بستر لگے ہوئے تھے۔

”یہاں تمہاری بہنیں رہتی ہیں۔ تم بھی یہیں رہو گی۔ ابھی تھوڑی دیر بعد تمہاری امی تمہارا بستر بھی یہاں لگا دیں گی۔“

انہوں نے اس کا بیگ ایک کونے میں رکھتے ہوئے کہا اس رات وہ سو نہیں پائی تھی۔ اسے ہمیشہ سے نانی کے ساتھ سونے کی عادت تھی۔ نانی کی وفات کے بعد وہ اپنے بڑے ماموں کی بیٹیوں کے پاس سوتی رہی تھی اور اب یہاں وہ خود کو بالکل اکیلا محسوس کر رہی تھی۔ اس کی دونوں بہنیں اس کے پاس نہیں آ رہی تھیں نہ ہی اس سے بات کرتی تھیں اور مومنہ کے لئے کسی سے خود بات کرنا تو ہمیشہ سے ہی مشکل تھا اور پھر یہ صرف اس رات پر منحصر نہیں تھا۔ اگلے بارہ سال بھی وہ اس گھر میں اسی طرح گم صم رہی تھی۔

وہ کبھی بھی اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھ سکی تھی۔ وہ بار بار اپنے نھیال جانا چاہتی تھی۔ مگر وہاں بھی چند دن رہنے کے بعد واپس آ جاتی اور پھر اگلے کئی ہفتے اپنے گرد و پیش سے بے خبر رہتی۔ اس نے ابو کو اپنے رویے سے کوئی شکایت نہیں ہونے دی تھی۔ وہ وہاں بالکل ویسے ہی رہتی تھی جیسے وہ چاہتے تھے۔ فرمائندہ دار، خاموش اور تعاون کرنے والی لیکن جو فاصلہ اس نے پہلے ہی دن اپنے اور امی کے درمیان محسوس کیا تھا، وہ کبھی کم نہیں ہوسکا تھا۔ امی بہت ریزرو رہتی تھیں اور اس کے سامنے تو اور بھی سنجیدہ اور الگ تھلگ نظر آنے کی کوشش کرتیں۔ ان کی یہ خاموشی درمیان دالی دیوار کو اور اونچا کرتی گئی تھی۔

”یار! دے دو کچھ روپے۔ تم جانتے نہیں، مجھے ان کی کتنی ضرورت ہے۔“ وہ اب

بہتر سے کہہ رہا تھا۔

”میں جانتا ہوں۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں، تمہیں کس لئے ضرورت ہے۔ اسی

لئے تو نہیں دے رہا۔“ بہتر ہنوز اسے نظر انداز کرنے میں مصروف تھا۔

”یار! میں واپس کر دوں گا۔“ اس نے اب دوسرا حربہ استعمال کیا تھا۔

”آج تک کبھی واپس کئے ہیں؟“

”نہیں مگر اس بار ضرور کروں گا تم دیکھ لینا اگر واپس نہ کئے تو آئندہ مت دینا۔“

وہ اب التجاؤں میں مصروف تھا۔

”میں دیکھ دیکھ کر تنگ آ چکا ہوں۔ اس لئے میرے پاس روپے نہیں ہیں۔ تم کوئی

اور در کھٹکناؤ۔“

مبشر پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ موی نے اسے دیکھا وہ بے حد مایوس نظر آ رہا تھا۔ وہ

کچھ دیر پہلے ہی وہاں آیا تھا اور آتے ہی وہ فراز سے کچھ روپے مانگنے لگا۔ مگر فراز نے صاف

انکار کر دیا تھا اور اب وہ باری باری سب سے مدد طلب کر رہا تھا مگر سب اسے نظر انداز کئے

ہوئے دی سی آر پریزیڈنٹ ٹو دیکھنے میں مصروف تھے۔

”دیکھ فراز! دے دے دو ہزار ہی کی تو بات ہے تو لے لینا۔ یار! دیکھ تجھے دوستی کا

بھی احساس نہیں۔“ وہ ایک بار پھر فراز سے مخاطب تھا۔

”دوستی کا احساس ہے اسی لئے تو نہیں دے رہا۔ تو نے سنا نہیں کہ دوستی میں روپے

پیسے کو نہیں آنا چاہئے اور ویسے بھی مہینے کے آخری دن ہیں۔ میں خود کھینچ تان کر گزارا کر رہا

ہوں۔ تمہیں کیسے دے دوں تم پر ویسے بھی میرا بہت سا قرض ڈو ہے اگر کہو تو یاد کرواؤں۔“

فراز نے اپنی جیب سے پاکٹ ڈائری نکال لی تھی۔

”رہنے دے اگر تو کچھ دے نہیں سکتا تو لینے کی بات بھی نہ کر۔“ اس نے ہاتھ کے

اشارے سے اسے روکا تھا۔

”لے کون رہا ہے میں تو اپنا واپس مانگ رہا ہوں۔“

”فری! تم ہی دے دو کچھ۔“ اس نے فراز کی بات مکمل طور پر سنی ان سنی کر دی

تھی۔ اب وہ فری سے مخاطب تھا۔

”دیکھو ولید! مجھ سے مانگتے ہوئے تمہیں ویسے ہی شرم آنی چاہیے۔ میں زیادہ سے

زیادہ تمہیں وہ ایک دے سکتی ہوں جو میں نے دوپہر کو بنایا تھا۔ اس کے علاوہ مجھ سے کچھ امید

مت رکھو۔ تمہیں زیادہ ضرورت ہے تو نبیلہ آئنی سے مانگو یا پھر ماموں سے کہو اب وہ ایسے بھی

نہیں ہیں کہ تمہاری ضرورت پوری نہ کریں۔“

فری ایڑی چیخ کر جھولتی ہوئی اس سے کہہ رہی تھی۔

”ممی سے کیسے مانگوں = وہ تو پاکٹ منی بڑی مشکل سے دیتی ہیں ان کا بس چلے تو

وہ اسے بھی بند کر دیں اور پاپا وہ بات ہی نہیں سنتے اور اگر سنیں گے تو جوتا پہلے اتاریں گے۔ مدد کا بعد میں سوچیں گے اگر مجھے گھر والوں سے مدد کی توقع ہوتی تو میں تم لوگوں کے آگے ہاتھ کیوں پھیلاتا۔“

وہ اب بالکل بے بس نظر آ رہا تھا۔

”تم اپنے اخراجات پر قابو کیوں نہیں پاتے۔ جتنی پاکٹ منی تمہیں ملتی ہے، وہ اچھی خاصی ہوتی ہے بلکہ چاہو تو بچا بھی سکتے ہوں۔“ مٹین نے بڑی سنجیدگی سے اس سے کہا تھا۔

”تمہیں کیا پتا کہ میں کس طرح اپنے اخراجات پورے کرتا ہوں۔ یونیورسٹی کے اخراجات ہوتے ہیں اور کئی قسم کی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ یہ سب میں پاکٹ منی سے ہی پوری کرتا ہوں۔“

”ہوں پاکٹ منی سے اور وہ جو تم جاب کرتے ہو، اس کے روپے کہاں جاتے ہیں؟“ اس بار مٹین کا لہجہ روکھا ہو گیا تھا۔

”وہ بھی اپنی تعلیم پر ہی خرچ کر رہا ہوں۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ فیس اور کتابوں پر کتنے روپے لگ جاتے ہیں۔ گھر بیٹھ کر باتیں کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔“

مومی اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی تھی۔ وہ اندر ابھی تک روپے مانگنے میں مصروف تھا۔ مگر آج جیسے سب نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اسے خالی ہاتھ ہی بھیجنا ہے۔ اس لیے کسی نے بھی سخاوت دکھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تھک ہار کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”یک تو کھاتے جاؤ ولید۔“ دروازے سے نکلنے ہوئے اس نے فری کو کہتے سنا تھا۔

”اے سے بھی اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروادو شاید اس پر بھی تمہیں پرافٹ ملنے لگے۔“ وہ خفگی سے کہتا ہوا باہر آ گیا تھا۔ اپنے پیچھے اس نے فری کا قبضہ سنا۔ وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ جب اس نے اپنے پیچھے ایک آواز سنی۔

”ایک منٹ ذرا راک جائیں۔“ وہ چونک کر پیچھے مڑا تھا۔

”میرے پاس کچھ روپے تھے فالٹو پڑے تھے۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے آپ کو ضرورت ہے آپ لے لیں۔“

مومی نے نروس ہو کر اپنا ہاتھ اس کے آگے پھیلا دیا تھا۔ وہ چند لمحے حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔

”تھینک یو۔ لیکن میں بہت جلد یہ رقم واپس کر دوں گا۔“ اس نے روپے جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”نہیں میں واپس لینے کے لیے نہیں دے رہی ہوں مجھے ان کی ضرورت نہیں تھی۔ آئندہ بھی نہیں ہوگی آپ انہیں رکھ سکتے ہیں۔“

وہ تیزی سے اندر چلی آئی اس کا دل جیسے بلیوں اچھل رہا تھا خوشی کا ایک عجیب سا احساس اس کے اندر بیدار ہو رہا تھا۔

”اس کی ضرورت پوری ہو جائے گی، اب اسے کسی دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلاتا نہیں پڑے گا۔ کسی سے کہنا بھی نہیں پڑے گا۔ پتا نہیں اسے کس چیز کے لیے روپے چاہیے تھے اور یہ سب لوگ کیوں انکار کر رہے تھے جب وہ جانتے بھی تھے کہ وہ اپنے گھر والوں سے یہ توقع نہیں رکھ سکتا کہ وہ اس کی مدد کریں گے پھر بھی وہ اس طرح کر رہے تھے۔“

وہ ایک بار پھر سوچ رہی تھی۔ لاؤنچ میں سب فلم دیکھنے اور اس پر تبصرہ کرنے میں مصروف تھے۔ وہ اندر آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی چوز نظروں سے اس نے سب کا جائزہ لیا کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔ ”اس کا مطلب ہے کسی کو شک نہیں ہوا۔“ اس نے سوچا بھی تھا۔



”مومی! میں پینٹنگز کی ایک نمائش دیکھنے جا رہی ہوں PC میں، چلو گی؟“ فرح نے چہرے پر ہلکے آن لگاتے ہوئے اس سے پوچھا۔ وہ جواب دینے کے بجائے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا بھئی، ایسا کیا پوچھ لیا میں نے؟“ فری نے مسکراتے ہوئے کہا تھا ایک لمحے کو اس کا ہاتھ رک گیا تھا۔

”میں پہلے کبھی نہیں گئی۔“ وہ کچھ جھینپ گئی تھی۔

”پہلے تو تم نے اور بھی بہت کچھ نہیں کیا ہوگا۔ اب کرو گی بس تم چل رہی ہو میرے ساتھ۔ اصل میں داصف نے مدعو کیا ہے مجھے۔ وہ بھی لٹچ کے بعد ادھر ہی آ رہا ہے۔“ اس نے مومی کو بتایا تھا۔

”میں کپڑے چنچ کر لوں؟“ چند منٹ سوچنے کے بعد اس نے فری سے پوچھا۔

”خدا کا خوف کیا کرو مومی! کیا ایسے کاموں کے لیے بھی اجازت لیتے ہیں بھئی ظاہر ہے۔ باہر چل رہے ہیں تو گھر کے کپڑوں میں تو نہیں جائیں گے۔ کپڑے بدل کر ہی جائیں گے اور اس کام کے لیے مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جاؤ جا کر کپڑے چنچ کر دو۔“

فری نے قدرے ناگواری سے کہا۔ وہ کچھ شرمندہ ہو کر اس کے کمرے سے نکل

آئی۔ دس منٹ بعد جب وہ واپس فری کے کمرے میں گئی تھی تو وہ بالکل تیار کھڑی تھی۔

”اتنی لائٹ لپ اسٹک۔ اسے صاف کرو اور یہ والی لپ اسٹک لگاؤ۔“

اس نے مومی کو دیکھتے ہی حکم جاری کیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی ہدایات پر عمل کرنے لگی۔

”لاؤ تھوڑا سا بلش آن بھی لگا دوں۔“

اس نے قریب آ کر اس کے چہرے پر اپنے ہاتھ چلانے شروع کر دیے تھے۔

”بس اب ٹھیک ہے چلو چلیں۔“

چند منٹوں بعد فری نے اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا وہ فری کے پیچھے چلتی ہوئی باہر آگئی۔

”سارا دن گھر میں بند مت رہا کرو کہیں چلی جایا کرو۔ کوئی مصروفیت ڈھونڈو اپنے لیے۔ میں تو سارا دن مصروف رہتی ہوں مگر ٹین تو ہوتی ہے۔ تم اس کے ساتھ جا سکتی ہو یا پھر فراز اور مبشر میں سے کسی سے کہا کرو، وہ تمہیں کہیں لے جایا کریں۔ کوئی لائبریری جوائن کر لو۔ کلب جایا کرو اور کچھ نہیں تو جم ہی چلی جایا کرو۔ تم ویسے بھی بہت کمزور ہو رہی ہو آج کل۔“

فری گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے مسلسل اسے ہدایات دے رہی تھی۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

”مگر میرا دل نہیں چاہتا۔“ ساری باتیں سننے کے بعد اس نے دھیمی آواز میں صرف ایک جملہ بولا تھا۔

”یہ دل کیا ہوتا ہے بھئی دنیا میں سارے کام دماغ کی مدد سے کرنے چاہئیں۔“

مومی نے اس کے چہرے پر نظر دوڑائی۔ وہ گاڑی میں بیٹھے والے میوزک پر ہونٹوں سے دسلنگ کر رہی تھی۔ مومی نے مزید کچھ نہیں کہا۔ کار پارک کرنے کے بعد دونوں نیچے اتر آئی تھیں۔ واصف انہیں ہال کے دروازے پر ہی مل گیا تھا۔

”اچھا مومی! میں اب آدھے گھنٹے بعد تم سے ملوں گی۔ تم یہیں ملنا۔“

اس نے ہال میں داخل ہوتے ہی مومی سے کہا تھا اور پلک جھپکتے ہی واصف کے ساتھ آگے چلی گئی۔ ہال میں بہت سے لوگ پھر رہے تھے ان میں فارنز کی تعداد زیادہ تھی۔

وہ خاموشی سے اسی جگہ کھڑی ہو گئی جہاں فری اسے چھوڑ کر گئی تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے ہال کی دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں پر نظر دوڑانے کی کوشش کی۔ دور سے گیلری کی دیواروں پر لٹکے ہوئے فریم ہی نظر آ رہے تھے یا پھر اپنے سامنے کھڑے لوگوں کی پشتیں۔

تصویریں نظر نہیں آ رہی تھیں اسے تصویروں سے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ اسے شاید کسی بھی چیز میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

گھر سے باہر آنا جانا اس کے لیے بہت مشکل کام تھا۔ وہ صرف کالج یا اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلا کرتی تھی اور وہاں سے واپس آ کر وہ دوبارہ کہیں بھی جانے کی خواہش مند نہیں ہوتی تھی۔ جب ابو شام کو باقی گھر والوں کے ساتھ اسے کبھی پارک یا کہیں اور سیر و تفریح کے لیے لے کر جاتے تو وہ وہاں جا کر بھی باقی بچوں کی طرح کھیلنے کی بجائے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی رہتی۔ جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی اس نے گھر والوں کے ساتھ باہر جانا چھوڑ دیا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا کہ اس کی موجودگی کی وجہ سے ماحول میں ایک عجیب سی ٹینشن رہتی تھی کوئی بھی ٹھیک طرح سے کچھ بھی انجوائے نہیں کر پاتا تھا نہ امی نہ ابو نہ دوسرے بہن بھائی۔ وہ جیسے ان کی فیملی میں مس فٹ تھی اور اس احساس نے آہستہ آہستہ اسے گھر میں بند کر دیا تھا اور اب فری چاہتی تھی کہ وہ ان کے ساتھ باہر آیا جایا کرے اور یہ بہت مشکل تھا اسے دنیا میں کس اپ ہونا ناممکن لگ رہا تھا۔ مگر تایا کے گھرانے میں بہت سی روایات عجیب تھیں۔ وہ لوگوں سے بہت ملتے جلتے تھے۔ فنکشنز میں جاتے تھے اپنے گھر بھی فنکشنز کرواتے تھے اور وہ آہستہ آہستہ اس ماحول میں ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر آج وہ پہلی بار اس طرح کسی ایسی جگہ پر آئی تھی جہاں بہت سے لوگ تھے۔

فری آدھے گھنٹہ کے بجائے ایک گھنٹہ کے بعد آئی تھی۔ مومی کو دیکھ کر وہ مسکرائی۔

”سوری بھئی مجھے کچھ دیر ہو گئی مگر ایسی جگہوں پر دیر ہو ہی جاتی ہے۔ خیر کیسی لگی تمہیں یہ نمائش؟“ اس نے مومی کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے کہا تھا۔

”ہا نہیں؟“

”کیا مطلب؟ تصویریں اچھی نہیں لگیں؟“

”میں نے تصویریں دیکھیں ہی نہیں۔ میں تو آپ کا انتظار کر رہی تھی وہاں کھڑے ہو کر۔“ فری نے ٹھٹھک کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

”کیا مطلب؟ تم ایک گھنٹہ وہیں کھڑی رہیں؟“

”ہاں“

”فری نے بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ I can't believe it (مجھے یقین

نہیں آ رہا) تم سے کس نے کہا تھا کہ تم یہیں کھڑی ایک گھنٹہ میرا انتظار کرتی رہو۔“

”فری کو اب غصہ آ رہا تھا۔ واصف بھی دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔“

”آپ نے کہا تھا کہ میں۔“

فری نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ”میں نے کہا تھا کہ میں آدھ گھنٹہ کے بعد تم سے یہیں ملوں گی تو اس کا مطلب تھا کہ آدھ گھنٹہ تک تم بھی ادھر ادھر پھر کر تصویریں دیکھ سکتی ہو۔“ وہ اب کچھ نہیں بولی۔

”کوئی بات نہیں ہو جاتا ہے ایسا، اب میں تو آفس جا رہا ہوں۔“

داصف نے معاملہ رفع دفع کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ فری کے ساتھ اس کی گاڑی کی طرف آگئی۔ فری نے کار میں بیٹھتے ہی ایک ہلکا سا تہتہ لگایا۔

”تم بھی عجیب چیز ہو مومی! اس طرح کیسے رہو گی لوگوں کے ساتھ؟“

وہ چپ رہی تھی۔ فری اسے ایک آکس کریم پارلر پر لے گئی تھی اور وہاں اس نے اپنے اور اس کے لیے آکس کریم منگوائی۔ آکس کریم کھانے کے دوران بھی فری اپنے ذہن سے گیلری والی بات نکال نہیں پائی۔ شام کو ولید آیا تھا اور اس کے آنے پر فری نے ایک بار پھر وہی قصہ دہرانا شروع کیا تھا۔

”اب دیکھو نا، یہ آج مومی نے کیا کیا۔ میں اسے اپنے ساتھ۔“

پورے دن میں پہلی بار مومی کا چہرہ خجالت سے سرخ ہوا اور پہلی بار اسے فری بری لگی تھی۔ ولید نے پورا قصہ سن کر ایک نظر اس پر ڈالی۔ سر جھکائے کرسی کے ہتھے کو انگلیوں کے ناخنوں سے رگڑتی ہوئی وہ خاموش بیٹھی تھی۔ وہ کچھ کہنے لگا تھا پھر کہتے کہتے رک گیا۔

”ویسے کیسی تھی نمائش؟ کون سے آرٹسٹ کی تصویریں تھیں؟“ اس نے یک دم موضوع بدل دیا۔

”نمائش تو اچھی ہی تھی این سی اے کے کچھ لوگوں کی پینٹنگز تھیں اور کچھ اور آرٹسٹ تھے۔ مگر کوئی بھی مشہور یا بڑا نام نہیں تھا۔ سارے ہی نئے لوگ تھے۔ بعض کی تو میرا خیال ہے، یہ پہلی ہی نمائش تھی۔“ وہ اسے تفصیلات بتانے میں مصروف ہو گئی تھی۔ مومی نے سکون کا سانس لیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر فری اور فراز سے گفتگو میں مصروف رہا تھا پھر خلاف معمول اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا بات ہے۔ آج اتنی جلدی کس بات کی ہے؟“ فراز نے اس سے پوچھا تھا۔

”نہیں کسی چیز کی جلدی نہیں ہے، بس گھر جانا ہے۔“ وہ اس وقت بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

”کیوں شام کا کوئی پروگرام طے کر رکھا ہے؟“

فری کا لہجہ معنی خیز تھا مومی نے چونک کر پہلے اسے اور پھر ولید کو دیکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

”نہیں، کوئی پروگرام نہیں ہے۔ بس گھر پر ہی تھوڑا کام ہے۔“

وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ مومی ابھی ہوئی نظروں سے فری کو دیکھتی رہی جو دوبارہ فراز سے باتوں میں مصروف ہو گئی تھی۔



اس دن کے بعد سے وہ کبھی کبھار فرح اور شین کے ساتھ باہر جانے لگی تھی۔ مارکیٹ، لائبریری، تھیٹر، کلب شین کی زندگی ان چار چیزوں کے گرد گھومتی تھی۔ وہ انگلش میں ماسٹرز کر رہی تھی اور یونیورسٹی سے واپس آنے کے بعد اس کا زیادہ تر وقت انہی جگہوں پر گزارتا تھا۔ زیادہ تر اس کی فرینڈز اس کے ساتھ ہوتی تھیں۔ مگر اب وہ مومی کو بھی ساتھ لے جایا کرتی تھی اور مومی کسی دو سال کے بچے کی طرح اس کی انگلی تھامے اس کے ساتھ ساتھ چلتی جاتی۔ لائبریری میں جانا اسے اچھا لگتا تھا کیونکہ وہاں کتابیں ہوتی تھیں اور کتابیں اسے ہمیشہ سے ہی اٹریکٹ کرتی رہی تھیں۔ مگر باقی تمام جگہوں پر وہ خود کو کسی پیراسائٹ کی طرح محسوس کرتی جو خود سے کچھ کرنے کے قابل نہیں ہوتا تھا۔

فرح سائیکالوجی میں ایم ایس سی کرنے کے بعد آج کل کسی این جی او کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ اس کا سارا دن وہیں گزرتا تھا۔ شام کو گھر آنے کے بعد بھی کمپیوٹر پر رپورٹس بناتی رہتی اور جس دن چھٹی ہوتی تھی اس دن بھی اس کی اپنی ہی سرگرمیاں ہوتی تھیں۔ فراز ہاؤس جاب کرنے میں مصروف تھا اور اس کے کوئی طے شدہ اوقات نہیں تھے۔ بعض دفعہ وہ پورا دن گھر پر رہتا اور بعض دفعہ پوری رات غائب رہتا۔ ہمشر LUMS سے ایم بی اے کرنے میں مصروف تھا اور وہ صرف شام گئے ہی گھر لوٹا کرتا تھا پھر وہ کہیں نہ کہیں چلا جایا کرتا تھا۔ تائی کا اپنا سوشل سرکل بہت وسیع تھا۔ انہوں نے بھی سوشل ورک کے لیے ایک این جی او جو ان کر رکھی تھی۔ وہ فری جتنی مصروف نہیں تھیں مگر پھر بھی وہ تقریباً سارا دن نہیں تو شام کو ضرور کہیں نہ کہیں چلی جایا کرتی تھیں اور تیا ہمیشہ دس بجے کے بعد ہی گھر آتے تھے۔ سارا دن پورا گھر نوکروں کے سر پر رہتا تھا اور مومی بے مقصد پورے گھر کے چکر لگاتی رہتی۔ اپنے گھر کے برعکس یہاں اس کے سر پر کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ ہر کام کے لیے ملازم موجود تھا۔ وہ کبھی کوئی کتاب پڑھتی رہتی یا پھر گھر میں آنے والے اخبارات اور میگزینز کا مطالعہ کرتی۔

اس دن بھی وہ صبح سب کے جانے کے بعد لان میں نکل آئی تھی۔ سردیوں کے اوائل کے دن تھے۔ لان میں ہلکی ہلکی خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ لان میں پھرتی رہی پھر وہاں چلتے پھرتے وہ ولید کے گھر کے لان کی طرف چلی گئی تھی۔ لکڑی کا چھوٹا

سادروازہ دوسری طرف سے بند تھا۔ اس نے دروازہ کے اوپر سے ہاتھ ڈال کر اسے کھول لیا۔ دوسری طرف بھی اتنا وسیع و عریض لان تھا جتنا اس کے تایا کا تھا۔ وہ پہلی بار اس طرف آئی تھی۔ لان میں کوئی نہیں تھا۔ گھر میں بھی خاموشی تھی۔ وہ جانتی تھی اس وقت وہ سب بھی اپنے اپنے آفس میں ہوں گے۔ ہاں بس ولید کی امی گھر پر ہوں گی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گھر کے عقب میں آگئی تھی اور وہاں اُس نے چند بڑے بڑے کچھ بنجرے اور خرگوش کا ڈربہ دیکھا تھا وہ پاس چلی گئی۔ سات فٹ اونچے ایک چوڑے سے بنجرے میں اس نے آسٹریلیئن طوطے دیکھے تھے۔ پاس بڑے ایک اور بنجرے میں کچھ تیتڑے اور اس کے پاس ڈربے میں کچھ خرگوش چاہل قدمی کر رہے تھے۔ وہ باری باری ہر بنجرے کا جائزہ لیتی رہی۔ پھر دوبارہ آسٹریلیئن طوطوں کے بنجرے کے پاس آگئی تھے کچھ طوطے بنجروں کے اندر لگے ہوئے تار پر جمول رہے تھے کچھ بنجرے کے اندر اڑ رہے تھے۔ اس نے انہیں گننے کی کوشش کی تھی، وہ تعداد میں نوتھے۔ اس کے لیے ان کی سرگرمیاں بہت دلچسپ تھیں۔ وہ وہیں کھڑی بنجرے کی جالی کے سوراخوں میں انگلیاں پھنسائے ماتھا جالی سے نکائے انہیں دیکھتی رہی وہ جب اڑتے ہوئے اس کے سامنے والی جالی کے پاس سے گزرتے تو ان کے پردوں کی ہوا وہ اپنے چہرے پر محسوس کرتی پھر پتا نہیں کیا ہوا تھا ایک طوطا اچانک اس کی انگلیوں پر چھٹا۔

مومی کے حلق سے چیخ نکلی تھی اس نے پھرتی سے اپنی انگلیوں کو جالی کے سوراخوں سے نکالنے کی کوشش کی۔ مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ طوطا اب اڑ کر واپس جا چکا تھا۔ اس نے خوف زدہ ہو کر اپنے ہاتھ کو دیکھا دائیں ہاتھ کی درمیان والی انگلی کے ناخن کے پاس سے کچھ گوشت غائب تھا۔ اس کی انگلی میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے انگلی کو دبا کر خون بند کرنے کی کوشش کی تھی اور تب ہی اس نے ایک آواز سنی تھی۔

”کیا ہوا مومی؟“ اس نے چونک کر دیکھا وہ کچھ دور برآمدے کے عقبی دروازے میں کھڑا تھا۔ اب وہ اور آگے آ گیا تھا۔ اس کے پیچھے مومی نے نبیلہ آنٹی کو نکلنے دیکھا تھا اب وہ اس کی طرف آ رہا تھا۔ مومی نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ وہ اب دوبارہ اپنی ایک اور حماقت کی وجہ سے موضوع گفتگو بننا نہیں چاہتی تھی۔

”کیا ہوا ہے؟“ وہ اب اس کے پاس آ گیا تھا۔ مومی نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”کچھ نہیں بس ایسے ہی۔“

”چیخی کیوں تھیں؟“

”وہ.....“ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ولید کی تیز نظریں فرش پر پڑے ہوئے خون کے قطروں کو دیکھ چکی تھیں۔

”یہ ہاتھ جو پیچھے کیا ہوا ہے، یہ دکھاؤ ذرا۔“ اس نے ایک گہرا سانس لے کر ہاتھ آگے کر دیا تھا ولید نے اس کا ہاتھ پکڑ کر انگلی کا معائنہ کیا تھا۔ پھر جیب میں رومال دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

”لاؤ تمہارے ہاتھ پر کچھ لگا دوں۔“ وہ رومال نہ ملنے پر اس کا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگا تھا۔

”نہیں میں ٹھیک ہوں۔ میں خود اس نے روکنے کی کوشش کی تھی۔“

”کوئی بات نہیں میں لگا دیتا ہوں۔“ اس کا لہجہ بالکل حتمی تھا۔ وہ بے بسی سے اس کے ساتھ چلتی رہی۔ نبیلہ آنٹی وہیں برآمدے میں کھڑی تھیں۔ اسے دیکھ کر انہوں نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا تھا۔

”کیا ہوا ہے مومنہ؟“

”کچھ نہیں مئی! انگلی پر زخم لگ گیا۔ شاید طوطے نے کاٹا ہے۔“ ولید نے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا تھا نبیلہ آنٹی نے ایک گہری سانس لی۔

”میں تو ذرا ہی گئی تھی کہ پتا نہیں کیا ہوا ہے“

وہ ان کی بات پر کچھ شرمندہ ہو گئی۔

”زیادہ کاٹ لیا ہے؟“ انہوں نے مومی کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

”ہاں مئی کچھ زیادہ ہی کاٹ لیا ہے، میں بینڈج کر دیتا ہوں۔ میرا ناشتہ ادھر لاؤنج میں ہی لے آئیں۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑے اندر سے آ گیا تھا۔ وہ کچن کا عقبی دروازہ تھا جو برآمدے میں کھلتا تھا۔ وہ اسے ساتھ لیے کچن سے گزر کر اندر لاؤنج میں آ گیا تھا۔

”بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ اسے وہاں بٹھا کر غائب ہو گیا تھا چند منٹوں کے بعد وہ فرسٹ ایڈ باکس کے ساتھ نمودار ہوا تھا وہ اتنی دیر بائیں ہاتھ سے انگلی کو دبا کر خون روکنے میں مصروف رہی۔ اس نے دو منٹ سے بھی کم وقت میں بڑے ماہرانہ طریقے سے اس کا ہاتھ صاف کر کے بینڈج کر دی تھی۔ ”یہ سامنے واٹش روم ہے وہاں جا کر ہاتھ دھو لو۔“

اس نے فرسٹ ایڈ باکس بند کرتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ وہ کسی معمول کی طرح واٹش روم میں چلی گئی۔ بڑی احتیاط سے اس نے اپنے خون آلود ہاتھ دھوئے، جب وہ واپس آئی تو وہ ایک بار پھر فرسٹ ایڈ باکس کے ساتھ غائب ہو چکا تھا اور نبیلہ آنٹی وہاں ناشتے کی ٹرے کے ساتھ موجود تھیں۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرائیں۔

”آ جاؤ ناشتہ کر لو۔“ انہوں نے اسے آفر کی تھی۔
”نہیں، میں ناشتہ کر چکی ہوں۔“

”تو پھر چائے پی لو..... آ جاؤ“ انہوں نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر چائے بنانا شروع کر دی تھی۔ وہ کچھ جھینپتے ہوئے ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔
انہوں نے چائے کا کپ اسے تھما دیا تھا۔ وہ چائے کا پہلا سپ لے رہی تھی جب وہ آ گیا تھا۔ سامنے صوفہ پر بیٹھ کر ناشتہ کی ٹرے ٹیبل پر اپنی طرف کھینچ کر اس نے ناشتہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

”ولید کو آج بخار تھا، اس لیے یونیورسٹی نہیں گیا۔ دیر سے اٹھا تھا۔“
مومی کو یاد آیا، اس کا ہاتھ بہت گرم تھا۔

”یہ ابھی کچن میں گیا تھا اور میں نے ناشتہ بنانا شروع کیا تھا کہ تمہاری چیخ کی آواز سنی۔ مجھے تو پتا نہیں تھا کہ چیخ کس کی ہے مگر ولید فوراً پہچان گیا۔ میں تو بڑی پریشان ہو گئی تھی کہ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ خیریت ہی رہی۔“
نبیلہ آئی آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔ انہوں نے ایک پلیٹ میں فروٹ کیک نہیں نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

”نہیں میں بس چائے پیوں گی۔“ اس نے انکار کیا تھا۔

”یہ کیک میں نے خود بنایا ہے، ولید کو بہت پسند ہے، تم کھا کر تو دیکھو۔“

نبیلہ آئی نے پلیٹ اس کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔ اس نے کچھ حیرانی سے ولید اور نبیلہ آئی کو دیکھا تھا پھر وہ کیک کھانے لگی۔ نبیلہ آئی سے چند دن پہلے بھی اس کی ملاقات ہو چکی تھی۔ جب وہ اس کی تائی کے ساتھ کسی فنکشن پر جانے کے لیے آئی تھیں۔ اسے تائی کی نسبت وہ بہت سادہ مزاج لگی تھیں۔ لیکن پھر..... چائے پینے کے بعد وہ نبیلہ آئی سے اجازت لے کر باہر نکل آئی تھی۔ اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ وہ لان میں سے گزر رہی تھی جب اس نے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنی تھی۔ وہ پیچھے مڑی تھی۔ ولید اس کی طرف آ رہا تھا۔

”میں نے تمہیں آواز دی تھی تم نے سنا نہیں۔“

اس نے اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر کہا تھا۔ قریب آ کر اس نے جیب سے اپنا والٹ نکالا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی پھر اس نے کچھ نوٹ اس کی جانب بڑھا دیے۔
”یہ تمہارا قرض ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا تا کہ جلد واپس کر دوں گا۔“

ایک عجیب سی مایوسی نے مومی کو اپنے حصار میں لے لیا۔
”مگر میں نے آپ سے کہا تھا کہ۔“
ولید نے اس کی بات کاٹ دی۔

”ہاں مجھے یاد ہے تم نے کیا کہا تھا۔ مگر کوئی بات نہیں۔ میں دوبارہ تم سے لوں گا۔ مجھے ضرورت پڑتی ہی رہتی ہے ایک بار واپس کروں گا تو پھر ہی دوبارہ مانگ سکوں گا۔ اب پکڑ لو انہیں۔“

اس نے اتنے حتی انداز میں کہا تھا کہ اس نے روپے پکڑ لیے۔

”ایک بار پھر سے شکریہ۔“ وہ مسکراتا ہوا کہہ کر اندر چلا گیا تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنے لان میں آ گئی۔

نبیلہ آئی اسے کہیں سے بھی سخت گیر سوتیلی ماں نہیں لگی تھیں اور ابھی کچھ دیر پہلے وہ جس طرح ولید کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔ اس سے بھی ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ ولید کو ناپسند کرتی ہیں اور خود ولید کا رویہ بھی بہت نارمل تھا مگر ویسے وہ کہتا ہے کہ۔“

اس کا ذہن ایک بار پھر سوچنے میں مصروف تھا۔

”مگر ہو سکتا ہے نبیلہ آئی دوسروں کے سامنے کچھ دکھاوا کرتی ہوں۔ ظاہر ہے وہ ہر ایک کے سامنے تو اس کے لیے اپنی ناپسندیدگی اور نفرت ظاہر نہیں کریں گی۔“ اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا تھا۔

”خود میری امی بھی تو یہی کرتی تھیں۔ دوسروں کے سامنے جتنا ہی تھیں کہ وہ مجھ میں اور اپنی بیٹیوں میں کوئی فرق نہیں کرتیں۔ انہیں میری بھی اتنی ہی پرواہ رہتی ہے جتنی اپنی بیٹیوں کی اور ہر ایک ان کی بات پر یقین کر لیتا تھا۔ کسی نے کبھی کوئی سواا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی نہ اس سے پوچھنے کی کوشش کی تھی اور اگر کبھی کوئی اس سے پوچھنے کی کوشش کرتا تو وہ کبھی بھی ولید کی طرح سچ نہیں بتا سکتی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ اس کی تھکن میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ انگلی میں اب بھی درد ہو رہا تھا۔



اسے وہاں آئے دوسرا مہینہ ہونے والا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اکیلی بھی گھر سے باہر جانے لگی تھی۔ گھر کے پاس موجود پارک میں۔ قریبی مارکیٹ میں۔ لائبریری میں کبھی وہ خود ہی پیدل وہاں چلی جاتی اور بعض دفعہ ڈرائیور اسے وہاں چھوڑ آتا تھا۔ اس کی زندگی کا کیوں آہستہ آہستہ وسیع ہونے لگا تھا۔ پہلے کی طرح اب اسے کہیں جانے کے نام پر گھبراہٹ نہیں ہوتی تھی۔

اس شام وہ سب ایک بار پھر اکٹھے تھے۔

”تم نے ایک چیز نوٹ کی ہے فراز؟“ فری نے ولید کو دیکھتے ہوئے کچھ عجیب سے

انداز میں کہا تھا۔

”کون سی چیز؟“

”یہ اس ماہ ولید کی تیسری نئی شرٹ ہے اور دیکھو جاگرز بھی نئے ہیں کیا بات ہے

ولید صاحب! کوئی خزانہ ہاتھ آ گیا ہے۔“

مومنہ نے ولید کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”بس میرے پاس کچھ روپے آگئے تھے۔ میں نے سوچا کہ چلو اور کچھ نہیں تو اس ماہ

کچھ شرٹس اور جاگرز ہی لے لیتا ہوں۔“

اس بار مومی نے بے اختیار اسے دیکھا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے کرسی پر جمبول رہا تھا۔

”بڑی حیرانی کی بات ہے ولید صاحب کہ آپ کو بھی یہ خیال آ گیا شرٹس اور جاگرز

ایک بار خریدو اور ہمیشہ استعمال کرو والے آئیٹم میں سے نہیں ہیں۔ اب باقی چیزیں بھی لے

ہی لیتا جن کی تمہیں کئی سالوں سے اشد ضرورت ہے۔“ اس بار فراز نے اسے مشورہ دیا تھا۔

”مثلاً؟“

”مثلاً چند عدد جرابوں کے جوڑے، کچھ رومال، اپنی ذاتی شیونگ کٹ، ایک اچھا

اور ذاتی بہر برش، چند ٹائیاں، کچھ بیلیٹس۔“ فراز نے ایک لمبی لسٹ گنوا دی تھی۔ ولید بڑی

سنجیدگی سے کرسی پر جمبولتا ہوا اسے دیکھتا رہا۔

”اس سے کیا ہوگا؟“

”اس سے یہ ہوگا عالی جاہ! کہ مجھے ہر دن بعد نئی شیونگ کریم اور ریزر نہیں

خریدنا پڑے گا اور ہر ماہ میرے کمرے سے کوئی ہمیر برش اور ٹائی چوری نہیں ہوگی اور میری

وارڈ روم میں میری حق حلال کی کمائی سے خریدی ہوئی کچھ اشیاء ضرور پائی جائیں گی۔“

فری نے فراز کی بات پر قہقہہ لگایا تھا۔ مومی نے ولید کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر،

خجالت کے کوئی آثار نہیں تھے۔

”میرے پاس اگر ان چیزوں کو خریدنے کے لیے فالتو روپے ہوں تو میں کبھی

تمہاری گھنٹیا اور تھمڑا کلاس چیزیں استعمال نہ کروں، لیکن مجبوری ہے، تم لوگ تو میرے حالات

جانتے ہی ہو، میں کتنی مشکل سے گزر بسر کرتا ہوں۔ یہ جاننے کے باوجود تم اس طرح میرا

مذاق اڑا رہے ہو، تمہیں شرم آنی چاہیے فراز۔“

اس نے فراز کو جھڑکا تھا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم کتنی مشکل سے گزر بسر کرتے ہو اور کہاں سے گزرتے ہو اور

کہاں بسر کرتے ہو، یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس لیے مجھے تمہاری اس ٹریجڈی پر کوئی

ترس نہیں آرہا۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ تمہارے یہ جذباتی مکالمات سن کر میں یا دوسرے پھوٹ

پھوٹ کر روئیں گے اور تمہیں گلے لگا کر تسلی دیں گے تو اس کا بھی کوئی امکان نہیں ہے۔ اس

لیے تم اپنے حالات زندگی کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھو۔“ فراز نے بڑی بے رخی سے اس

سے کہا تھا۔

”چنگیز خان جب مرا ہوگا تو فراز طلیل پیدا ہوا ہوگا۔“ اس بار ولید نے اس سے کہا۔

”تعریف کا شکر یہ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ چنگیز خان میری پسندیدہ شخصیت ہے

ہسٹری میں۔“ فراز کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

”ویسے آج کل بائیک پر کیوں آ جا رہے ہو؟ گاڑی کو کیا ہوا؟“ فراز کی بات پر

مومنہ ایک بار پھر چونکی تھی۔

”شکر کرو، بائیک پر آ جا رہا ہوں پیدل نہیں۔ یہ سب ممی کی کرامات ہیں۔ انہوں

نے گاڑی کی چابی واپس لے لی۔ میں نے بھی مانگنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کھٹار کا احسان

میں اور اپنے کندھے پر کیوں لوں۔ اچھا ہے رکھ لیں اپنے پاس۔ میرے پاس تو پہلے بھی

پٹرول کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ مجھے سفید ہاتھی پال کر کیا کرنا تھا۔“ اس نے کرسی پر

جھولتے ہوئے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں پٹیرول کے لیے تمہارے پاس روپے نہیں ہوتے، ہونٹنگ کے لیے ہوتے

ہیں۔ لڑکیوں کو تحفے تحائف دینے کے لیے ہوتے ہیں اچھا ہے۔ آٹنی نے گاڑی لے لی

ہے۔ تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ تمہیں گاڑی تو کیا بائیک بھی دی جائے۔“

شہین نے کافی اکھڑے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ مومی سن ہو گئی تھی۔ ولید نے کرسی

جھلانا بند کر دیا۔

”بس یہی خرابی ہے تم لڑکیوں میں جب اور کچھ کہہ نہیں سکتیں تو فوراً الزام لگانے پر

آ جاتی ہو۔ شک کرتی ہو۔ اگلا لاکھ صفائیاں دے مگر تم تو کبھی ماننے پر تیار ہی نہیں ہوتیں۔ تمہاری

بات تو جیسے پتھر پر لیکر ہوتی ہے۔ میرے جیسے بندے کے پاس لڑکیوں کے لیے وقت کہاں ہوتا

ہے اور لڑکیاں وہ بھی تو بندہ دیکھتی ہیں۔ مجھ میں ایسا ہے کیا کوئی مجھ سے دوستی کرے گی۔“

مومی کو اس پر ترس آیا۔

”تم جیسا بندہ اور بے چارا۔ اچھی طرح جانتی ہوں میں۔ ابھی کل شام کو بھی نیلہ آئی تھی تمہارے کارنامے سنا رہی تھیں ماما کو۔“

”ممی کی بات مت کرو۔ انہیں تو مجھے بدنام کرنے کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں ہے۔ ہر ایک کے پاس جا کر میرے ہی قصے سناتی رہتی ہیں، کبھی واصف اور عثمان کا ذکر سنا ہے تم نے۔“

”ان دونوں کا تو تم نام نہ لو ان کا ذکر وہ کیوں کریں وہ تمہارے جیسے کام نہیں کرتے۔“ اس بار فرح نے بگڑ کر کہا تھا۔

”دیکھا تمہارے میاں کا نام لیا تو کس طرح کرنٹ لگا ہے تمہیں۔ کتنا اندھا اعتماد ہے تمہیں واصف پر۔“

اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں ہے کیونکہ مجھے اس کا اچھی طرح پتا ہے اور اس بار اس سے ملوں گی تو تمہاری پوری گفتگو سناؤں گی۔“ فری نے اسے دھمکایا تھا۔

”تم تو ہمارے گھر آنے سے پہلے ہی مجھے وہاں سے نکلوا دینا چاہتی ہو۔“

”تم اپنی حرکات ٹھیک کر لو تو ایسی نوبت نہیں آئے گی ورنہ وہی ہوگا جو تم کہہ رہے ہو۔“

فری اسے مسلسل دھمک رہی تھی۔ مومی کا دل اچاٹ ہوتا گیا وہ اٹھ کر باہر لان میں آ گئی تھی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اس کے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا۔ جب امی نے بڑے ہوتے ہی معمولی باتوں پر روک ٹوک شروع کر دی تھی۔ چھت پر مت جاؤ، دروازے پر کیوں گئی تھی۔ کالج سے اتنی دیر کیوں ہوئی؟ یہ رسالہ کیوں پڑھ رہی ہو؟ شروع میں وہ بہت حیران ہوتی تھی اس کے لیے ان سوالوں کی نوعیت نئی تھی اگر چھت پر جاؤں گی تو کیا ہوگا۔ ان کا گھر جس کالونی میں تھا وہاں گھر کافی فاصلے پر تھے اور اکثر اوقات ویرانی ہی رہتی تھی۔ چھتوں پر کوئی تب ہی چڑھتا تھا جب کوئی کام ہوتا ورنہ لوگ زیادہ تر اپنے گھروں میں ہی مقید رہتے تھے۔ وہ سریدوں میں کبھی کبھار دوپہر کے وقت چھت پر چلی جایا کرتی تھی اور اس چیز نے امی کو بہت ناراض کر دیا تھا۔

ایک بار ڈانٹ کھانے کے بعد اس نے کبھی چھت کا رخ نہیں کیا۔ وہ امی سے خوفزدہ ہو گئی۔ وہ ہر روز کالج سے آنے کے بعد بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھا کرتی تھی۔ یوں جیسے کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ نظریں پچھاننے لگی تھی۔ اس لیے گھبرا جاتی تھی اور اس گھبراہٹ نے امی کے دل میں شکوک کو اور تقویت دی تھی۔ ان کے سارے اعتراضات صرف اسی کے لیے ہوتے تھے۔ اس کی باقی چار بہنوں کے لیے نہیں۔ وہ چھت پر

بھی جایا کرتی تھیں۔ کالج سے واپسی پر اکثر اوقات دوستوں کے گھر بھی چلی جایا کرتی تھیں۔ اپنی مرضی کے میگزینز بھی پڑھا کرتی تھیں۔ ان پر اس طرح کی کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی تھی شاید امی مجھ پر اعتبار نہیں کرتیں۔ وہ ہر بار سوچ کر بچھ جاتی تھی۔

اسے یاد تھا، وہ اپنے ماموں کے بیٹے کی شادی پر گئی ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے اس کی امی اور ابو کو بھی بلوایا ہوا تھا۔ خلاف توقع اس کی امی وہاں جانے پر تیار ہو گئی تھیں۔ اسے حیرانی ہوئی تھی کیونکہ امی آج تک کبھی اس کے نضیال نہیں گئی تھیں، مگر وہ خوش تھی۔ وہاں جا کر بھی اس کی خوشی کم نہیں ہوئی تھی۔ ماموں نے شادی پر اس کے لیے بھی کپڑے سلوائے ہوئے تھے اور وہ تینوں دن وہی کپڑے پہنتی رہی تھی اس کے نضیال میں جو آئٹم فیملی سسٹم تھا۔ سب کزنز آپس میں بہت بے تکلف تھے۔ وہ شادی کی تقریبات کے دوران اس سے بھی چھیڑ چھاڑ کرتے رہے ولیمہ کی تقریب سے واپس آنے کے بعد اس کی امی بہت خاموش تھیں۔ وہ ان کا خراب موڈ محسوس کر رہی تھی۔ لیکن اسے اس کی وجہ معلوم نہیں تھی۔ اگلے ہفتے ماموں نے اسے بلایا تھا وہ ایک چھوٹی سی دعوت کر رہے تھے۔ اس نے فوراً ہامی بھری۔

”آئندہ تم کبھی اپنے نضیال نہیں جاؤ گی۔ تمہاری امی کو وہ لوگ پسند نہیں آئے۔ بہت چھچھورے لوگ ہیں اور تم اب چھوٹی نہیں ہو، بڑی ہو گئی ہو۔ تمہاری امی نہیں چاہتیں کہ تم وہاں جا کر خراب ہو۔“

اجازت مانگنے پر اس کے ابو نے بڑے واضح لفظوں میں اسے بتا دیا تھا۔ وہ بے یقینی کے عالم میں انہیں دیکھتی رہی۔ اسے لگا تھا کسی نے اس کا گلا دباننا شروع کر دیا تھا اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ ماموں کے دوبارہ فون کرنے پر ابو نے ان سے بھی یہی کہا تھا۔ انہوں نے دوبارہ فون نہیں کیا۔

اس کے بی اے کرنے کے بعد ابو نے اسے آگے پڑھنے سے روک دیا تھا۔ وہ اس کی شادی کر دینا چاہتے تھے۔ اس نے آگے پڑھنے پر اصرار نہیں کیا۔

ان ہی دنوں اس کے ابو اپنے کسی دوست کے بیٹے کا رشتہ اس کے لیے لائے تھے۔ لڑکا انجینئر تھا اور فیملی بہت اچھی تھی۔ وہ لوگ اسے پسند کرنے کے بعد انگوٹھی پہنا گئے تھے۔ اس کے بعد گھر میں عجیب قسم کی ٹینشن پیدا ہو گئی۔ امی نے اس سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہ معمولی معمولی باتوں پر ابو سے جھگڑنے لگتیں۔ مومنہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا وہ ہفتے کے بعد ابو کچھ شرمندہ شرمندہ اس کے پاس آئے تھے۔

”اب ان کا ارادہ بدل گیا ہے، وہ تمہاری بجائے روہینہ کا رشتہ مانگ رہے ہیں۔“

رشتہ بہت اچھا ہے اور تمہیں پتا ہے تمہاری چار بہنیں اور ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ روہینہ کی شادی وہاں کر دیں۔“ اس کے ابو نے اسے بتایا تھا۔ اس نے خاموشی سے انگوٹھی اتار کر انہیں تھمادی۔

”اگر صرف اتنی سی بات سے گھر کا سکون بحال ہو سکتا ہے تو ٹھیک ہے۔“

اس نے سوچا تھا۔ دو ماہ کے بعد روہینہ کی شادی ہو گئی۔ شادی پر تاپا کی ٹیلی بھی آئی ہوئی تھی۔ ایک ہفتے کے بعد جب وہ واپس جانے لگے تو مومنہ کو پتہ چلا تھا کہ اسے بھی ان کے ساتھ جانا ہے کیونکہ امی چاہتی ہیں، وہ کچھ عرصہ ماحول کی تبدیلی کے لیے وہاں رہ آئے۔ وہ اپنا سامان پیک کرنے کے بعد بہت شرمندگی کے عالم میں ان کے ساتھ لاہور آ گئی تھی۔

تاپا اور تائی کی طرح باقی سب کا سلوک بھی اس کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ کسی نے اس سے کچھ بھی کریدنے، کچھ بھی پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے گھر میں بہت جگہ تھی اور اس کے آنے سے کسی کی زندگی اور معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہر ایک نے اس کے بے ضرور وجود کو قبول کر لیا تھا اور اب اسے یہاں آئے تین ماہ ہونے والے تھے اور ہر چیز آج بھی جیسے نئی لگ رہی تھی۔ ہر ماہ اسے اپنے ابو کی طرف سے چند ہزار روپے مل جاتے تھے۔ کچھ روپے اسے تاپا بھی دے دیتے تھے اور وہ آج کل اپنے بے مصرف وجود کو کسی کام میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بہت دیر تک وہ لان میں بیٹھی اپنے ماضی کے بارے میں سوچتی رہی پھر عشاء کی اذان ہونے پر اندر آ گئی۔



”تم نے کبھی اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے ولید! کہ تم Physically کتنے ان فنٹ ہو سٹینا تمہارا اچھا نہیں ہے۔ باڈی تم Stretch نہیں کر سکتے۔ اچھا جپ تم نہیں لگا سکتے اور دعوے تم بڑے بڑے کرتے ہو۔“

اس سہ پہر فراز اس کے ساتھ بیڈنٹن کھیلتے ہوئے مسلسل بول رہا تھا۔ مومی نے ولید کا جائزہ لیا۔ واقعی اس کی حالت خاصی خراب تھی۔ اس کی شرٹ سینے سے پھینکی ہوئی تھی اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا لیکن ریکٹ چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔

”ابھی بھی ہار مان جا میرے یار! ابھی بھی وقت ہے، واک اور دے دو مجھے مبشر کے ساتھ گیم کرنے دو۔“

”ایسے ہی کرنے دوں میں کوئی فوٹ تو نہیں ہوا۔ جب تک زندہ ہوں میدان نہیں

چھوڑوں گا۔“

وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔

”کتنے جنازے اٹھائے گا اپنی کورٹ سے شٹل کاک کے، شرم کر ولید! چھوڑ دے ریکٹ۔ میں ہوں نا تیرا دوست تیرا ساتھی حساب بے باق کرنے کے لیے۔ دیکھ میں ابھی اسے کیسے لوہے کے پنے چبواتا ہوں۔“ مبشر اسے پھسلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے گیم پوری کر کے ہی چھوڑی۔

”چلو اب ڈبلز کا میچ کھیلتے ہیں۔“

فری اور شین بھی اٹھ گئی تھیں۔ ولید ہانپتا ہوا مومی کے پاس چیئر پر آن بیٹھا۔ تو لیے سے پسینہ خشک کرتے ہوئے اس نے مومی سے پوچھا تھا۔

”تم سارا دن کیا کرتی رہتی ہو؟“

”میں؟“ وہ اس کے سوال پر کچھ گڑبڑا گئی تھی۔

”میں..... میں کچھ بھی نہیں۔“

دیری گڈ میری Follower ہو۔“ مومی کی رنگت سرخ ہو گئی۔

”کچھ پڑھائی لکھائی کی تھی یا؟“ ولید کا لہجہ معنی خیر تھا۔

”بی اے کیا ہے۔“ اس نے بے اختیار کہا۔

”وہ تو سب ہی کرتے ہیں۔ اس میں خاص بات کیا ہے اس سے آگے کچھ پڑھا

ہے؟“ اس نے سر جھکا لیا۔

”ہاں بھی، آج کل کی لڑکیوں کا پڑھائی میں دل کہاں لگتا ہے۔ بس رو دھو کر تھرڈ

ڈویژن میں ایک ڈگری لے لیتی ہیں اور سمجھتی ہیں کمال کر دیا۔ پھر گھر بیٹھ جاتی ہیں کسی اجتنق

کے انتظار میں۔“ اس نے حیرانی سے ولید کو دیکھا تھا۔ اس کا لہجہ آج بہت عجیب تھا۔

”تم مومی کے بارے میں غلط اندازے مت لگاؤ۔ اس نے بی اے میں کالج میں

ٹاپ کیا تھا، یہ تو بس۔ ارے ارے یہ فاؤل کر رہے ہو تم۔“

فری نے درمیان میں مداخلت کی تھی اور پھر بات کرتے کرتے وہ فراز کی طرف

متوجہ ہو گئی۔ مومی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ پتا نہیں وہ کیا کہنے والی تھی۔

”اچھا واقعی عجیب بات ہے۔“ ولید نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”تو پھر پڑھنا چھوڑ کیوں دیا۔ آگے بھی پڑھو کچھ نہ کچھ کرو۔ آج کل کے دور میں

بہت ضروری ہوتا ہے۔“

وہ اسے پتا نہیں کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ غائب دماغی کے عالم میں اس

کی باتیں سنتی رہی۔

”آؤ موی! اب تم کھیلو۔“ مبین اسی وقت ریکٹ لے کر اس کے پاس آگئی تھی۔ شاید وہ کبھی بھی کھیلنے پر تیار نہ ہوتی مگر اس وقت وہ ولید کے پاس سے اٹھ جانا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے فوراً ریکٹ تمام لیا تھا۔

”فراز بھائی! مجھے تو کھیلنا نہیں آتا۔“ اس نے فراز کے پاس پہنچ کر آہستہ آواز میں کہا تھا۔

”یہاں کھیلنا آتا کس کو ہے۔ تم شروع کرو، خود بخود ہی آجائے گا۔“ فراز نے اسے تسلی دی تھی۔ اس نے جھپکتے ہوئے سروں کر دوائی پہلی ہی سروں نیٹ میں جا کر لگی۔ اس نے شرمندگی سے فراز کو دیکھا۔ ”کوئی بات نہیں پھر کرواؤ۔“ فراز نے اس کی ہمت بندھائی۔ اس نے سروں کورٹ میں جا کر ایک بار پھر کانپتے ہاتھوں سے مشل پھینکی۔ اس بار مشل کاک نیٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی گر گئی۔ اس نے تالیوں کی آواز پر چونک کر دیکھا تھا۔

”زبردست میں اور موی پارٹنر بن سکتے ہیں۔ ہم ایک جیسا برا کھیلتے ہیں۔“ ولید نے شوخ لہجے میں کہا تھا۔ وہ ریکٹ زمین پر رکھ کر تیزی سے لان سے نکل آئی۔ اپنے پیچھے اسے سب کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اسے واپس بلا رہے تھے مگر وہاں رکی نہیں۔

”بس میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کھیلنے کو، نہیں..... میں..... ناراض ہو کر تو نہیں آئی تھی۔“ تھوڑی دیر بعد سب لوگ اندر آگئے تھے اور فری کے استفسار پر اس نے کہا تھا۔ ولید ان کے ساتھ نہیں آیا۔



پھر اس نے چند روز اسے نہیں دیکھا اور یہ ایک عجیب بات تھی ورنہ وہ دن میں کم از کم ایک چکر ضرور لگا جاتا تھا۔ اس کا جی چاہا تھا وہ فری سے اس کے نہ آنے کے بارے میں پوچھے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکی۔

”وہ کیوں نہیں آ رہا؟ کیا وہ ناراض ہو گیا ہے یا پھر وہ یہ سوچ رہا ہے کہ میں اس کی بات پر ناراض ہوں۔“

گھر میں کسی کو بھی اس کے نہ آنے پر کوئی حیرت تھی نہ تجسس اور اس چیز نے موی کو اور بھی پریشان کیا تھا۔ انہیں کچھ تو کہنا چاہئے اس کے بارے میں۔

وہ ایک ہفتہ کے بعد آیا تھا۔ پہلے سے زیادہ خوبصورت اور ہشاش بشاش ہو کر۔ وہ

اس وقت لان میں پھر رہی تھی جب اسے اپنے لان سے نکل کر آتے دیکھا تھا اس نے موی کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر دروازے سے ہٹا دیا اور پھر اس کی طرف آنے کے بجائے اندر چلا گیا وہ وہیں باہر لان کے چکر لگاتی رہی یہاں تک کہ اندھیرا گہرا ہو گیا۔ وہ اندر چلی آئی۔ لاؤنچ سے سب کے ساتھ اس کے قہقہوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ وہ لاؤنچ میں آنے کے بجائے سیدھا اوپر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ جانتی تھی، وہ اب کھانا کھائے بغیر نہیں جائے گا اور وہ کھانے پر اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کمرے کی لائٹ آف کرنے کے بعد وہ بستر پر لیٹ گئی تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے دروازے پر دستک سنی اور پھر ملازم کو اپنا نام پکارتے سنا مگر وہ چپ چاپ لیٹی رہی۔ وہ جانتی تھی وہ اسے کھانے کے لئے بلانے آیا تھا۔ ملازم کچھ دیر تک دستک دینے کے بعد واپس چلا گیا تھا۔

اگلے دن وہ صبح سب کے ساتھ ناشتہ کر رہی تھی۔ جب وہ ایک بار پھر آ گیا تھا کسی کے کہے بغیر ہی وہ کرسی کھینچ کر ناشتہ کرنے بیٹھ گیا تھا۔ اس نے موی کو مخاطب نہیں کیا تھا۔ وہ ناشتہ کرتے ہوئے گا ہے بگا ہے اس کا چہرہ دیکھتی رہی، مگر وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ فری اور مبین سے گفتگو میں مصروف تھا۔ وہ ناشتہ کرنے کے بعد وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ پھر یہ جیسے ولید کی روٹین بن گئی تھی۔ وہ جب بھی وہاں آتا۔ باقی لوگوں سے باتیں کرتا رہتا اور اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ خود بھی اس سے کترانے لگی تھی۔ وہ جب بھی وہاں آتا وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ جاتی تھی اور اگر وہ پہلے سے فراز اور فری کے پاس بیٹھا ہوتا تو وہ کبھی بھی پہلے طرح ان کے پاس نہیں آتی تھی۔

اسے وہاں آئے چار ماہ ہونے والے تھے اور ان چار ماہ میں جب بھی اس کے ابو نے فون کیا تھا، انہوں نے کبھی بھی اسے واپس آنے کے لئے نہیں کہا۔ تایا کے گھر وہ اگر خوش نہیں تھی تو ناخوش بھی نہیں تھی۔ یہاں گھر کی طرح کوئی اس کی وجہ سے ناخوش نہیں تھا نہ ہی گھر کی طرح کوئی اسے گھر سے نکالنا چاہتا تھا مگر وہ جانتی تھی پھر بھی یہ اس کا گھر نہیں تھا۔



اس دن واصف کا سا لگ رہا تھا اور وہ ان سب کو لانچ کے لئے پی سی لے کر گیا تھا۔ ولید اور عثمان دونوں ان کے ساتھ کسی مصروفیت کی وجہ سے نہیں گئے تھے۔ واپسی پر وہ اپنے گھر آنے کے بجائے ولید کے گھر ہی چلے گئے تھے۔ نبیلہ آئی باہر دوپ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ سب بھی اندر جانے کے بجائے ان کے پاس لان میں آگئے تھے۔ کافی دیر تک وہ لانچ کے

بارے میں ہی باتیں کرتے رہے۔ پھر پتا نہیں فری کو کیا خیال آیا تھا۔

”وہ تمہیں میں اس دن بتا رہی تھی ناموسی کہ واصف کی اسٹڈی میں کتابوں کی اچھی کلکیشن ہے کسی دن دکھاؤں گی۔ اب دیکھنا چاہو تو جا کر دیکھ لو۔“ زفری نے اس سے کہا تھا۔

”میں کیسے جا سکتی ہوں اکیلے۔“ وہ دھیمی آواز میں بولی تھی۔

”چلی جاؤ مومی! کوئی مسئلہ نہیں ہے یہ سامنے والا کمرہ میرا ہے پہلے والا عثمان کا ہے اور اس سے آگے والا ولید کا۔ میرے کمرے کے ساتھ چھوٹی سی اسٹڈی ہے۔ کمرہ لاکڈ ہے نہ ہی اسٹڈی روم، تم آرام سے جا سکتی ہو۔ کوئی مشکل ہو تو اندر کسی ملازم سے پوچھ لینا۔“ واصف نے رانگ چیئر پر جھولتے ہاتھ اٹھا کر دوسری منزل کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہاں کچھ کمروں کی کھڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ سب دوبارہ گفتگو میں مصروف ہو چکے تھے۔ وہ اٹھ کر اندر آ گئی۔

بیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر پہنچنے کے بعد اس نے اپنے سامنے کمروں کی ایک لمبی قطار دیکھی تھی۔ اس نے اندازہ لگا کر ایک دروازہ کھول لیا۔ وہ اسٹڈی روم ہی تھا اور وہاں واقعی اچھی خاصی کتابیں تھیں، مگر جس چیز نے اسے سب سے پہلے متوجہ کیا تھا وہ وہاں نیبل پر پڑا ہوا ایک عدد کمپیوٹر تھا۔ اس نے اسٹڈی میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا ایک نظر اس نے چاروں اطراف ڈالی تھی۔ اسدی کا ایک دروازہ بائیں جانب بھی تھا، شاید وہ واصف کے بیڈ روم میں کھلتا ہوگا، اس نے سوچا تھا اور پھر وہ شیلف کی طرف بڑھ گئی باری باری کتابیں نکال کر اس نے انہیں دیکھنا شروع کیا تھا۔ وہاں مختلف موضوعات پر کتابیں تھیں۔ مگر ان میں زیادہ تر کتابیں کمپیوٹر سے متعلق تھیں۔ اس نے ہر شیلف پر پڑی ہوئی کتابوں کو ترتیب سے دیکھنا شروع کیا اور پھر کچھ کتابیں اس نے نکال لی تھیں۔ کتابیں نکالنے کے بعد وہ نیبل پر پڑے ہوئے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔ کچھ دیر تک وہ اسے دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ کمپیوٹر آن نہیں تھا اور وہ اسے آن کرنا جانتی بھی نہیں تھی۔ نہ ہی وہ ایسا کوئی رسک لینا چاہتی تھی۔ چند لمحوں وہ آف پڑے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتی رہی اور ان پر لکھے ہوئے نمبرز اور حروف کو پڑھتی رہی۔ پھر وہ کتابیں اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اسٹڈی میں تقریباً ایک گھنٹہ گزار کر جب وہ نیچے آئی تو واصف اندر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔

”واصف بھائی! میں نے کچھ کتابیں لی ہیں آپ کی اسٹڈی سے۔ پڑھنے کے بعد واپس کر دوں گی۔“ اس نے واصف سے کہا تھا۔

”کووی بات نہیں۔ تم جب چاہو آ کر میری اسٹڈی سے کتابیں لے جا سکتی ہو بس انہیں احتیاط سے رکھنا۔ میں نے بڑی محنت سے جمع کی ہیں۔“ واصف نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

وہ اسے یقین دہانی کراتے ہوئے باہر آ گئی۔ نبیلہ آنٹی اب لان میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھیں۔ شاید باقی سب واپس گھر جا چکے تھے۔ وہ کچھ دیر نبیلہ آنٹی کے پاس بیٹھی رہی پھر ان سے اجازت لے کر گھر آ گئی تھی۔

چند دن کے بعد کتابیں لے کر وہ واپس اسٹڈی میں گئی تھی اور وہاں سے کچھ اور کتابیں لے کر آئی تھی پھر یہ جیسے اس کی روٹین میں شامل ہو گیا تھا وہ ہفتہ میں ایک دو بار ضرور اسٹڈی جاتی اور کچھ دیر وہاں گزارنے کے بعد کتابیں لے کر آ جاتی تھی۔ واصف سے کبھی بھی دوبارہ اسٹڈی جاتے ہوئے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ عموماً رات کے وقت اپنے باپ کے ساتھ آفس سے واپس آتا تھا اور یہی حال عثمان کا تھا۔ وہ بھی بزنس مینجمنٹ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ ہی کاروبار میں شریک ہو گیا تھا۔ صرف ولید تھا جو ابھی پڑھ رہا تھا۔ واصف اور عثمان ولید کی طرح اپنی پھوپھو کے گھر زیادہ نہیں آتے تھے۔ ایک وجہ تو شاید یہ تھی کہ وہ دونوں سارا دن آفس میں ہوتے تھے اور دوسری وجہ شاید یہ کہ وہ دونوں فرار اور فری سے کافی بڑے تھے۔ جبکہ ولید ان کا ہم عمر تھا۔ واصف کی نسبت فری سے طے تھی۔ جبکہ عثمان کے لئے آج کل نبیلہ آنٹی لڑکیاں دیکھنے میں مصروف تھیں۔

اس روز بھی شام کو وہ کتابیں ہی واپس کرنے کے لیے نبیلہ آنٹی کے گھر گئی تھی۔ نبیلہ آنٹی کو بتانے کے بعد وہ اوپر اسٹڈی میں آ گئی تھی۔ لائٹ آن کرنے کے بعد اس نے پہلے والی کتابیں واپس اپنی جگہ پر رکھ دی تھیں اور کچھ نئی کتابیں نکال کر اسٹڈی نیبل پر رکھ گئی۔ تب ہی اچانک کسی نے ایک جھٹکے سے اسٹڈی کا دروازہ کھولا۔ وہ چونک کر مڑی۔ ولید اسٹڈی کے دروازے میں کھڑا حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ شاید اس وقت واصف کے بیڈ روم میں تھا اور کسی کام سے اسٹڈی میں آیا تھا۔

”مومی! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”میں کتابیں لینے آئی تھی۔“ وہ اسے یک دم اپنے سامنے پا کر گڑبڑا گئی تھی۔

”کتابیں لینے لیکن یہاں سے؟“ وہ اب بھی حیران تھا۔

”میں نے اجازت لی ہے۔“

”کس سے اجازت لی ہے؟“ اس کا لہجہ کچھ تیکھا تھا۔

”واصف بھائی سے پوچھا ہے میں نے۔ انہوں نے کہا ہے کہ میں جب چاہوں یہاں آ سکتی ہوں۔“

اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”واصف بھائی سے؟ کیا بات ہے بھئی واصف کی۔ بڑے بڑے لوگ ان سے اجازت لیتے ہیں۔ مجھ غریب کو تو کوئی گھاس ہی نہیں ڈالتا۔ ٹھیک ہے سولی بی بی جو چاہیں کریں۔ آپ کو کھلی چھٹی ہے۔“ اس کا لہجہ بے حد عجیب تھا۔

”اگر آپ کو برا لگا ہے تو میں آئندہ یہاں سے کوئی کتاب نہیں لوں گی۔ میں آپ کو تکلیف.....“ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتابیں ٹیبل پر رکھ دی تھیں۔ اب اس پر کچھ خیالات بھی طاری ہو چکی تھی۔

وہ اس کی بات سن کر دروازہ چھوڑ کر اسٹڈی کے اندر آ گیا۔ ”مجھے یہ بتاؤ کہ تم اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض کیوں ہو جاتی ہو۔ اس دن وہ بیڈنٹن کھیلتے ہوئے چلی گئی تھیں۔ اس کے بعد تم نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی جہاں میں آتا ہوں تم بھاگ جاتی ہو۔ شاید میری شکل دیکھنا ہی نہیں چاہتیں اور پھر میری بات کا غلط مطلب لے رہی ہو۔ میں نے کہا ہے کہ مجھے تکلیف پہنچی ہے یا تم کتابیں لینے مت آیا کرو۔ میں نے کچھ ایسا کہا ہے؟“ وہ اس کے سامنے کھڑا سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ موی کو اپنا چہرہ سرخ ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ ”میں ناراض تو نہیں تھی۔ میں تو بس وہ..... مجھے..... میں۔“ وہ ہٹکانے لگی۔

”تم آؤ۔ جتنی چاہے کتابیں لے سکتی ہو مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے Do keep it in your mind. مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“ وہ بات کرتے کرتے اسٹڈی سے نکل گیا تھا۔ اس نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔ کتابیں ٹیبل سے اٹھا کر وہ اسٹڈی سے نکل گئی تھی۔

اگلے دو ہفتے وہ اسٹڈی نہیں گئی۔ وہ دوبارہ وہاں اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اسی طرح تایا کے گھر آ رہا تھا، لیکن اس نے بھی اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا تھا۔ ہاں اب وہ ایک بار پھر موی سے بات کرنے لگا تھا۔ وہ بھی پہلے کی طرح اس کے آنے پر اٹھ کر وہاں سے نہیں جاتی تھی، وہ نہیں چاہتی تھی وہ پہلے کی طرح دوبارہ یہ بات پوائنٹ آؤٹ کرے۔

اس دن اس کے ابو اچانک آگئے تھے۔ امی بھی ان کے ساتھ تھیں۔ وہ بہت خوش

ہوئی تھی۔ چھ ماہ کے بعد انہیں دیکھ رہی تھی۔

”آپ لوگوں کو انوائٹ کرنے آئے ہیں۔ مرینہ کی شادی ہو رہی ہے۔ چودہ تاریخ کو۔ ہم نے سوچا خود آ کر آپ لوگوں کو کارڈ دے دیں اور مومنہ کو بھی لے جائیں۔ وہ بھی بہن کی شادی اٹینڈ کر لے۔“ امی نے چائے پیتے ہوئے تائی کو بتایا۔ ان کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ اس نے ابو کو دیکھا وہ بھی مسکرا رہے تھے۔

”مرینہ کی شادی اتنی جلدی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ابھی تو وہ اٹھارہ سال کی ہوئی ہے۔ تم لوگوں کو مومنہ کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا۔ وہ سب سے بڑی ہے چلو روہینہ کی تو تم نے کردی مگر اب مرینہ سے پہلے تمہیں مومنہ کا خیال کرنا چاہیے تھا۔“

تائی چپ نہیں رہ سکی تھیں۔ امی کا چہرہ یک دم سپاٹ پڑ گیا۔ وہ اٹھ کر لاؤنج سے باہر آگئی۔ شام کو وہ امی اور ابو کے ساتھ واپس گجرات آگئی تھی۔ امی کا موڈ اب پھر نارمل ہو چکا تھا۔ شاید تائی نے مزید کچھ نہیں کہا تھا۔ شادی ایک ہفتے کے بعد تھی اور گھر میں بہت سے کام تھے۔ اس نے امی کے بغیر کہے ہی اپنی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ شادی کی تقریبات بہت دھوم دھام سے ہو رہی تھیں اور شادی کے دوران ہی اسے پتا چلا کہ روہینہ کی شادی کے دوران ہی امی نے مرینہ کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ ابو شاید اس بات پر تیار نہ ہوتے۔ اس لیے انہوں نے بہانے سے اسے تایا کے ہاں بھجوا دیا تھا اور اس کی عدم موجودگی میں انہوں نے ابو کو اس رشتے پر رضامند کر لیا تھا۔ شادی پر تایا، تائی بھی فری اور ٹین کے ساتھ آئے تھے اور شادی کی تقریبات ختم ہونے کے بعد انہوں نے ابو سے کہا تھا کہ وہ اب مومنہ کے لیے رشتہ ڈھونڈنے کی کوشش کریں اور دونوں چھوٹی بہنوں سے پہلے اس کی شادی کریں۔

”بھائی صاحب! ابھی ہم فوری طور پر شادی کر نہیں سکتے۔ آپ کو تو پتا ہی ہے کہ اچھے رشتے کتنی مشکل سے ملتے ہیں اور پھر ابھی دونوں بیٹیوں کی شادی کی ہے، اب فوری طور پر تیسری بیٹی کی نہیں کر سکتے ظاہر ہے بہت کچھ دینا دلانا ہوتا ہے۔ ایک دو سال ٹھہر کر کریں گے تب تک کوئی اچھا رشتہ مل جائے گا اور ویسے بھی مومنہ کون سی بوڑھی ہو رہی ہے۔ ماشاء اللہ ابھی جوان ہے۔ میرا تو ارادہ یہ ہے کہ مومنہ کے ساتھ ہی غزل کی شادی بھی کر دیں۔ وہ بھی خیر سے بڑی ہو رہی ہے۔ اگلے سال اس کا قد مومنہ تک پہنچنے لگے گا۔ آپ کو تو پتا ہی ہے، ہمارے کندھوں پر کتنی ذمہ داریاں ہیں۔ بیٹیوں کی شادی کرنا کوئی آسان کام تو نہیں ہوتا۔“

امی نے ان کی باتوں کے جواب میں کہا تھا۔ ابو خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے رہے۔ تائی نے بات بدل دی۔

اگلے روز فری جانے کے لیے اپنا سامان پیک کر رہی تھی جب وہ اس کے پاس آئی تھی۔

”کیا میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی؟“ اس نے پوچھا تھا۔

فری کے ہاتھ رک گئے۔ ”تم جانا چاہتی ہو؟“

”ہاں۔“

”ٹھیک ہے چلو۔ میں پایا سے کہہ دیتی ہوں۔“ فری نے دوبارہ پیکنگ شروع

کردی۔

وہ اپنے کمرے میں آ کر سامان پیک کرنے لگی۔ خلاف توقع امی یا ابو نے اس کے

جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور پہلی بار اسے یہ بات اچھی نہیں لگی۔

”کیا ان لوگوں کو میری ضرورت ہی نہیں ہے؟ میری کمی محسوس نہیں ہوتی۔ امی کو

نہیں ابو کو بھی۔“ وہ مایوس ہو گئی تھی۔



اس شام وہ پھر واصف کی اسٹڈی میں آئی تھی۔ کتابیں دیکھتے دیکھتے پتا نہیں اس

کے دل میں کیا آئی۔ وہ کمپیوٹر کے پاس آ گئی۔ اس نے اسے آن کرنے کی کوششیں شروع

کردی تھیں۔ پلگ ساکٹ میں لگانے کے بعد اس نے CPU کو دیکھنا شروع کر دیا بڑی

احتیاط سے اس نے پاور کا بٹن دبا دیا۔ چند لمحوں کے بعد کمپیوٹر کی تاریک اسکرین روشن ہو گئی

تھی اس نے کی بورڈ پر موجود Keys کو دبانا شروع کیا اسکرین پر موجود سکرین سیور بدل نہیں

رہا تھا۔ اس نے باری باری ہر Key کو دبایا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پتا نہیں کتنے منٹ وہ

Keys کو بار بار دباتی رہی تھیں پھر اچانک ایک ہاتھ کی بورڈ پر آ گیا تھا اس نے کچھ Keys

کو پریس کیا تھا پھر پاس ورڈ فیڈ کیا۔

”لو اب کرو، کیا کرنا ہے؟“ ایک پرسکون آواز اس کے عقب میں گونجی۔ پھر ہاتھ

Key بورڈ سے ہٹ گیا۔ وہ بالکل سکت تھی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

اسے شرمندگی ہو رہی تھی۔ اس کا جی چاہا تھا، وہ وہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے۔

”کمپیوٹر آپریٹ کرنا آتا ہے؟“ ولید نے کچھ توقف کے بعد پوچھا تھا۔

”نہیں۔“ اس نے بے جان آواز میں جواب دیا۔

”میں نے اسے آن کر دیا ہے۔ تم اب Key بورڈ استعمال کر سکتی ہو۔ اب کوئی

مسئلہ نہیں ہوگا۔ جب جانا چاہو تو اسے آن ہی رہنے دینا، مجھے اس پر کچھ کام کرنا ہے۔“

وہ ایک بار پھر اسٹڈی سے غائب ہو گیا تھا۔ اس نے دروازہ بند ہونے کی آواز سن

میں نے خوابوں کا شجر دیکھا ہے

کر ایک گہرا سانس لے کر پیچھے دیکھا تھا۔ پھر دوبارہ اسکرین پر نظریں جمادیں کچھ دیر وہ بے

دلی سے Key بورڈ پر ہاتھ چلائی رہی پھر اٹھ کر اسٹڈی سے باہر آ گئی۔



”جم خانہ چلو گی آج مومی میرے ساتھ؟“ اس شام فری نے اس سے پوچھا تھا۔

”سب جا رہے ہیں؟“

”نہیں، سب تو نہیں جا رہے۔ پاپا اور ممی نے جانا تھا مگر انہیں کسی ڈنر پر جانا ہے۔“

فری کی آج نائٹ ڈیوٹی ہے۔ ٹین کا بھی کوئی ٹیسٹ ہے۔ میں اور بشر جا رہے ہیں۔ بہت بڑا

فنکشن ہے وہاں، کچھ پاپ سٹارز بھی آ رہے ہیں۔ تم انجوائے کرو گی۔“

فری نے اسے تفصیل بتائی وہ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد تیار ہو گئی۔

فنکشن واقعی بہت بڑا تھا۔ پورے لان میں ٹیبلز لگی ہوئی تھیں اور کوئی بھی ٹیبل خالی

نظر نہیں آ رہی تھی۔ زیادہ تر نوجوان تھے اور جو ادھر سے ادھر چکر لگا رہے تھے۔ فنکشن ابھی

شروع نہیں ہوا تھا۔ اسٹیج پر آرکسٹرا ہلکی ہلکی دھنیں بجا رہا تھا۔ فری اور بشر کو ساتھ لے کر

انٹرنیشنل کارڈ پر درج نمبر والی ٹیبل کی طرف بڑھ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد فنکشن شروع ہو گیا۔

ایک مشہور پاپ سٹار نے اسٹیج پر چڑھ کر گانا شروع کیا۔ لوگ ہاتھ اوپر اٹھا کر تالیاں بجا رہے

تھے۔ کچھ لڑکے اسٹیج کے سامنے ڈانس کر رہے تھے۔ وہ یہ ہنگامہ دیکھنے میں مگن تھی جب اس

نے اسٹیج سے کچھ فاصلے پر ایک ٹیبل پر ولید کو ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ وہ لاشعوری طور

پر اسے دیکھتی رہی۔ وہ خلاف معمول ڈنر سوٹ میں ملبوس تھا اور خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں گانا

سننے کے بجائے آپس میں باتیں کرنے میں زیادہ دلچسپی لے رہے تھے۔ پھر فری کی نظر بھی

ولید پر پڑ گئی تھی۔

”ارے ولید بھی آیا ہوا ہے بشر دیکھو۔“ اس نے بشر کو متوجہ کیا۔

”میں پہلے ہی دیکھ چکا ہوں میرے سامنے ہی آ کر بیٹھا ہے۔“ بشر نے بے

نیازی برتی۔

”یہ لڑکی کون ہے اس کے ساتھ؟“

”کوئی ایک لڑکی مستقل ہو تو بندہ اتا پتا بھی رکھے، ہر تیسرے دن کوئی نئی لڑکی اس

کے ساتھ ہوتی ہے۔ ویسے یہ ارے ہے۔ آج کل اس کے بڑے گن گار ہا ہے۔ پرسوں کہا نہ

لے کر گیا ہوا تھا۔ میری بھی اتفاقاً وہاں ملاقات ہو گئی۔ تب ہی اس نے تعارف کروایا تھا۔ یہ

کلاس فیلو ہے اس کی جس ملٹی نیشنل کمپنی میں انٹرن کے طور پر کام کر رہا ہے۔ اس میں اس کا

باپ بھی ڈائریکٹر ہے۔“ بشر نے پوری تفصیل بتا دی تھی۔
وہ گم صم ہو گئی تھی۔ ”ملٹی پٹیشنل کمپنی میں انٹرن کے طور پر کام کر رہا ہے؟“ اس نے
بشر سے پوچھا تھا۔

”ہاں اصل میں یہ LUMS سے MBA کر رہا ہے۔ پچھلے سال ایک ملٹی پٹیشنل
کمپنی نے ہائر کیا تھا۔ کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ وہ بھی پارٹ ٹائم جاب کر رہا ہے وہاں
میس پچیس ہزار کمایا ہے۔“ وہ بے یقینی کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔
”مگر یہ تو کہتے ہیں کہ ان کے پاس روپے نہیں ہوتے اور ان کے کپڑے بھی.....“
فری نے ایک ہلکے سے تہقہ کے ساتھ اس کی بات کاٹ دی۔

”یہ عادت ہے اس کی آٹھ دس ہزار انکل بھی اسے ہر ماہ دیتے ہیں اور اتنے ہی
روپے یہ نیبلہ آئی سے بھی ہتھیا لیتا ہے۔ پھر بھی قرض لیے بغیر اس کا مہینہ نہیں گزرتا۔ اس
کے ہاتھ میں سوراخ ہیں روپیہ اس کے پاس نہیں ٹھہر سکتا کچھ سرگرمیاں بھی اس کی ایسی ہیں
لڑکیوں کے ساتھ ہوٹلنگ کرنا، تھے تھائف دینے اب ظاہر ہے یہ سب کام روپے کے بغیر تو
نہیں ہوتے اور تم کپڑوں کو کیا کہہ رہی ہو۔ یونیورسٹی جاتے ہوئے اس کا یہی حال ہوتا ہے۔
گھسی ہوئی جینز اور پرانی شٹس۔ کبھی اسے شام کو دیکھا کرو، کس طرح بن ٹھن کر لگتا ہے۔
بڑی اونچی چوڑی اس کی Versace اور ارمانی کے علاوہ اسے کوئی کپڑے پسند نہیں
آتے۔ تم جا کر کبھی اس کی وارڈ روب دیکھو تو حیران ہو جاؤ۔ پورا بوتیک لگتا ہے۔ مگر پھر بھی
اسے گھے بٹے کپڑے پہن کر پھرنے کی عادت ہے۔ کوشش کرتا ہے کہ دوسروں کی چیزیں بھی
اٹھا کر لے جائے۔ ایویں ہی تو ہم اسے ذلیل نہیں کرتے رہتے۔ مگر مجال ہے جو اس پر اثر ہو
جائے۔ اسے پرواہ ہی نہیں ہے۔ گھر والے پابندیاں لگا لگا کر تھک گئے ہیں۔ مگر یہ ذرا نیبلہ
آئی کا لاڈلا ہے، اس لیے اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ ماموں تو قطعاً لحاظ نہیں
کرتے اس کا۔ انہوں نے لڑکیوں کے ساتھ پھرنے کی وجہ سے اس کی گاڑی واپس لے لی
تھی۔ کئی دفعہ جیب خرچ بھی بند کیا ہے انہوں نے مگر اس کو تو سوتھیلے آتے ہیں پیسے حاصل
کرنے کے وہاں سے پیسے بند ہوتے ہیں تو نیبلہ آئی کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ روپے دیں۔ دس
کہانیاں سناتا ہے اپنی مجبوریوں کی۔ اصل میں اسے بگاڑنے میں بھی بڑا ہاتھ نیبلہ آئی کا ہی
ہے۔ ایک تو گھر میں سب سے چھوٹا تھا اس لیے انہوں نے بڑا لاڈ پیار کیا دوسرے انہیں یہ بھی
تھا کہ وہ اپنی ماں کے پاس نہیں ہے، کہیں اسے یہ کی محسوس نہ ہو۔ اس لیے انہوں نے اس کی
ہر جائز ناجائز فرمائش پوری کی۔ اب ظاہر ہے عادتیں پکی ہو چکی ہیں۔ اب وہ پابندیاں لگانے

کی کوشش کرتی ہیں تو وہ قابو میں نہیں آتا ویسے بھی نیبلہ آئی کی تو اس میں جان ہے۔ یہی حال
اس کا ہے۔ نیبلہ آئی پابندی لگاتی ہیں دوسری طرف سے لاڈ پیار بڑھا دیتی ہیں اسے بھی ان
کی کمزوری کا پتا ہے اس لیے یہ بھی زیادہ پرواہ نہیں کرتا پابندیوں کی۔ اب ماموں سوچ رہے
ہیں کہ MBA کرے تو اسے لندن بھیج دیں گے اپنی کمپنی کا آفس اسٹبلش کرنے کے لیے
اور ان کا خیال ہے اس کی کہیں انجنٹ کر دیں تاکہ کچھ ذمہ داری کا احساس ہو اسے۔“
فری سوٹ ڈرنک کے سپ لیتے ہوئے اسے سب کچھ بتاتی گئی۔ وہ کوئی سوال
نہیں کر سکی تھی۔

”ان سے نین ملا کر دیکھو

یہ دھوکا بھی کھا کے دیکھو

ان سے نین ملا کے دیکھو

یہ دھوکا بھی کھا کے دیکھو

اسٹج پر موجود سنگر چیخ چیخ کر گارہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر ولید کو دیکھا، وہ ابھی بھی
وہیں اس لڑکی کے ساتھ موجود تھا۔ باتوں کا سلسلہ ابھی جاری تھا۔

آج کی رات بہت کالی ہے

سوچ کا دیپ جلا کے دیکھو

”مجھے چہرے پہچانا کبھی نہیں آ سکتا۔“ اس نے اعتراف کیا تھا۔ اسے یاد آیا تھا
جب وہ بار بار اس کے پیچھے اسٹڈی میں آتا تھا۔ اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہر
چیز میں بغیر مانگے ہی مدد کرتا تھا۔

”کوئی ایک لڑکی ہو تو بندہ اتا پتا رکھے اس کے ساتھ تو ہر تیرے دن ایک نئی لڑکی
ہوتی ہے۔“ اس کے کانوں میں بشر کا جملہ گونج رہا تھا۔

”تو کیا یہ میرے ساتھ بھی.....“ وہ آگے کچھ نہیں سوچ سکی تھی۔

”اور میں نے اسے کیا سمجھا۔ ضرورت مند، مجبور، مظلوم۔“ ولید کو دیکھتے ہوئے اس
کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔

ظاہر ہمیشہ دھوکا دیتا ہے کہیں پڑھا ہوا ایک جملہ اس کے ذہن میں گونجنے لگا تھا۔

”سوئی کیا ہوا رو کیوں رہی ہو؟“ فری نے اچانک اس سے کہا تھا۔

”پتا نہیں آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے۔“ اس نے آنکھوں کو مسلنا شروع کیا۔

”ان سے نین ملا کے دیکھو

یہ دھوکہ بھی کھا کے دیکھو
آواز پورے لان میں گونج رہی تھی۔

”اب ٹھیک ہو تم؟“

”ہاں اب ٹھیک ہوں۔“ اس نے کچھ دیر بعد آنکھوں سے ہاتھ ہٹا دیئے۔

”سو تیار ہونا بھی بڑا عذاب ہے سو تیلے ہونے سے مر جانا بہتر ہے۔“

”مجھے صبح سے کسی نے کھانے کے لیے کچھ نہیں دیا مجھے بہت بھوک لگی ہے۔“

”میں ایک ایک روپے کے لیے ترستا ہوں۔ میرے پاس چار پانچ سو روپے ہوں

تو میں کٹ کے بجائے ایک سوٹ نہ لے لوں۔ دو چار سستی شرٹس نہ خرید لوں۔ ایک عدد جینز یا

جاگرز کا جوڑا نہ لے لوں۔ ایک عدد اچھا ہیر برش نہ لے لوں۔“

”تمہیں کیا پتا میں کس طرح اپنے اخراجات پورے کرتا ہوں۔ یونیورسٹی کی فیس

ہوتی ہے پھر اور کئی قسم کے اخراجات ہیں۔ یہ سب میں اپنی جاب اور پاکٹ منی سے ہی

پورے کرتا ہوں۔“

اس کی آنکھوں میں پھر کچھ بڑ گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر آنکھوں کو مسلنا شروع

کر دیا تھا۔

”بس میرے پاس کچھ روپے آگئے۔ میں نے سوچا کہ چلو اور کچھ نہیں تو چند نئی

شرٹس اور جاگرز ہی لے لوں۔“

”تم لوگ تو میرے حالات جانتے ہی ہو۔ میں کتنی مشکل سے گزر بسر کر رہا ہوں۔

یہ جاننے کے باوجود تم لوگ میرا مذاق اڑا رہے ہو۔“

”اچھا ہے گاڑی واپس لے لی۔ میرے پاس تو پہلے بھی پیٹرول کے لیے پیسے نہیں

ہوتے تھے۔ مجھے سفید ہاتھی پال کر کیا کرنا ہے۔“

میوزک کا شور پہلے سے زیادہ بلند ہو گیا تھا۔

”میرے جیسے بندے کے پاس لڑکیوں کے لئے وقت کہاں ہوتا ہے اور لڑکیاں وہ

بھی تو بندہ دیکھتی ہیں۔ مجھ میں ایسا ہے کیا کہ کوئی مجھ سے دوستی کرے گی۔“

”مئی کی بات چھوڑو۔ انہیں تو مجھے بدنام کرنے کے علاوہ اور کوئی کام ہے ہی

نہیں۔ ہر ایک کے پاس جاکر میرے ہی قصے سناتی رہتی ہیں۔ کبھی واصف اور عثمان کا نام سنا

ان کے منہ سے۔“

سگراب اسٹیج سے نیچے اتر کر ٹیبلز کے درمیان چکر لگا رہا تھا۔

”میں اور مومی اچھے پارٹنر بن سکتے ہیں۔ ہم ایک جیسا برا کھیتے ہیں۔“

”تم اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض کیوں ہو جاتی ہو۔ اس دن بھی تم وہ بیڈ منٹن

والی بات پر ناراض ہو گئی تھیں۔ پھر تم نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جہاں میں

آتا ہوں۔ تم بھاگ جاتی ہو شاید تم میری شکل دیکھنا ہی نہیں چاہتیں۔“

”تم جتنی کتابیں چاہو لے سکتی ہو۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مجھے کوئی

تکلیف نہیں پہنچے گی۔“

”اس کے ہاتھ میں سوراخ ہے روپیہ اس کے پاس نہیں ٹھہرتا۔ کچھ سرگرمیاں بھی

اس کی ایسی ہیں۔ لڑکیوں کے ساتھ ہونٹنگ کرنا، تھکے تحائف دینا اب یہ سب کام روپے کے

بغیر تو نہیں ہو سکتے۔“

”تم کبھی اس کی وارڈ روب جا کر دیکھو تو حیران رہ جاؤ۔ پورا بوتیک لگتا ہے مگر پھر

اس کو گھسے پٹے کپڑے پہن کر پھرنے کی عادت ہے کبھی شام کو دیکھا کرو، اسے کیسے بن ٹھن کر

نکلتا ہے۔“

”ویسے بھی نبیلہ آنٹی کی جان ہے اس میں۔ یہی حال اس کا ہے اسے ان کی

کمزوری کا پتا ہے۔ اس لیے پابندیوں کی پروا نہیں کرتا۔“

اس کے ارد گرد آوازوں کا ہجوم تھا۔ ولید اب بھی وہیں بیٹھا لڑکی کے ساتھ باتیں

کر رہا تھا۔ فری اور میشر ہاتھ اوپر اٹھا کر تالیاں بجاتے ہوئے سنگر کے ساتھ گارے تھے۔ اس

کی آنکھوں میں اب بھی کچھ بڑا ہوا تھا۔ آنکھیں مسلنے سے بھی نہیں نکل رہا تھا۔ سنگر دوبارہ اسٹیج

پر چڑھ کر ڈانس کرتے ہوئے گارہا تھا۔ چاروں طرف بیٹھے ہوئے لوگوں کی تالیوں، بیٹیوں

اور چیخوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ سب کچھ دیکھنے، سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

رات گیارہ بجے واپسی پر لان سے اٹھ کر پارکنگ میں لگاٹی گئی روشنیوں میں آنے

پر فری نے غور سے اس کی آنکھوں کو دیکھا۔

”تمہاری آنکھیں تو بے تحاشا سرخ ہو رہی ہیں مومی۔ ستیا ناس ہو گیا ہے تم گھر

چل کر پانی سے انہیں دھو کر آئی ڈراپس ڈال لینا۔ ورنہ یہ زیادہ خراب ہو جائیں گی۔“ گاڑی

میں بیٹھے ہوئے اس نے مومی کو مشورہ دینا شروع کیا۔ ”اب تو آ نکھ میں کچھ نہیں پڑا ہوا؟“

”نہیں، اب سب کچھ نکل چکا ہے۔“ اس نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے گاڑی کا

دروازہ بند کرتے ہوئے کہا تھا۔

اس رات کے بعد وہ دوبارہ کبھی اسٹڈی گئی تھی نہ ولید کے گھر۔ اس نے فری وغیرہ کے پاس بیٹھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ بس اپنے کمرے میں ہی رہتی تھی۔
 ”میں سوچ رہی ہوں، پلٹیکل سائنس میں پرائیویٹ طور پر ماسٹرز کر لوں۔“ اس نے فری سے کہا تھا۔

”ہاں ضرور کرو۔“ فری نے سرسری طور پر کہا۔ وہ کتابیں بازار سے لے آئی تھی اور انہیں لے کر وہ سارا دن اپنے کمرے میں بند رہتی۔ اس نے لان میں بیٹھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ اب ولید کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی اور بہت دن تک ہر بار کتاب کھولنے پر اس کے سامنے ہنجر کے کہے گئے جیلے آجاتے تھے۔

”لوگ، قدر جھوٹے ہوتے ہیں۔ کتنا بڑا فراڈ کرتے ہیں۔“ وہ ہر بار سوچتی تھی۔ میں نے کیوں سوچا کہ یہ بندہ قابل رحم ہے اور اسے مدد کی ضرورت ہے اور مجھے اس کی مدد کرنی چاہئے۔ میرے ذہن میں یہ خیال ہی کیوں آیا تھا۔“ وہ کئی کئی گھنٹے کمرے میں بے کار بیٹھی رہتی۔

”حالانکہ وہ تو..... اور پھر میں نے کیوں اس پر اتنی عنایت کیں۔ کیوں اتنی پرواہ کی۔ وہ میری ذمہ داری تو نہیں تھا۔ مجھے سمجھنے کی کوشش تو کرنی چاہئے تھی کہ سب اس کے بارے میں ایسی باتیں کیوں کہتے ہیں؟ اس طرح کیوں ٹریٹ کرتے ہیں میں اس کے جھوٹ کو کیوں پکڑ نہیں سکی۔ کیا میں اتنی، اور وہ بھی مجھے دھوکا دیتا رہا۔ میرے ساتھ..... اس نے کیوں نہیں سوچا کہ مجھے دھوکا نہیں دینا چاہئے۔ وہ مجھے کیا سمجھتا تھا، احمق، بے وقوف یا اپنا شکار اور اگر یہ سب دوسروں کو پتا چل جائے تو.....“ وہ خوفزدہ ہو جاتی۔

”وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔ کیا کہیں گے فری تو ہنسے گی۔“
 ”تم مومی! تم کیا اتنی احمق بھی ہو سکتی ہو۔ مجھے یقین نہیں آتا۔“ اس کا خوف بڑھتا جاتا۔ ”دنیا رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ اس میں ولید جیسے لوگ ہوتے ہیں اس نے نتیجہ اخذ کیا تھا۔“

چند دنوں سے اس نے فری اور شبنم کے رویے میں عجیب سی تبدیلی محسوس کی تھی۔
 خدشات اس کے دل میں ابھرنے لگے تھے۔

”کہیں ان کو.....“ وہ خوفزدہ ہو جاتی تھی۔ اس دن رات کو فری اس کے کمرے

میں چلی آئی۔

”مصروف ہو مومی؟“ اس نے اندر آنے کے بعد پوچھا تھا۔ اس کتابیں سیٹ دیں۔
 ”نہیں تو۔“

”اصل میں مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“
 وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ مومی کا سانس حلق میں اٹک گیا تھا۔ ”کیا تم ولید میں انٹرنلڈ ہو؟“ اسے لگا تھا جیسے اس کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔

”نہیں“ اس کے جواب پر فری کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے تھے۔
 اب اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔

”ہاں میرا بھی یہی خیال تھا۔ میں بھی سوچ رہی تھی کم از کم مومی اتنی احمق تو نہیں ہو سکتی۔“ وہ اب بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ ”اصل میں کچھ دن پہلے نبیلہ آئی نے می سے بات کی تھی تمہارے رشتے کے بارے میں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ولید کو تم پسند ہو اور وہ شادی کرنا چاہتا ہے مگر میں نے نبیلہ آئی سے کہا کہ تم ولید سے شادی کرنا نہیں چاہتیں اور وہ ایک نمبر کا فلرٹ ہے۔ ہم کیسے تمہیں ایسے غیر ذمہ دار آدمی کے پلے باندھ سکتے ہیں۔ کل کو تمہیں کوئی پریشانی ہو تو چچا ہمیں ہی الزام دیں گے۔ مومی نے تو صاف انکار کر دیا کہ تم ولید کو پسند نہیں کرتیں تو شادی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے مگر ولید دو تین دن سے بار بار آ رہا ہے۔ کہتا ہے، وہ خود تم سے بات کرنا چاہتا ہے مگر میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ تم اس سے کوئی بات کرنا ہی نہیں چاہتیں۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ پہلے اپنی حرکات ٹھیک کرے پھر کسی لڑکی کے لیے پرپوزل لے کر جائے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ مومی تو تمہیں اوّل نمبر کا لفنگا سمجھتی ہے، وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اس پر نظر رکھو گے۔ بڑی باتیں کی ہیں میں نے اس سے مومی۔ مگر وہ کہہ رہا تھا کہ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ مومی مجھے ناپسند کرتی ہے اور یہ سب کچھ اس نے کہا ہے۔ جب مجھے شبہ ہوا کہ شاید تم اس میں انٹرنلڈ تھیں اور اسی لئے اس نے پرپوزل بھجوایا ہے مگر اب مجھے تسلی ہو گئی ہے۔ میں نے ٹھیک کہا نا؟“ وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

”ہاں ٹھیک کہا میں اس میں انٹرنلڈ نہیں تھی۔“ وہ غائب دماغی کے عالم میں کہہ رہی تھی۔
 فری کچھ دیر مزید بیٹھی باتیں کرتی رہی تھی پھر اٹھ کر کمرے سے چلی گئی اس نے کرہ بند کر کے لائٹ آف کر دی تھی۔ پتا نہیں کب تک وہ چپ چاپ بیڈ پر بیٹھی رہی تھی۔

اگلے دن اس نے ابو کو فون کیا۔ ”میں واپس آنا چاہتی ہوں۔“

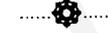
”مگر ابھی کیوں؟ میں تو چاہ رہا تھا کہ تم کچھ اور.....“

”میں اب یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ واپس آنا چاہتی ہوں۔“ اس نے زندگی میں

پہلی بار اپنے ابو کی بات کاٹی۔

تیسرے دن اس کے ابو آ کر اسے واپس لے آئے تھے۔ گھر ویسا ہی تھا اور وہاں کے لوگ بھی ریزرو، بچھے بچھے، سنجیدہ، تھکن کے اس پرانے احساس نے ایک بار پھر اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

”میں دوبارہ کبھی وہاں نہیں جاؤں گی۔ کبھی بھی نہیں۔“ اس نے گھر آ کر اپنے آپ سے پہلا وعدہ کیا تھا۔



اسے یاد آ رہا تھا۔ یہاں سے جانے کے بعد کئی ہفتے تک وہ گم صدم رہی تھی۔ کام کرتے کرتے اسے بہت سی چیزیں بھول جاتی تھیں۔ بات کرتے کرتے اسے پتا نہیں کیا کیا یاد آنے لگتا تھا۔ کئی ماہ تک وہ رات کو ڈراؤنے خواب دیکھتی رہی تھی۔ ایک ہی آواز، ایک ہی چہرہ، ایک ہی وجود اسے ہر وقت اپنے ارد گرد چلتا پھرتا نظر آتا تھا اور پھر آہستہ آہستہ وہ ان الوٹنز سے باہر آنے لگی تھی۔ وہ ہر بار یہ سوچ کر خود کو تسلی دیتی تھی۔ وہ اچھا انسان نہیں تھا۔ وہ دوسروں کی طرح مجھے بھی پھانسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ورنہ وہ بار بار اس طرح اسٹڈی میں.....

اور اب اسے پتا چلا تھا کہ وہ خود اس کی اسٹڈی میں جاتی رہی تھی۔ اسے یاد آیا تھا وہ پہلی بار اسے وہاں دیکھ کر حیران ہو گیا تھا۔ بیڑھیوں سے اترتے ہوئے اس نے اپنے ماتھے سے پسینہ خشک کیا۔ سارے پردے آہستہ آہستہ اٹھتے جا رہے تھے اور فری..... اس نے کیا کیا۔ اس نے ٹین کا راستہ صاف کیا۔ اس نے میری طرف سے خود ہی انکار کر دیا اور اس نے میرے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ مجھے اس کی بات نہیں سننا چاہئے کیونکہ وہ فراڈ ہے۔ اسے ڈر ہو گا کہ اگر ولید نے مجھ سے بات کی تو پھر.....“

اس کو سانس لینے میں دقت ہونے لگی۔ ہر ایک اپنے راستے سے مجھے کتنی صفائی سے ہٹا دیتا ہے۔ چاہے وہ امی ہوں یا پھر ابو یا پھر فری اور ٹین اور میں..... میرا وجود کیا اس قدر..... وہ گھر سے باہر نکل آئی تھی۔

وہ اب وہاں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ گھر کے سامنے والے لان میں صرف چند آدمی تھے۔ باقی سب عقبی لان میں تھے۔ اسٹیڈیوز پوری آواز سے انگش نمبرز بجا رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل آئی۔

”کاش دنیا میں میرے علاوہ کوئی اور نہ ہوتا۔ کم از کم اس وقت تو۔“

اس نے گیٹ سے باہر نکلنے ہوئے سوچا تھا۔ باہر کی سڑک ویران تھی اور وہاں گاڑیاں

کھڑی تھیں اور اس خاموشی میں وہ فل ولیم پر بچنے والے انگش نمبر کو با آسانی سن سکتی تھی۔

اس نے چلتے ہوئے اپنے چہرے پر چند قطرے گرتے محسوس کئے۔ اس نے دھیرے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اسٹریٹ لائٹس سڑک پر گرنے والے قطروں کو بہت واضح کر کے دکھا رہی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر سر جھکا لیا۔

”میں پچھلے ڈیڑھ سال سے یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میں نے آپ کے ساتھ کب کوئی ایسی حرکت کی تھی کہ آپ میرے بارے میں اتنی خراب رائے رکھنے پر مجبور ہو گئیں۔“

اس نے اپنے پیچھے چاہ سنی اور پھر کسی کو کہتے سنا۔ الوٹن ایک بار پھر اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔

اس نے اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی وہ اب اس کے برابر چل رہا تھا وہ بھی اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ سڑک پر اس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ یوں بول رہا تھا جیسے خود کلائی کر رہا ہو۔

”میرا خیال ہے، میں نے اس ایک سال میں جو آپ نے یہاں گزارا تھا ہمیشہ آپ کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔ تحفظ دینے کی کوشش کی تھی پھر بھی آپ کے لیے میں ایک فلرٹ، ادارہ اور لفٹنگا انسان ہوں۔“ بارش کے قطرے تیز ہونے لگے تھے۔

”یہ ٹھیک ہے کہ لڑکیوں کے ساتھ میری دوستی ہوتی تھی۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ میری کچھ باتوں کی وجہ سے آپ غلط فہمی کا شکار ہو گئی تھیں جیسے آپ نے یہ سوچ لیا کہ میں اپنی ماں کے ظلم و ستم سے عاجز ہوں اور میرے پاس روپے نہیں ہیں مگر یہ آپ کی غلطی تھی۔ میری نہیں۔ آپ نے سب کے سامنے مذاق میں کہی جانے والی باتوں کو اتنی سنجیدگی سے کیوں لیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آپ مجھ پر ترس کھانے لگی ہیں یا میری باتوں پر اعتبار کرنے لگی ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے تب ہوا جب آپ نے مجھے روپے دیئے اور پھر بعد میں ہر ماہ مجھے میری ضرورت کی چیزیں بھجوانے لگیں۔ میں ہر ماہ وہ پیکٹ دیکھ کر حیران ہوتا تھا کہ مجھے کون اس طرح شرف اور دوسری چیزیں بھجوا رہا ہے پھر مجھے آپ پر شک ہوا تھا اور میرا یہ شک ٹھیک تھا۔“

اس کے گالوں پر اب گرم قطرے بھی گرنے لگے تھے۔ اسٹیڈیوز پر گونجتی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔

Smile an everlasting A smile can bring you near to me.

Don't ever let me find you gone cos that would bring a tear to me.

اسے یاد آیا۔ وہ پہلے اسے ہمیشہ تم کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور آج وہ اسے آپ کہہ رہا تھا۔
 ”میں آپ کو منح کرنا چاہتا تھا۔ بتانا چاہتا تھا آپ کی غلط فہمی کے بارے میں مگر
 میں اتنی ہمت نہیں کر سکا۔ میں آپ کو شرمندہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر میرا خیال تھا، آپ سب
 کچھ جان گئی ہیں۔ جب اسٹڈی میں آیا کرتی تھیں تو میرا خیال تھا کہ آپ میرے بارے میں
 اچھے جذبات رکھتی ہیں۔ اس لئے وہاں آتی ہیں۔ آج یہ غلط فہمی بھی دور ہو گئی۔ آپ تو
 واصف کی اسٹڈی سمجھ کر وہاں آیا کرتی تھیں۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کو میری
 کون سی بات بری لگی تھی جس سے آپ نے میرا ایسا خاکہ بنا لیا کہ میں پچھلے ڈیڑھ سال سے
 فری کی باتوں کو بھول نہیں پایا۔“

”میں نے فری سے کچھ نہیں کہا تھا، کچھ بھی نہیں۔“ وہ ایک لمحے کو ٹھٹھک کر رکا۔
 ”پھر فری نے کیوں؟“ وہ بڑبڑایا۔

”مرد کو محبت نہیں کرنی چاہئے، وہ محبت افورڈ ہی نہیں کر سکتا۔ یہ بندے کو رسوا کر کے
 رکھ دیتی ہے۔ کم از کم مجھے نہیں کرنی چاہئے تھی اچھا بھلا زندگی گزار رہا تھا اور پھر بس۔“
 وہ اسے اس طرح بتا رہا تھا جیسے کسی تیسرے کے بارے میں بتا رہا ہو۔
 ”ہاں محبت نہیں کرنی چاہئے۔“ اس نے دل میں اعتراف کیا تھا۔

”پچھلے ڈیڑھ سال سے میں خود کو یہی سمجھا رہا ہوں کہ محبت بے کار چیز ہے۔ کیا
 ہے اگر نہیں ملتی کیا دنیا ختم ہو گئی ہے۔ دفع کرو زندگی کو نئے سرے سے شروع کرو۔ دنیا میں
 بس وہی تو نہیں تھی۔“

”ہاں پچھلے ڈیڑھ سال سے میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“ گالوں پر گرنے والے
 گرم قطروں کی تعداد میں اب اضافہ ہو گیا تھا۔ اسٹیرو پر آواز ابھی بھی گونج رہی تھی۔

This world has lost its glory

Let's start a brand new story

Now my love

”اور پرسوں یہاں آنے کے بعد آج تمہیں دیکھا اور بس۔ سب کچھ دھواں بن کر اڑ
 گیا۔ مجھے پتا چل گیا تھا تم بھی شادی اٹینڈ کرنے آئی ہو مگر میں کوشش کے باوجود تمہیں دیکھ نہیں
 پایا۔ پھر جب سب مہندی لے کر آرہے تھے تو میں وہاں کھڑا ہو گیا۔ میرا خیال تھا تم اب تو نظر آؤ
 گی مگر تم نظر نہیں آئیں۔ میں نے ایک ایک چہرے کو دیکھا تھا۔ تم اندر کیسے چلی گئی تھیں۔؟“
 ”لان سے گزر کر۔“ اس نے گہرا سانس لیا۔

”ہاں مجھے اس کا خیال آیا تھا اور میں وہاں گیا تھا مگر تم نظر نہیں آئیں میرا دل چاہا
 تھا میں کہیں بھاگ جاؤں پھر میں نے تمہیں ہال میں دیکھا تھا مٹین کے پاس۔ مجھے لگا تھا کسی
 نے مجھے زندگی بخش دی ہے اور پھر میں نے تمہیں وہاں اپنے کمرے میں دیکھا اور میرا دل چاہا
 تھا جنید مر جائے وہ یہاں کیوں کھڑا تھا۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا اور میں بات نہیں کر سکتا
 تھا۔ تم نے کبھی الوٹرز دیکھے ہیں موسیٰ؟ میں ڈیڑھ سال سے الوٹرز کے حصار میں ہوں اور ابھی
 جو یہاں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں تو مجھے لگتا ہے میں پھر کسی الوٹرن کے ساتھ چل رہا ہوں۔“

You think that I don't even mean

A single word I say

It's only words And words are all I have

To take your heart away

اسٹیرو کی آواز اب دور ہو چکی تھی مگر وہ اب بھی لفظوں کو سن سکتی تھی۔ وہ رک گئی۔
 بارش تیز ہو چکی تھی۔ وہ دونوں بری طرح بھیگ چکے تھے۔

”مٹین؟“ اس نے سراٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

”وہ سمجھ جائے گی ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا جو کسی
 دوسرے سے محبت کرتا ہو۔ وہ جانتی ہے، میں کس سے محبت کرتا ہوں۔ پہلے تو شاید میں اس
 سے شادی کر لیتا مگر اب نہیں۔ سب کچھ جاننے کے بعد نہیں۔“

اس نے مڑ کر گیٹ کی طرف دیکھا تھا پھر اس نے گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیا۔

”میں نے طوطوں کے پنجرے کی جالی بدلوادی تھی۔ اب اگر تم انہیں دیکھو میرا
 مطلب ہے روز تو وہ تمہاری انگلی کو کاٹ نہیں سکیں گے۔“
 اس نے مڑ کر ولید کو دیکھا۔

Talk in ever lasting words

And dedicate them all to me

And I will give you all my life

I'm here if you should call to me

اسٹیرو پر بچنے والا نمبر ختم ہو گیا۔ چاروں طرف عجیب سا ساٹا ٹاٹا پھیل گیا۔ بارش کے
 قطرے گرنے کی آواز اس خاموشی کو توڑ رہی تھی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی، پھر ولید نے
 اسے مسکراتے دیکھا تھا۔ وہ ایک قدم چل کر اس کے پاس آئی تھی۔ پاس آ کر اس نے اپنی بند

مٹھی اس کے سامنے کر کے کھول دی۔ چیونگم کی ایک اسٹک ریپر سمیت نیزھی میٹھی حالت میں اس کی مٹھی میں دبی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ لہرائی۔ اس نے چیونگم اٹھائی۔ موی نے اسے کہتے سنا۔

”یہ دنیا کی سب سے قیمتی چیونگم ہے۔“ وہ تیزی سے گیٹ کھول کر اندر آ گئی تھی۔ وہ وہیں باہر کھڑا چاروں طرف پھیلی ہوئی خاموشی اور بارش کے قطروں کی آواز کو محسوس کرتا رہا۔ اس نے کلائی سے رسٹ واچ اتار کر وقت دیکھا تھا۔ نونج کرستینٹس منٹ ہوئے تھے۔ اس نے گھڑی کو اسی وقت پر روک دیا۔ ٹشو نکال کر اس نے چیونگم اور گھڑی دونوں کو اس میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا۔ ایک گہری سانس لے کر دونوں ہاتھوں سے گیلے بالوں کو ماتھے سے پیچھے ہٹاتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا تھا۔ وہاں مکمل تاریکی تھی۔ بارش کے قطرے اس کے چہرے پر گرنے لگے۔ اس نے مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

”میرے علاوہ کسی کو آج یہ آسمان روشن نظر نہیں آ رہا ہوگا۔“ اس نے واپس جاتے ہوئے سوچا۔

”ہاں یا پھر.....“ اس کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔



میں نے خوابوں کا شجر دیکھا ہے

ایک آگ سی میرے وجود کو جلا رہی تھی۔ میں نے کار کا دروازہ کھول کر نیچے اترتے ہوئے اس بنگلے پر نظر دوڑائی۔ وہ میرے بنگلے سے بہت بڑا تھا۔ آگ بھڑکتی ہی جاری تھی۔ میں گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ کال بیل بجاتے ہوئے میں نے گھر کے مالک کا نام پڑھا۔ مجھے لگا، کسی نے مجھے دھکیل کر پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا ہو۔ شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔

چند لمحوں بعد گیٹ کھول کر ایک چوکیدار باہر آیا۔ اس نے مجھ سے میرے آنے کا مقصد پوچھا تھا۔ میں نے اسے جواب دینے کے بجائے دروازہ دھکیل کر اندر چلی گئی۔ وہ میرے پیچھے آیا مگر مجھے روک نہیں سکا۔ سامنے وسیع و عریض پورچ میں ایک بچہ سائیکل چلا رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر رک گیا۔ میں اس کا چہرہ دیکھا۔ کسی نے میرے گلے میں پھندا ڈال دیا۔ چہرہ شناسا تھا آج زوال کا دن تھا۔ میں لپکتی ہوئی اس کے پاس گئی۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ولید عمر۔“ اس نے کچھ کنفیوز ہو کر جواب دیا کسی نے پھندے کو کس دیا تھا۔

”تمہاری امی کہاں ہیں؟“ میں نے رکتی ہوئی سانس کے ساتھ پوچھا۔ اس نے

ہاتھ سے میری پشت کی طرف اشارہ کیا۔ میں پیچھے مڑ گئی، ایک عورت لان سے میری طرف آ رہی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر دوڑائی۔ چہرہ پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ سب کچھ شناسا تھا۔ کسی نے میرے پیروں کے نیچے سے تختہ نکال لیا۔ میں پھندے سے جھولنے لگی تھی۔ اس نے بھی مجھے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ اس نے دوبارہ مجھ پر نظر نہیں ڈالی۔ وہ میرے پاس سے گزر کر اپنے بیٹے کے پاس گئی اور اسے لے کر اندر چلی گئی۔ میں بھاگتی ہوئی گیٹ سے باہر آ گئی۔ ڈرائیور نے مجھے دیکھ کر دروازہ کھول دیا۔ میں

نے اندر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ دنیا ختم ہو گئی تھی۔ سب کچھ تباہ ہو گیا تھا اور میں..... میں زندہ تھی۔



میں نے عمر حسن کو اتنا چاہا ہے کہ شاید کبھی کسی اور نے اسے نہیں چاہا ہوگا۔ اس کی ماں نے بھی نہیں۔ وہ میرے لئے میرے وجود کا دوسرا حصہ تھا اور حیرت کی بات یہ ہے میں کبھی بھی اسے یہ بات نہیں بتا سکتی تھی۔ وہ میری خالہ کا بیٹا تھا اور میرے چچا کا بھی۔ اس سے میرا دوہرا رشتہ تھا۔ ہم دونوں کے گھر پاس پاس تھے اور گھروں میں آنا جانا بھی بہت تھا۔ میرے ابو بزنس مین تھے، اس کے ابو واپڑا میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ مالی لحاظ سے ہم ان سے بہت بہتر تھے بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ ہمارا اور ان کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود دونوں گھرانوں کے تعلقات بہت اچھے تھے، شاید وجہ وہ دہرا رشتہ ہو جو ہمارے والدین کے درمیان تھا بہر حال جو بھی وجہ تھی۔

ہم دونوں خاندان بہت قریب تھے۔ ہمارے گھروں کی دیواریں آپس میں ملی ہوئی تھیں اور صحن میں دروازہ بھی تھا۔ جو ہر وقت کھلا رہتا۔ ہم اسی دروازے سے ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے تھے۔ میری ایک بہن اور دو بھائی تھے اور عمر کی تین بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ وہ یونیورسٹی میں اکنائکس میں ماسٹرز کر رہا تھا۔ مجھے اس سے محبت کب ہوئی، میں نہیں جانتی۔ شاید کسی کو بھی یہ پتا نہیں چلتا کہ اسے محبت کب ہوتی ہے۔

ہاں مگر وہ مجھے بچپن سے اچھا لگتا تھا وہ کوئی زیادہ خوبصورت نہیں تھا مگر اتنی عام صورت کا بھی نہیں تھا، لیکن اگر خوبصورتی کی بات آئے اور میں یہ کہوں کہ میں اس سے زیادہ خوبصورت تھی تو یہ غلط نہیں ہوگا اور نہ ہی آپ اسے خوش فہمی سمجھیں۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا دھیے لہجے میں بات کرتا۔ اسے کبھی غصہ نہیں آتا تھا۔ بہت مہذب تھا اور پتا نہیں یہ سب باتیں کیوں میرے دل میں گھر کرتی گئیں۔ بچپن میں، میں ان کے گھر شاید اس کی بہنوں کے ساتھ کھیلنے جاتی ہوں گی مگر بڑے ہونے کے بعد میں صرف عمر حسن کے لئے جایا کرتی تھی۔ اسے دیکھے بغیر مجھے سکون ہی نہیں ملتا تھا۔ میں دن میں بار بار ان کے گھر جاتی اور وہ بھی اس وقت جب وہ گھر پر ہوتا پھر میں بہانے بہانے اس سے بات کرتی رہتی۔ اس کی پسند کے کھانے پکاتی اور بڑے اہتمام سے ان کے ہاں لے کر جاتی۔ تعلیم میں میری زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے میں بمشکل ایف اے ہی کر سکی تھی اور اس کے بعد میں نے کالج جانا چھوڑ دیا لیکن گھریلو امور میں، میں ماہر تھی، اگرچہ ہمارے گھر میں ملازم تھے لیکن پھر بھی میں کھانا خود پکاتی اور پکانے کے اسی

شوق نے مجھے کھانا پکانے میں ماہر کر دیا تھا۔

عمر کی امی میری پسندیدگی کو جانتی تھیں اور صرف وہی نہیں، میری امی بھی اس بات سے واقف تھیں اور انہوں نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔ خالہ کئی بار اشاروں اشاروں میں کہتی رہتی تھیں کہ وہ مجھے بہو بنا کر اپنے گھر لائیں گی اور میں اپنے لئے ان کی محبت سے واقف تھی۔ وہ میری امی سے بھی اس رشتے کے بارے میں بات کر چکی تھیں اور امی کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن عمر سے میری شادی کوئی زیادہ جلدی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ گھر میں سب سے بڑا تھا اور اس سے چھوٹی تین بہنیں تھیں اور وہ تینوں جوان تھیں خالہ کا خیال تھا کہ وہ کم از کم دو بیٹیوں کی شادی کر کے پھر عمر کی شادی کریں گی۔

عمر، بی اے کے بعد سے ماسٹرز کرنے کے ساتھ ساتھ سرجیکل کے آلات ایکسپورٹ کرنے کا چھوٹا موٹا بزنس شروع کئے ہوئے تھے اور وہ بہت مصروف رہتا تھا۔ خالہ سے شادی کے بارے میں اس کے خیالات کا اکثر پتا چلتا رہتا تھا۔

”وہ کہتا ہے کہ جب تک کاروبار صحیح طرح سیٹ نہیں ہو جاتا، میں شادی نہیں کروں گا۔ خواہو تو وہی ذمہ داری اٹھانے اور بڑھانے کا مجھے کوئی شوق ہے نہ ہمت۔“

میں خالہ کے سامنے اس کی سوچ کی تعریف کرتی۔ لیکن اندر ہی اندر میری اداسی بڑھتی جاتی۔ پھر بھی ان دنوں میں بہت خوش رہا کرتی تھی۔ زندگی کا ہر سہہ کسی رکاوٹ کے بغیر تھا۔ عمر مجھ سے باتیں کر لیتا تھا بلکہ کافی باتیں کر لیتا تھا مگر وہ سب باتیں عام سی ہوتی تھیں مجھے اس کی نظروں، اس کی باتوں میں وہ جذبات دکھائی نہیں دیتے تھے جو میرے دل میں اس کے لئے تھے۔ وہ بڑی عام سی باتیں کرتا تھا۔

”کباب بہت اچھے بنائے ہیں، بناتی رہا کرو۔“

”آج چائے تم بناؤ کیونکہ چائے تم سے اچھی کوئی نہیں بناتا۔“

”ٹی وی ذرا کم دیکھا کرو۔ کوئی فائدہ نہیں ہے ان بے کار چیزوں کو دیکھنے کا۔“

”تم نے پلائس کو بہت اچھے طریقے سے رکھا ہے۔ پورے گھر کو خوبصورت بنا دیا ہے تم نے۔“

اس کی کوئی بات بھی ایسی نہیں ہوتی تھی جیسی بشری رحمان اور رضیہ بٹ کے نادلوں کے ہیرو کی ہوتی تھی۔ نہ وہ فدا ہو جانے والی نظروں سے دیکھتا تھا، نہ وہ میرا آنچل پکڑ لیتا تھا، نہ وہ میرے لئے چھتوں پر آتا تھا، نہ وہ میرے بالوں میں پھول لگاتا تھا، نہ وہ میرے لئے پھولوں کے گجرے لاتا تھا، نہ وہ میرے حسن کے قصیدے پڑھتا تھا، نہ وہ میری کلائی پکڑ کر

ہاتھ میں پہنی ہوئی چوڑیاں توڑتا تھا، نہ وہ میرے لباس کے رنگوں کی تعریف کرتا تھا۔ پھر بھی میرا دل تھا کہ روز بروز اس کے عشق میں ڈوبتا گیا تھا۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا میں اسے سب کچھ کہہ دوں جو میرے دل میں اس کے لئے ہے۔ ہر دفعہ میں تہیہ کر کے اس کے گھر جاتی۔ اسے دیکھتے ہی سب کچھ بھول جاتی۔ وہ حال چال پوچھتا، کوئی نصیحت کرتا، کبھی کچھ کھانے کو دے دیتا اور میں بڑی خاموشی سے اس کی وہی پرانی باتیں سن کر واپس آ جاتی۔ گھر آ کر میں جھنجھلائی۔

”کیا اسے نظر نہیں آتا کہ میری آنکھوں میں اس کے لئے کیا ہے؟ کیا وہ نہیں جانتا کہ میں اس کے گھر کس کے لئے جاتی ہوں؟ وہ آخر یہ سب کیوں نہیں سمجھ لیتا یہ سب پہیلی تو نہیں ہے پھر آخر وہ یہ سب کیوں کرتا ہے۔ اتنا بے خبر، اتنا انجان کیوں بنا ہوا ہے۔ کیا مرد اتنا بے وقوف ہوتا ہے، کیا اس کا دل نہیں ہوتا؟“

میں سوچتی اور کمرے کے چکر لگاتی رہتی۔ پانی پیتی اور اپنے اندر کی آگ کو بجھاتی رہتی۔ گہرے سانس لیتی اور اپنے غصہ کو ٹھنڈا کرتی رہتی۔



عمر حسن بے وقوف نہیں تھا اور اس کا دل بھی تھا ہاں مگر یہ دل کسی اور کے پاس تھا۔ اسے میں اس لئے نظر نہیں آتی تھی کیونکہ کوئی پہلے ہی اس کی نظر میں آ چکی تھی۔ ثناء اس کی کلاس فیوٹھی۔ عمر کب سے اسے پسند کرتا تھا، یہ میں نہیں جانتی مگر وہ شروع سے ہی اس کے ساتھ بڑھتی تھی۔ دونوں کا ساتھ بہت پرانا تھا۔ ثناء کے والدین کسی کالج میں پڑھاتے تھے۔ وہ تین بہنیں تھیں اور وہ سب سے بڑی تھی۔ عمر نے کبھی کسی سے اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا کہ وہ کسی لڑکی کو پسند کرتا ہے مگر جب اس نے فاضل ایئر کے پیپر دے دیئے تو پھر اس نے اپنی امی کو ثناء کے بارے میں بتایا تھا اور ان سے کہا کہ وہ اس کا رشتہ لے کر ان کے گھر جائیں۔ خالہ نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ روتی دھوتی ہوئی ہماری طرف آ گئی تھیں اور انہوں نے میری امی کو سارا قصہ سنا دیا تھا۔ میری امی کا رد عمل بھی خالہ جیسا ہی تھا مگر پھر وہ نارمل ہو گئی تھیں مگر مجھے تو ایسا لگا تھا جیسے میرے دل کی حرکت بند ہو گئی تھی۔

”عمر حسن کسی اور سے محبت کرتا ہے۔ کسی اور سے شادی کرنا چاہتا ہے اور میں؟ میرا کیا ہوگا؟ مجھ میں کیا نہیں تھا جو اسے مجھ سے محبت نہیں ہوئی۔“

مجھے لگا تھا، کسی نے میرے وجود کو گہری کھائی میں دھکیل دیا تھا۔ میری امی کو تھوڑی

بہت پریشانی ہوئی مگر پھر شاید انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ انہوں نے میرا اور عمر حسن کا رشتہ طے نہیں کیا تھا صرف زبانی کلامی ہی بات ہوئی تھی ورنہ ان کی بہت بدنامی ہوتی۔ مگر انہیں کیا پتا تھا کہ تعلق دلوں میں بنتے ہیں اور عمر حسن سے میرا جو تعلق بن چکا تھا وہ اب کبھی بھی نہیں ٹوٹتا تھا۔

عمر، خالہ کو بار بار مجبور کر رہا تھا کہ وہ اس کی بات مان لیں اور رشتہ لے کر وہاں جائیں، اور خالہ سختی سے اپنی ضد پر قائم تھیں۔ عمر کے ابو کو اس رشتہ پر کوئی اعتراض نہیں تھا اگر کسی کو تھا تو صرف خالہ کو۔ لیکن جب سب گھر والوں نے انہیں مجبور کرنا شروع کر دیا تو انہوں نے یہ بہانا کرنا شروع کر دیا کہ جب تک تینوں بیٹیوں کی شادی نہیں ہوگی وہ عمر کی شادی نہیں کریں گی، نہ ہی ابھی ہیں اس کی نسبت طے کریں گی۔ میں نے ان کے گھر آنا جانا کم کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی ان کے گھر کی ہر خبر کا مجھے علم ہوتا رہتا تھا۔ جب خالہ کسی طور بھی اس کا رشتہ لے جانے پر تیار نہیں ہوئیں تو عمر حسن، ماں سے ناراض ہو گیا، اس نے ان سے بول چال ختم کر دی تھی۔ وہ ان دنوں ویسے بھی اپنا کاروبار اچھی طرح سے اسٹیبلش کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور بہت مصروف رہتا تھا لیکن ماں سے ناراض ہونے کے بعد وہ گھر میں صرف سونے کے لیے آیا کرتا۔ اس نے گھر میں کھانا، کھانا بھی بند کر دیا تھا۔

خالہ ہر روز ہمارے گھر آتیں اور کئی کئی گھنٹے اس کی شکایتیں کرتی رہتیں مگر میں جانتی تھی، یہ صرف شکایتیں نہیں تھیں وہ اس کے رویے سے بے حد پریشان تھیں۔ آخر وہ ان کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور پھر کماؤ بھی۔ انہوں نے اپنی تینوں بیٹیاں اسی کے سہارے بیانی تھیں۔ کیونکہ میرے چچا کی ریٹائرمنٹ میں بس ایک سال رہ گیا تھا۔ انہیں یہ بھی خوف تھا کہ کہیں وہ گھر چھوڑ کر ہی نہ چلا جائے اور اگر وہ ایسا کر بیٹھتا تو پھر وہ کیا کرتیں۔ روز بروز خالہ کمزور پڑتی جا رہی تھیں، ان کی ضد ختم ہو رہی تھی اور ان کی کمزوری مجھے بھی کمزور کر رہی تھی۔ یہ سوچ کر ہی میرا سانس رکنے لگتا تھا کہ کوئی اور لڑکی اس گھر میں عمر حسن کی بیوی بن کر آجائے گی اور میں، میں کیا کروں گی۔ ان دنوں میں بہت دعائیں مانگتی رہتی تھی۔ شاید میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی دعائیں نہیں کی ہوں گی جتنی میں نے ان دنوں کی تھیں مگر کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

ایک ہفتہ بعد خالہ، ثناء کا رشتہ مانگنے چلی گئی تھیں اور ثناء کے گھر والوں نے فوری طور پر ہاں کر دی تھی۔ اس رات میں بہت روتی تھی۔ اتنا روتی تھی کہ اگلی صبح میری آنکھیں کھل نہیں پاری تھیں۔ مجھ پر کیا گزر رہی تھی کوئی نہیں جانتا تھا، امی اسے میری بیوقوفی

لئے کیونکہ وہ ان کا کماؤ بیٹا تھا اور وہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ گھر میں اس کی شادی کی تیاری کوئی زیادہ جوش و خروش سے شروع نہیں کی گئی۔ اتنی جلدی اس کی شادی پر اس کی بہنیں بھی کچھ زیادہ خوش نہیں تھیں اور خالہ، وہ تو کئی بار مجھے دیکھ کر رو پڑتیں۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی لیکن مجھے ان کی محبت سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا تھا۔ خالہ نے بری میں اس کے لئے صرف دس جوڑے تیار کروائے تھے اور سونے کا صرف ایک سیٹ تھا۔ وہ بھی عمر نے خریدا تھا۔ خالہ کے پاس اپنی شادی کا کافی زیور تھا اور پہلے وہ کئی بار مجھے اپنے زیور کی کچھ چیزیں دکھا کر کہتیں کہ یہ میں نے عمر کی دلہن کے لئے رکھا ہے مگر عمر کی شادی کے موقع پر انہوں نے اپنا کوئی بھی زیور شہا کو نہیں دیا تھا۔

بہت سادگی سے شادی ہوئی تھی۔ مہندی وغیرہ کی کوئی رسم نہیں ہوئی تھی۔ خالہ نے شادی پر بہت قریبی عزیزوں کو بلایا تھا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی شادی پر گئی تھی۔ کیونکہ یہ میری امی کی ضد تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ مجھے کسی بات پر ماتم کرنے کے لئے گھر میں نہیں بیٹھنا چاہئے۔ اس طرح صرف دوسرے لوگ تماشا دیکھتے ہیں۔ میں دل پر جبر کرتے ہوئے اس کی شادی میں شریک ہوئی تھی۔

عمر حسن بے حد خوش تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی بھی اس کو اتنا خوش نہیں دیکھا۔ اس کا ہر قہقہہ میرے دل کا خون کر رہا تھا۔ اس کی بیوی خوبصورتی میں کسی طور پر بھی میرے مقابل نہیں آ سکتی تھی۔ وہ دلہن بن کر خوبصورت لگ رہی تھی اور میں اس دن دلہن نہ ہوتے ہوئے بھی بے تحاشا خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس رات شادی سے واپس آنے کے بعد میں کمرہ بند کر کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔ آئینہ کہہ رہا تھا میں بے حد خوبصورت ہوں اور آج تو قیامت ہی ڈھارہی ہوں۔

”لوگ کہتے ہیں میں خوبصورت ہوں اور لوگ جھوٹ نہیں بولتے۔ پھر بھی عمر حسن! تمہیں میرا حسن نظر کیوں نہیں آیا؟ اس کی کون سی چیز مجھ سے بہتر ہے؟ ہاتھیں، بال، ہونٹ، ناک، رنگت کسی چیز میں بھی تو وہ مجھ سے بہتر نہیں ہے پھر بھی تم نے اسی کو کیوں چنا؟ مجھے کیوں نہیں؟ اس نے تم پر کیا پڑھ کر پھونکا تھا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ کون سا مہتر ہے جو مجھے نہیں آتا۔ میں ساری دنیا کے لئے غلط ہو سکتی ہوں مگر خدا جانتا ہے۔ تمہیں تو میں نے دل سے چاہا تھا، کم از کم تمہارے لئے میری محبت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ پھر بھی عمر حسن! آخر تم مجھے کیوں نہیں ملے؟“

اس رات میں ایک بار پھر بلک بلک کر روئی تھی۔ میں اس رات سو ہی نہیں سکی۔

سمجھ رہی تھیں۔

”تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تمہارے لئے رشتوں کی کیا کمی ہے اور عمر میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ تمہارے لئے تو میں اس سے کئی گنا اچھا رشتہ ڈھونڈوں گی اور یہ اچھا ہی ہوا کہ ابھی میں نے اس سے تمہارا رشتہ طے نہیں کیا تھا ورنہ تم خود سوچو اگر کہیں بعد میں یہ سب پتا چلتا تو ہم کیا کرتے۔“

انہوں نے اگلے دن میری سوچی ہوئی آنکھیں دیکھ کر کہا تھا۔ میں نے بڑی خاموشی سے ان کی باتیں سنی تھیں اور اسی طرح انہیں دوسرے کان سے نکال دیا۔

”یہ محبت کو کیا سمجھتی ہوں گی۔ انہوں نے کبھی محبت کی ہوتی تو یہ جانتیں کہ کسی کو دل سے نکالنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔“ میں نے سوچا تھا۔



عمر کی شہا سے صرف نسبت طے نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک ماہ کے اندر اندر وہ بیاہ کر عمر کے گھر آ گئی۔ حالانکہ خالہ نے اس پر بہت شور مچایا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ پہلے وہ کم از کم دو بیٹیوں کی شادی کریں پھر عمر کی شادی ہو مگر شہا کے گھر والوں کو جلدی تھی اور عمر نے اپنی امی کو بس یہ کہہ کر چپ کر دیا تھا۔

”میں جانتا ہوں، میری تین بہنیں ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ غیر شادی شدہ ہیں لیکن میں نے کب ان کی ذمہ داری اٹھانے سے انکار کیا ہے۔ وہ اب بھی میری ذمہ داری ہیں شادی کے بعد بھی میری ذمہ داری رہیں گی اور اس سلسلے میں آپ کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ جہاں تک شہا کا تعلق ہے تو وہ کبھی بھی آپ کے لئے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرے گی۔ وہ میرے گھر کے بارے میں بھی جانتی ہے اور میری ذمہ داریوں کے بارے میں بھی لیکن اس کے والدین کو بھی ابھی دو بیٹیاں بیٹھی ہیں۔ شہا کی شادی کریں گے تو دوسری بیٹیوں کی شادی کر سکیں گے۔ ان کی بھی مجبوری ہے۔ آپ کو اگر یہ خدشہ ہے کہ بہت پیسہ خرچ کرنا پڑے گا تو اس کے بارے میں بھی پریشان نہ ہوں۔ بہت سادگی سے شادی کر دیں۔“

کسی دھوم دھام کی ضرورت نہیں ہے۔ جو روپیہ خرچ ہوگا، وہ میں خرچ کروں گا۔

آپ کو کوئی پریشانی اٹھانی نہیں پڑے گی۔“

خالہ نے بہت بہانے کرنے کی کوشش کی مگر ان کی ایک نہیں چلی تھی۔ انہیں اس کی شادی کی تاریخ طے کرنی پڑی تھی۔ چچا تمام معاملات میں عمر کا ساتھ دے رہے تھے، شاید اس

ایک آگ تھی جو میرے وجود کو جلانے لگی۔

”وہ ثناء کو کیوں لایا ہے؟ اسے اس سے محبت کیوں ہوئی ہے؟ آج وہ ہنس رہا تھا بے حد خوش تھا۔ پتا نہیں آج وہ اس سے کیا کیا وعدے کر رہا ہوگا؟ وہ سب باتیں جو میں اپنے لئے اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی آج وہ اس سے کہہ رہا ہوگا اور اسے احساس بھی نہیں ہے کہ اس نے مجھے تباہ کر دیا ہے۔ برباد کر دیا ہے۔“

میں جلتے پیروں کی بلی کی طرح کمرے کے چکر کاٹی رہی۔

”کاش ثناء مر جائے کاش وہ آج ہی مر جائے۔“ میں جو بددعا اسے دے سکتی تھی

میں نے دی تھی۔

مگر جس کی دعا میں اثر نہیں ہوتا، اس کی بددعا میں کیا اثر ہوگا، قیامت تو صرف وہی تھی جو مجھ پر گزر گئی تھی۔ دوسروں کے لئے تو دنیا بھی باقی تھی اور ثناء اور عمر کے لئے تو زندگی شاید اب ہی شروع ہوئی تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی لیکن عمر حسن سے میری محبت میں کمی آنے کے بجائے اور شدت آگئی تھی۔ جتنی شدت سے میں اس سے محبت کرتی تھی۔ اتنی ہی شدت سے میں ثناء سے نفرت کرتی تھی۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ جب عمر کی شادی ہو جائے گی پھر میں کبھی خالہ کے گھر نہیں جاؤں گی۔ لیکن میں اپنے اس فیصلے پر قائم نہیں رہ سکی۔ میں اس کی شادی کے بعد بھی اس کے گھر پہلے ہی کی طرح جاتی رہی، بلکہ شاید پہلے سے بھی زیادہ اور خالہ پہلے سے بھی زیادہ میری خاطر مدارت کرتی تھیں۔ ثناء کے ساتھ ان کا رویہ بے حد روکھا اور خشک ہوتا تھا اور مجھے بہت اچھا لگتا تھا ان کی یہ کڑوی باتیں سن کر۔

شروع میں میرے ساتھ بھی ثناء کا رویہ بے حد گرم جوش تھا لیکن میں اس سے زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ اگر کبھی مجھے کوئی چیز کھانے کے لئے لاکر دیتی تو میں اسے ہاتھ تک نہ لگاتی۔ وہ مجھ سے کوئی بات پوچھتی تو میں اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے خالہ کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو جاتی۔

وہ میرے پاس بیٹھی رہتی اور میں ایک بار بھی اس کی طرف دیکھنا پسند نہ کرتی۔ رفتہ رفتہ اسے میری ناپسندیدگی کا احساس ہو گیا تھا اور اس نے خود ہی میرے پاس بیٹھنا ختم کر دیا۔ اب میرے جانے پر وہ پہلے کی طرح میرا حال بھی نہیں پوچھتی تھی اور میں یہی چاہتی تھی۔ اس نے عمر حسن کو مجھ سے چھینا تھا اور یہ نقصان اتنا بڑا تھا کہ میں کسی صورت بھی اسے معاف کرنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ اگر عمر حسن کی زندگی میں نہ آتی تو یہ میں تھی، جسے وہ چاہتا۔ جو اس گھر میں ہوتی مگر اس نے عمر حسن پر ایسا جادو کیا تھا کہ وہ اس کا ہو گیا۔

کبھی جب میں شام کو خالہ کے گھر جاتی تو وہ سج سنور کر پھر رہی ہوتی میری آنکھیں دھواں دھواں ہونے لگتیں۔ میرا دل چاہتا، میں اس کے بال نوچوں، اس کے کپڑے پھاڑوں۔ اس کا چہرہ اپنے ناخنوں سے بگاڑ دوں۔

”اور کتنے حربے آزمائے گی تو چڑیل! اور کتنے حربے آزمائے گی۔ اس کی دل میں تو پہلے ہی بسی ہے، اب یہ چلتر کس لیے کر رہی ہے۔“

میرا دل چلا تا میری سانس تیز ہو جاتی اور میں رکنے بغیر خالہ سے باتیں کرتی رہتی اور میں کیا کرتی۔



ثناء سے نفرت میں، میں اکیلی نہیں تھی۔ خالہ مجھ سے بھی زیادہ نفرت کرتی تھیں اور وہ اپنی باتوں سے اس کا اظہار بھی کرتی رہتی تھیں جو شاید میں نہیں کر سکتی تھی۔ انہوں نے شروع سے ہی ثناء سے کسی التفات کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ اپنی باتوں کے ذریعے انہوں نے اس گھر میں اس کی حیثیت سے اسے آگاہ کر دیا تھا۔ ثناء کو اس کے ماں باپ نے بہت اچھا جہیز دیا تھا ضرورت کی کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو انہوں نے نہ دی ہو لیکن خالہ نے پھر بھی جہیز پر بہت سے اعتراضات کیے تھے اور نقص نکالے تھے۔

لیکن عمر شاید پہلے ہی ثناء کو خالہ کے روپے کے ہارے میں آگاہ کر چکا تھا۔ اس لیے خالہ کسی بھی طعنے اور بات پر وہ ناراض ہوتی نہ کچھ کہتی بلکہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی جاتی اور میرے اور خالہ کے غصے میں اور اضافہ ہو جاتا تھا کیونکہ ہماری خواہش ہوتی تھی کہ وہ جواب میں کچھ کہے، اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرے اور بات بڑھے لیکن وہ کبھی اس کا موقع نہیں دیتی تھی۔

”یہ بڑھی لکھی لڑکیاں بڑی میسنی اور گھنی ہوتی ہیں۔ بڑے فریب آتے ہیں انہیں۔ یہ ابھی تو آپ کے سامنے معصوموں کی طرح منہ بند کر کے پھرتی ہے مگر بعد میں ضرور عمر کو سب کچھ بتاتی ہوگی۔“

میں ہر دفعہ خالہ کے گھر جانے پر ان کے کان میں کچھ نہ کچھ ضرور انڈیل کر آتی۔ خالہ کو میری ہر بات پر یقین آ جاتا اور ثناء سے ان کی نفرت اور بڑھ جاتی۔



ثناء کی عادتیں اور مزاج بے حد عجیب تھا۔ وہ بے حد ٹھنڈے مزاج کی مالک تھی۔ وہ ایک بڑے گھر سے چھوٹے گھر میں آئی تھی لیکن پھر بھی اس میں نہ خزا نہ غرور اور نہ ہی

اسے کسی بات پر شکوہ ہوتا تھا۔ وہ خاموشی سے خالہ کی باتیں سنتی اور کسی رد عمل کا اظہار نہ کرتی۔ شادی کے کچھ ہی عرصہ کے بعد خالہ نے اسے گھر کے کاموں پر لگا دیا تھا۔ اس نے گھر کا کام کرنا شروع کر دیا تھا لیکن وہ صرف ایک وقت کا کھانا پکاتی تھی، برتن اور کچن صاف کرتی تھی اور صحن اور ڈرائنگ روم کی ذمہ داری اس نے اپنے سر لی تھی۔ خالہ کی لاکھ چیخ و پکار اور نندوں کے بسورے ہوئے چہروں کے باوجود اس نے پورے گھر کی ذمہ داری نہیں لی تھی۔ وہ خالہ کی باتیں سن لیتی تھی لیکن پھر بھی کام وہ صرف اتنا ہی کرتی تھی جتنا اس نے کہا تھا۔

خالہ کو اس پر بے حد طیش آتا تھا ایک ہفتہ تک وہ عمر کے کان بھی کھاتی رہیں کہ ثناء گھر کے کام میں دلچسپی نہیں لیتی لیکن اس کے پاس ایک ہی جواب تھا۔

”امی! میں اسے نوکرائی بنا کر نہیں لایا ہوں۔ وہ اس گھر کی ایک فرد ہے۔ جتنا کام اسما، زیب اور یاسمین کرتی ہیں، اتنا ہی کام وہ کرتی ہے۔ ظاہر ہے وہ ان سے زیادہ تو نہیں کر سکتی۔ پھر آپ کو کس بات پر اعتراض ہے۔ اب اگر وہ سب لوگوں کے کپڑے نہیں دھوتی تو ٹھیک ہے۔ وہ اپنے اور میرے کپڑے دھو لیتی ہے۔ آپ کے اور ابو کے بھی دھوسکتی ہے لیکن باقی لوگ اپنی ذمہ داری خود اٹھا سکتے ہیں۔ اور مجھے تو اس سے یہ کہتے ہوئے بھی شرم آئے گی کہ وہ میری بہنوں اور بھائی کے کپڑے دھوئے۔“

وہ بڑے اطمینان سے کہہ دیتا اور خالہ کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ مگر عمر پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ بھی ثناء کی طرح امی کی باتیں سنتا اور چپ رہتا۔

امی ان دنوں بڑے زور و شور سے میرے لیے رشتہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ بعض رشتے انہیں کسی نہ کسی وجہ سے پسند نہ آتے اور جو انہیں پسند آتے، انہیں میں ٹھکرا دیتی۔ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی کیونکہ جو جگہ میں عمر حسن کو دے چکی تھی وہ اب کسی اور کو نہیں دے سکتی تھی۔ مگر میں یہ بات ان سے نہیں کہہ سکتی تھی ہاں جو کام میں کر سکتی تھی، وہ کر رہی تھی۔

خالہ نے اسما کی شادی طے کر دی تھی۔ اس کی شادی عمر جنتی سادگی سے تو نہیں ہوئی تھی مگر زیادہ دھوم دھڑکے سے بھی نہیں ہوئی۔ خالہ نے اپنے زیورات کا ایک حصہ اسے دے دیا تھا کچھ چیزیں اس کے جہیز کے لیے خالہ نے پہلے سے تیار کر کے رکھی ہوئی تھیں۔ باقی چیزوں کا انتظام عمر نے کیا تھا۔ خالہ نے بھی ضرورت کی ہر چیز اسما کو دی تھی بلکہ بعض غیر ضروری چیزیں بھی۔ عمر نے دبی زبان سے اس پر اعتراض کیا تھا مگر خالہ نے اسے آڑے

ہاتھوں لیا۔ وہ یہ سارے اخراجات ضد میں کر رہی تھیں۔

”اگر اپنی شادی کے لیے تمہارے پاس پیسہ آسکتا ہے تو کیا بہن کے لیے نہیں آسکتا۔ اس وقت تو بڑا کہہ رہے تھے کہ ہر ذمہ داری پوری کروں گا اب کیا بیوی کی نصیحتیں یاد آنے لگی ہیں۔“

عمر کا چہرہ ان کی بات پر سرخ ہو گیا مگر وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ میں تب خالہ کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی اور چچا اور زیب بھی پاس ہی تھے۔ خالہ اس کے جانے کے بعد بھی بڑ بڑاتی رہیں عمر نے اس کے بعد دوبارہ کسی چیز پر اعتراض نہیں کیا تھا وہ بس خاموشی سے خالہ کے احکامات سرانجام دیتا رہا۔ خالہ نے جہیز پر کافی روپے خرچ کر دیے تھے مگر انہیں اس لیے اس کا زیادہ احساس نہیں ہوا کیونکہ انہوں نے اپنے پاس سے بہت کم روپے خرچ کئے تھے۔ کچھ رقم چھانے دی تھی جبکہ باقی ساری رقم عمر نے دی تھی۔

اسما کی شادی کے تین ماہ بعد ہی عمر کے ایک دوست کی معرفت زیب کا رشتہ بھی طے ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کو بھی شادی کی جلدی تھی۔ ایک بار پھر خالہ نے اسما کی شادی کی طرح زیب کی شادی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ عمر نے پہلے کی طرح خالہ کو کچھ رقم دی تھی مگر خالہ کے لیے وہ رقم بہت کم ثابت ہوئی۔ انہوں نے تین ماہ سے اور رقم مانگ لی۔ اس نے بڑی خاموشی سے ان کا مطالبہ پورا کر دیا۔ زیب کی شادی میں، میں نے ثناء کو سنے زیورات پہنے ہوئے دیکھا تھا اور میں نے خالہ کی توجہ بھی اس طرف مبذول کروائی تھی۔

”ہاں، بیوی کو عیاشی نہیں کر دئے گا تو کیا ماں بہنوں کو کر دئے گا۔ بیوی کے لیے نیا سیٹ بھی بن گیا ہے۔ چوڑیاں بھی بن گئی ہیں اور اسے اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ بہن کو ایک انگلی ہی ڈال دیتا۔ میں نے ہی اپنا زیور اسے دیا ہے اور پھر ثناء کے پاس زیور کی کون سی کمی تھی۔ تین سیٹ اور بارہ چوڑیاں تو اسے اپنے میکے سے ملے تھے اور ایک سیٹ ہماری طرف سے دیا گیا تھا پھر بھی دیکھو، اس نواب زادے کو کیسے چپ چپاتے بیوی کو زیور لے کر دے دیا ہے۔“

خالہ کافی ناراض تھیں اور زیب کی رخصتی کے فوراً بعد انہوں نے سب کے سامنے ہی عمر سے اس ناراضگی کا اظہار کر دیا تھا۔ ثناء خاموشی سے اٹھ کر اندر چلی گئی جبکہ وہ سر جھکائے بیٹھا رہا لیکن اس کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں تھے۔ جب خالہ کی ڈانٹ ڈپٹ اور طعنے زیادہ ہو گئے تو وہ بھی اٹھ کر اندر چلا گیا تھا۔ خالہ کی ناراضگی میں اور اضافہ ہو گیا۔

عمر کی شادی کو ڈیڑھ سال ہو رہا تھا لیکن ابھی تک ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ان دونوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے انہیں اس کی زیادہ پرواہ ہے بھی نہیں۔ جب بھی خالہ کبھی پوتے پوتیوں کا ذکر چھیڑتیں اور ثناء کو کچھ کہتیں تو وہ تو چپ رہتی لیکن عمر اس ذکر کو بڑی لاپرواہی سے نال دیتا۔

بعض دفعہ مجھے ثناء ایک جادوگرنی کی طرح لگتی تھی۔ اس نے پتا نہیں عمر پر کیا منتر پھونکا ہوا تھا کہ اس کی کوئی کمزوری عمر کو نظر آتی ہی نہ تھی۔ وہ خالہ کی باتوں پر کان دھرتا تھا نہ گھروالوں کی شکایتوں پر اور اس کی عادت نے میرے حسد کو اور بھڑکا دیا تھا۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ اس کا کاروبار بڑھنے کے بجائے گھٹتا ہی گیا تھا۔ باہر سے ایک سپورٹ کے آرڈر ملنا پہلے سے کم ہوئے اور پھر آہستہ آہستہ بند ہی ہو گئے۔ ان دنوں میں جب بھی خالہ کے گھر جاتی، ان کے ہونٹوں پر کاروبار کا ہی ذکر ہوتا۔

”اچھا بھلا کام چل رہا تھا۔ مگر جب سے یہ تڑپیل گھر میں آئی ہے آہستہ آہستہ کاروبار ختم ہی ہو گیا ہے۔“

وہ اب بلند آواز سے ثناء کو کوسنے دیا کرتی تھیں اور تب پہلی بار میں نے اسے پریشانی میں دیکھا اور یہ احساس میرے دل کو بے حد تقویت پہنچا رہا تھا کہ اب وہ تکلیف میں وقت گزارے گی۔ اب وہ لڑے گی، چیخے گی، چلائے گی۔ آخر وہ انسان تھی اور پچھلے ڈیڑھ سال سے وہ عیش ہی تو کر رہی تھی۔ مجھے عمر حسن سے ہمدردی تھی۔ اگر یہ حالت ثناء سے شادی سے پہلے ہوتی تو میں اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کر دیتی۔ میں اپنے ابو کو مجبور کرتی کہ وہ اس کی مدد کریں، لیکن اب نہیں۔ اب میں اس کی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ اب میں اسے بھی تکلیف میں دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے بھی تو پتا چلنا چاہیے تھا کہ جب مٹھی میں جکڑی ہوئی چیزیں پھسل جاتی ہیں اور لاکھ کوشش کرنے کے باوجود ہاتھ میں نہیں آتیں تو کیسا لگتا ہے۔

اس کو بھی معلوم ہونا چاہیے تھا کہ جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہو اور وہ آپ کے پاس نہ رہے تو کیا ہوتا ہے۔ میں ان کے گھر جاتی رہتی تھی۔ میں چہرے دکھتی رہتی تھی۔ پہلے وہ بہت مصروف ہوتا تھا اور بہت کم ہی گھر پر نظر آتا تھا مگر اب وہ اکثر گھر پر نظر آیا کرتا تھا۔ پچھلے کئی سالوں سے اس کے چہرے پر جو رونق رہتی تھی، وہ غائب ہونے لگی تھی۔ میں جانتی تھی وہ پریشان ہے اور بعض دفعہ میرا دل چاہتا، میں بھاگ کر اس کے پاس جاؤں اور کہوں۔

”مجھے بتاؤ۔ تمہیں کیا چاہیے تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے، مگر تم مسکراؤ۔“

مگر پھر وہ آجاتی، ہمیشہ کی طرح اور میرے سارے جذبات پھک سے اڑ جاتے۔

ان دنوں خالہ بھی بہت پریشان تھیں اور وہ اپنی پریشانی کا اظہار وقتاً فوقتاً جھگڑوں سے کرتی رہتی تھیں۔ ان جھگڑوں کا نشانہ ثناء بنتی اور اب تو خالہ، عمر کو بھی طعنے دینے لگی تھیں۔ وہ اسے کئی دفعہ بہت غصے سے کہتیں کہ ”گھر چلانا اب اس کی ذمہ داری ہے اور وہ محنت کرنے کے بجائے کام چوروں کی طرح ادھر ادھر پھر کر شام کو گھر آ جاتا ہے۔ اسے فکر ہی نہیں ہے کہ گھر میں کچھ پکانے کے لیے ہے یا نہیں اور گھر کا خرچ کہاں سے چل رہا ہے۔“

بعض دفعہ خالہ میرے سامنے ہی یہ سب کچھ کہتیں اور وہ سرخ چہرے کے ساتھ وہاں سے چلا جاتا اگر ثناء وہاں ہوتی تو مجھے خالہ کی یہ ڈانٹ پھنکار بہت اچھی لگتی اگر وہ نہ ہوتی تو مجھے اس پر بے اختیار ترس آتا۔ وہ چند ماہ سے خالہ کو گھر کے خرچ کے لیے پیسے نہیں دے رہا تھا اور خالہ کو چچا کی پشٹن میں ہی گزارا کرنا پڑ رہا تھا اور وہ رقم اتنی زیادہ نہیں ہوتی تھی کہ با آسانی گھر کا خرچ چلایا جاسکے۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ ان کے پاس کیا ہوتا ہے یا کیا نہیں۔ میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ثناء کے صبر کا پیمانہ کب لبریز ہوتا ہے یا عمر کب ان حالات سے تنگ آ کر فرسٹریشن کا شکار ہوتا ہے اور اس سے جھگڑنا شروع کرتا ہے۔

مگر ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دونوں بہت بڑے فریبی تھے۔ یا پھر شاید ایکسٹریٹ۔ انہیں اپنے جذبات چھپانا بہت اچھی طرح آتا تھا اور پتا نہیں انہیں ایک دوسرے کے وجود سے الجھن کیوں نہیں ہوتی تھی۔ مجھے ثناء پر زیادہ حیرت ہوتی تھی۔ آخر عمر میں تھا ہی کیا جو اس نے اس کا انتخاب کیا اور اب کیا رہا تھا جو وہ اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔

وہ گھر کا خرچ نہیں چلا پارہا تھا تو اسے کیا دینا ہوگا اسے وحشت نہیں ہوتی ہوگی اس گھر کے ماحول سے۔ اسے چلے جانا چاہیے وہاں سے۔ میں نے سوچا اور سوچتی ہی رہی۔ مگر پتا نہیں وہ کس مٹی سے بنی تھی۔ گھر چھوڑ کر جانے کے بجائے ایک دن مجھے پتا چلا کہ اس نے کہیں جا ب کر لی ہے۔ ہمارے خاندان میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ کسی نے جا ب کی ہو۔

خالہ نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ انہوں نے عمر کو ہر طعنہ دے ڈالا اور یہ صرف ایک دن نہیں ہوتا تھا۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ وہ جب بھی ان کے سامنے آتا وہ اسے طعنے دیتیں بعض دفعہ مجھے اس پر بے حد رحم آتا مگر خالہ کو رحم نہیں آتا تھا عمر نے سب کچھ سننے کے باوجود ثناء کو نوکری سے نہیں روکا تھا۔

مجھے ذاتی طور پر ثناء کی جا ب پر بے حد خوشی ہوئی تھی۔ یہ پہلا ایسا قدم تھا جو چھٹکارے کی طرف تھا۔ میں جانتی تھی کام کرنے والی عورتیں زیادہ دیر تک ٹھنڈو شوہر برداشت نہیں کرتیں اور عمر کے پاس اب کچھ بھی نہیں تھا اس کا دفتر تقریباً بند ہو چکا تھا اور ان دنوں وہ

خود جاب کی تلاش میں رہنے لگا تھا شہاء کے نوکری کرنے سے یہ ہوا کہ عمر نے ایک بار پھر سے گھر میں خرچ کے لیے پیسے دینا شروع کر دیئے۔

ظاہر ہے کہ پیسے شہاء کی تنخواہ کے ہی ہوتے تھے اور خالہ ان دونوں کو درجنوں طعنے اور گالیاں دینے کے باوجود بھی وہ پیسے لے لیتی تھیں۔ انہیں پتا تھا کہ صرف پنشن سے گھر نہیں چل سکتا۔ چچا نے بھی ایک پارٹ ٹائم جاب ڈھونڈ لی تھی اور کم از کم یہ ضرور ہو گیا تھا کہ اب خالہ ہر دوسرے چوتھے روز امی کے پاس ادھار مانگنے نہیں آیا کرتی تھی کچھ وقت اور اسی طرح گزر گیا تھا میری امیدیں ابھی بھی قائم تھیں۔

”یہ رشتہ ختم ہو جائے گا رہنے والا نہیں ہے۔ بس دیکھو کہ اور کتنا وقت لگتا ہے۔“

میں خود کو تسلیاں دیتی رہتی اس کے علاوہ ان دنوں میرے پاس کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔



اس دن بھی میں خالہ کے گھر تھی، جب شہاء کی دو فرینڈز اس سے ملنے آئی تھیں۔ وہ ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی جب اچانک خالہ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں جا کر ان کی باتیں سنوں اور انہیں بتاؤں کہ وہ اپنی فرینڈز سے کیا کہہ رہی ہے۔ اس سے پہلے خالہ اکثر یاسمین کے ذریعے اس پر نظر رکھتی مگر اس دن یاسمین گھر پر نہیں تھی سو خالہ نے یہ کام مجھے سونپ دیا۔ ایک عجیب سی سنسنی میرے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ میں زندگی میں پہلی دفعہ یہ کام کر رہی تھی مگر پھر بھی ایک عجیب سا جوش تھا میرے اندر۔ دھڑکتے دل اور دبے قدموں سے میں ڈرائنگ روم کی اس کھڑکی کے پاس کان لگا کر کھڑی ہو گئی جو گھر کے دائیں طرف والی گلی میں کھلتی تھی۔ مجھے کافی احتیاط سے وہاں جانا پڑا تھا کیونکہ گلی کافی تنگ تھی اور جا بجا کھلے رکھے ہوئے تھے جن میں پتھری لگائی گئی تھی۔ پھر کچھ لکڑی کا پرانا فرنیچر بھی وہاں پڑا ہوا تھا۔ بہر حال بہت احتیاط سے سب چیزوں سے بچتی بچاتی میں کھڑکی کے پاس پہنچ ہی گئی۔

اندر سے آوازیں صاف آرہی تھیں، کیونکہ کھڑکی کے پردے ہٹے ہوئے تھے میں نے کھڑکی کے سامنے آ کر اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اس طرح کوئی بھی مجھے دیکھ سکتا تھا، بس کھڑکی کے ایک طرف کھڑے ہو کر کان اندر لگا دیئے۔

”دل کیوں نہیں چاہتا؟ چاہتا ہے دل، لیکن اب کیا کیا جاسکتا ہے۔ ساری زندگی دل کی خواہشوں کے تحت تو نہیں گزارا جاسکتی۔ کچھ برداشت، کچھ صبر بھی کرنا پڑتا ہے اور میں آج کل وہی کر رہی ہوں اور راجو! یقین کرو میں ناخوش نہیں ہوں۔“

میں نے شہاء کی آواز پہچان لی تھی۔ وہ کسی چیز کے بارے میں بات کر رہی تھی۔
”پھر بھی شہاء! گھر چلانا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے یہ عمر کی ذمہ داری ہے یا تمہارے سسرال والوں کی۔ تمہاری نہیں۔“

اس کی دوستوں میں سے کسی نے کہا تھا میں بڑے غور سے اس کا جواب سننے لگی۔
”ذمہ داری کا یہی تو مسئلہ ہوتا ہے کہ اسے کوئی اپنے سر پر لینے پر تیار نہیں ہوتا۔ دیکھو راجو! یہ تعلیم میں نے اس لیے حاصل کی تھی کہ اگر کبھی ضرورت پڑے تو اسے استعمال کروں اور اب مجھے اس کا استعمال کرنا پڑ رہا ہے۔ عمر ایسا بندہ نہیں ہے جو اپنی ذمہ داریاں دوسروں کے کندھوں پر ڈال کر خوش ہونے ہی وہ کوئی کام چور قسم کا آدی ہے۔ لیکن پراہم یہ ہے کہ ابھی اس کا بزنس تقریباً ختم ہو گیا ہے اور اچھی جاب کوئی ہے نہیں، اور میں خود بھی نہیں چاہتی کہ وہ کوئی جاب کرے اگر اس نے جاب کرنی شروع کر دی تو پھر بزنس تو اسے چھوڑنا ہی پڑے گا۔ اتنی محنت سے جو اس نے ایک فرم، ایک آفس بنایا ہو سکتا ہے وہ دوبارہ کبھی نہ بنا سکے بزنس میں اچھا برا وقت تو آتا ہی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ برا وقت بھی تھوڑے عرصے کے لیے ہی ہو اس لیے میں نہیں چاہتی کہ وہ صرف گھر کا خرچ چلانے کے لیے جاب کرنے پر مجبور ہو جائے۔ برا وقت اگر مل کر گزار لیں گے تو پھر ہمارا رشتہ اتنا مضبوط ہو جائے گا کہ کوئی چیز اس پر اثر انداز نہیں ہو سکے گی۔“

مجھے اس کی باتوں سے جلن ہونے لگی تھی وہ ابھی بھی ناامید نہیں تھی۔

”اور بچوں کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ کیا اپنا خاندان بڑھانا نہیں ہے؟“ اس

دفعہ ایک دوسری آواز نے پوچھا تھا۔

”دیکھو سعدیہ! ابھی بیچے پیدا کر کے کیا کرنا ہے بچوں کے لیے ابھی ہمارے پاس ہے کیا۔ انہیں تو کم از کم اس طرح نہیں رکھ سکتے جس طرح ہم رہ رہے ہیں۔ پھر انہیں ابھی پیدا کرنے کا کیا فائدہ؟ ویسے بھی عمر بالکل نہیں چاہتا کہ ابھی کوئی بچہ پیدا ہو اور جب وہ ہی نہیں چاہتا تو پھر ظاہر ہے مجھے کس بات کی جلدی ہے۔“

”پھر بھی شہاء! تمہاری شادی کو دو سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے کیا تمہارے سسرال والے کوئی اعتراض نہیں کرتے؟“

”کرتے ہیں، میری ساس طعنے وغیرہ بھی دیتی ہیں، مگر دونوں اس کے بارے میں پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہیں، اس لیے نہ میں پرواہ کرتی ہوں نہ عمر اور جب عمر کو پرواہ نہیں ہے تو پھر ظاہر ہے میں کیوں پریشان ہوں گی۔“

”تم بہت ایثار کر رہی ہو عمر کے لئے۔ عورت کو عام طور پر ایسے ایثار رس نہیں آتے۔ تمہارا یہ ایثار، یہ قربانیاں وہ کب تک یاد رکھے گا مرد کی یادداشت بڑی کمزور ہوتی ہے ان معاملات میں اور کیا عمر مختلف ہو سکتا ہے۔“

”بالکل یاد رکھے گا۔ کیوں نہیں یاد رکھے گا میں یہ بالکل نہیں مانتی کہ مرد کے لئے قربانی دی جائے اور وہ اسے بھول جائے۔ اس کا کوئی صلہ نہ دے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو بندہ آپ کا شوہر ہو۔ آپ سے محبت کرتا ہو۔ آپ اس کے لئے کچھ کریں تو وہ اسے بھلا دے۔ اس کے نزدیک اس کی کوئی وقعت ہی نہ ہو اور پھر ہم دونوں میں تو ذہنی ہم آہنگی ہے، ہمیں تو اپنی باتیں ایک دوسرے تک پہنچانے کے لئے بعض دفعہ الفاظ کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ کم از کم عمر حسن وہ واحد شخص ہے جس کے بارے میں، میں کہہ سکتی ہوں کہ وہ احسان فراموش نہیں ہے اس کے لئے کچھ کیا جائے تو وہ اس سے بڑھ کر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔“

”مگر ابھی تک تو تم ہی اس کے لئے کچھ نہ کچھ کئے جا رہی ہو پہلے تم نے اس کی بہن کی شادی پر اپنا زیور بیچ کر روپے اسے دے دیئے پھر یہ جا ب.....“

میں اس کی دوست کی بات پر چونک پڑی تھی۔ ثناء نے اپنی دوست کو بات مکمل نہیں کرنے دی۔

”دیکھو راجا! زیور بیچنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے ان چیزوں کا شوق نہیں ہے۔ پھر میں نے اپنی مرضی سے اس کی مدد کی تھی اس نے مجھ سے نہیں کہا تھا۔ زیور کون سی چیز ہے جس کے بغیر رہنا نہ جاسکے شادی بیاہ پر ہی پہنا جاتا ہے اور وہ کسی سے بھی لے کر پہنا جاسکتا ہے جیسے میں اپنی امی سے لے کر بہن لیتی ہوں۔ جب اس گھر میں آگئی ہوں تو اس گھر کی ہر ذمہ داری کو شہیر کرنا بھی میرا فرض ہے۔ پھر اس کی بہن اور میری بہن میں کیا فرق تھا۔ میں اتنی معمولی چیزوں کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان نہیں ہوتی۔ اس کے پاس جب روپیہ آئے تو دیکھ لینا، وہ مجھے کیا کیا دے گا۔“

اس کے لہجے میں ایک عجیب سا یقین تھا اور یہ یقین مجھے سانپ کی طرح ڈس رہا تھا۔ یہ کس مٹی سے بنی ہوئی ہے کہ اس کے گمان کبھی غلط ہوتے ہی نہیں۔ اس کا یقین کبھی ختم نہیں ہوتا۔

”عمر حسن نہ کبھی تمہارا رہے گا نہ تمہارے لئے کچھ کرے گا۔ وہ پہلے بھی میرا تھا اور اب بھی میرا ہے، وہ کل بھی میرا ہی رہے گا۔ میں دیکھوں گی تم کب تک اس کے دل میں بسی

رہو گی۔“ میں اندر ہی اندر چلا رہی تھی۔

پھر میں زیادہ دیر تک وہاں کھڑی نہیں رہ سکی۔ میں وہاں سے خالہ کے پاس آگئی تھی۔ انہوں نے مجھ سے ان کی گفتگو کے بارے میں پوچھا تھا اور میرے دل میں جو آیا، میں نے گھڑ کر خالہ کو بتا دیا۔ ان کا طیش بڑھتا ہی گیا تھا۔ میں وہاں سے آگئی تھی۔ اس شام عمر کے آنے پر خالہ نے گھر میں تماشا کھڑا کر دیا انہوں نے دونوں کو کھری کھری سناٹی تھیں۔ ثناء نے بہت انکار کیا تھا کہ اس نے اپنی فرینڈز سے خالہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی مگر خالہ نے ایک نہیں سنی۔ انہیں مجھ پر بلا کا یقین تھا مجھے خالہ کے اس کارنامے کی تفصیل اگلے دن معلوم ہوئی تھی اور میرا دل باغ باغ ہو گیا۔



دن اسی طرح گزرتے جا رہے تھے۔ عمر کے برس میں کوئی اضافہ نہیں ہو رہا تھا اس نے کوئی پارٹ ٹائم جاب بھی کر لی تھی۔ ان کے گھریلو ماحول میں ویسے ہی تاؤ تھا۔ خالہ ہر بات کا ذمہ دار ثناء کو ٹھہراتی تھیں وہ اسے منحوس کہنے لگی تھیں۔ میں مانتی ہوں، یہ میں ہی تھی، جس نے ثناء کے معاملے میں خالہ کی پوری برین واشنگ کر دی تھی اگر میں خالہ کے گھر میں اتنی آمد و رفت نہ رکھتی تو شاید خالہ کو ثناء کی کوئی اچھائی بھی نظر آ جاتی۔ شاید وہ ان کے دل میں کچھ جگہ بنا ہی لیتی۔ لیکن میں نے ایسا نہیں ہونے دیا تھا بڑی ہوشیاری سے میں نے ان کے دل میں نفرت کا بیج بویا تھا اور پھر اسے مسلسل پانی دیتی رہی یہاں تک کہ وہ ایک تناور درخت بن گیا تھا، ایسا تناور درخت جسے کاٹنا اب ثناء اور عمر کے بس کا کام نہیں رہا تھا۔ شاید اب میں بھی چاہتی تو اس درخت کو گرا نہیں سکتی تھی لیکن میں اسے گرانا چاہتی بھی نہیں تھی۔ اس کے سائے تلے تو مجھے بیٹھنا تھا۔

ان دنوں خالہ نے ان دونوں کا جینا دو بھر کر دیا تھا۔ ثناء آفس سے گھر آتی اور کسی نہ کسی بات پر خالہ کوئی ہنگامہ شروع کر دیتیں۔ میں بعض دفعہ اس کی برداشت پر حیران ہوتی تھی اس میں صبر کا مادہ میری توقع سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ وہ خالہ کی باتیں سرخ چہرے کے ساتھ سنتی رہتی بعض دفعہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے مگر وہ پھر بھی چپ ہی رہتی تھی۔

پھر جب رات کو عمر گھر آتا تو خالہ نے پھر کوئی تماشا تیار رکھا ہوتا۔ وہ بلند آواز سے بولتی جاتیں۔ اپنی قسمت کے رونے روئیں۔ ثناء کو گالیاں دیتیں۔ عمر کو بیوی کی کمائی کھانے اور اس کے غلام بن جانے کے طعنے دیتیں۔ لوگوں کے بیٹوں کی فرمانبرداری، محنت اور کاروبار میں ترقیوں کے قصے سناتیں اور پھر رونا شروع کر دیتیں۔ جب میں وہاں ہوتی تو میں انہیں

تسلی دینے لگتی۔

عمر زرد چہرے کے ساتھ سر جھکائے یہ سب سنتا اور پھر باہر نکل جاتا۔ میرا دل کٹنے لگا۔ ”میں اسے تو کوئی تکلیف دینا نہیں چاہتی۔“ میں سوچتی اور صرف سوچتی اگلی بار پھر کچھ ایسی ہی بات ہوتی، پھر وہی جھگڑا، وہی ہنگامہ، وہی تماشا اور وہی خاموشی۔



پھر ایک دن پتا چلا کہ عمر نے چچا سے ان کی گرجبئی کی رقم مانگی ہے تاکہ وہ اپنے کاروبار میں لگا سکے۔ چچا نے صاف انکار کر دیا تھا۔

”ہم لوگوں نے اس سے کہہ دیا کہ اب اسے کوئی رقم نہیں دے سکتے۔ آخر اسے پہلے بھی تو بزنس شروع کرنے کے لئے روپے دیئے تھے ان سے اس نے کون سا تیر مار لیا جو اب وہ اور چاہتا ہے۔ پھر ہماری باقی اولاد بھی ہے، ان کا حق ہم کیوں ماریں۔ جو تو ہوا بہت روپیہ ہے، وہ یہی تو ہے۔ اس سے یا سبین کی شادی کرنی ہے اور انہر کو بھی کوئی کاروبار کروانا ہے۔ دیئے بھی وہ اب شادی شدہ ہے اسے پیسے کی ضرورت ہے تو اپنے سسرال والوں سے مانگے۔ سب لوگ مانگتے ہیں۔ ہم نے اس کا کوئی ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔“

خالہ نے میری امی کو بتایا مجھے خالہ کی بات پر خوشی ہوئی تھی۔

”اچھا ہے بیوی سے مانگے، اس سے کہے، وہ لا کر دے۔ آخر اور بھی تو لڑکیاں اپنے میکے سے ضرورت کے وقت رقم لا کر دیتی ہیں، وہ کیوں نہیں دے سکتی۔“

میں نے خالہ سے کہا تھا خالہ میری بات پر ثناء کے خلاف تقریر کرنے لگی تھیں۔ مجھے ان کی تقریر میں دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے دلچسپی تھی تو صرف اس بات میں کہ عمر کاروبار کیا ہوگا اور اس کی خاموشی آخر کار ٹوٹ ہی گئی تھی۔

خالہ کی اس تجویز پر بلا کا ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ اسے ان سے جو جو شکایتیں تھیں، وہ اس دن اس نے کر دی تھیں۔ ان کے روپے کے بارے میں، ان کی باتوں کے بارے میں، ان کی سوچ کے بارے میں، ثناء سے ان کے سلوک کے بارے میں، پچھلے دو اڑھائی سال کا غبار آخر باہر آ ہی گیا تھا۔

جواب میں خالہ بھی چپ نہیں رہی تھیں۔ انہوں نے اسے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ وہاں خوش نہیں تو بیوی کو لے کر چلا جائے۔

لیکن وہ نہیں گیا تھا۔ وہ نہیں جائے گا یہ بات خالہ بھی جانتی تھیں کہیں جانے کے لئے کہیں رہنے کے لئے روپے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے پاس کیا تھا۔ لیکن یہ ضرور ہوا

کہ اس کا دل خالہ کی طرف سے اور بدگمان ہو گیا میں ہر بات پر غور کرتی رہتی تھی پھر اس کے مطابق اپنے مہرے آگے بڑھاتی تھی۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا لیکن مجھے لگنے لگا کہ ثناء مجھے بے حد ناپسند کرتی ہے شاید اسے شک ہو گیا تھا کہ میں خالہ کو کچھ نہ کچھ سکھاتی رہتی ہوں۔ مجھے اس کی ناپسندیدگی کی کوئی پرواہ نہیں تھی یہ گھر خالہ کا تھا اس کا نہیں اور مجھے وہ کسی طور بھی وہاں آنے سے منع نہیں کر سکتی تھی۔

مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر عجب سارنگ لہرا جاتا تھا۔ وہ جن نظروں سے مجھے دیکھتی تھی وہ بعض دفعہ مجھے خوفزدہ کر دیتی تھیں۔ بے تاثر، سرد، گہری، سلاخوں کی طرح دل میں اتر جانے والی نظریں، مگر پھر میں نے خود پر قابو پانا سیکھ لیا تھا۔ اس سے ڈر جاؤں گی تو یہ جنگ کیسے جیتوں گی۔“ میں ہر بار خود کو یقین کی رسی تھما دیتی۔

پھر خالہ سے پتا چلا کہ ثناء نے اپنے جہیز کی تقریباً ساری قیمتی چیزیں بیچ دی تھیں۔ فرنیچ، ٹی وی، وی سی آر، ڈیک، فرنچیز تقریباً ہر چیز۔

میں نے اس سے اس بارے میں پوچھا تو پڑیل کہنے لگی۔ ”امی آپ نے ہی کہا تھا کہ مجھے اس کی مدد کرنی چاہئے تو میں عمر کی مدد کر رہی ہوں۔ میکے میں کبھی کچھ لینے نہیں جاؤں گی۔ کیونکہ ان پر میرا جتنا حق تھا وہ ادا کر چکے ہیں۔ پھر میں ان سے کچھ مانگ کر اپنے شوہر اور سسرال کو چھوٹا کرنا نہیں چاہتی۔ ہاں میری ہر چیز عمر کی ہے ان چیزوں پر اس کا حق ہے۔

اسے ضرورت ہے اور میں ان چیزوں کو بیچ کر اس کی ضرورت پوری کر دوں گی۔ یہ چیزیں رشتوں سے بڑھ کر نہیں ہوتیں۔“ میرا دل چاہا میں اس کے منہ پر جوتا کھینچ ماروں۔ ”شوہر کا چیزوں پر حق ہے سسرال والوں کا نہیں۔ یہ پڑھی لکھی لڑکیاں بڑی مکار اور فریبی ہوتی ہیں انہیں شوہروں کو پھانسنے اور پھانسنے کے سوا طریقے آتے ہیں۔“

خالہ مجھے بتا رہی تھیں اور میرا دل جل رہا تھا۔ ”اللہ کرے تو مر جائے ثناء اللہ کرے تو مہو جائے۔“ میرے دل سے بد دعائیں نکل رہی تھیں۔

”کتنے خنجر گاڑے گی میرے سینے میں اور کتنے خنجر گاڑے گی۔“

اس سے میری نفرت میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ عمر سے عشق اتنا ہی بڑھ گیا تھا خالہ نے بتایا تھا کہ اس نے پچاس ہزار کی کوئی کمپنی ڈالی ہوئی تھی اور اس نے وہ بھی عمر کو دے دی تھی۔

عمر نے جاب چھوڑ دی تھی۔ پتہ نہیں ان دنوں وہ کہاں کہاں گھومتا رہتا تھا۔ عجیب حلیہ ہو گیا تھا اس کا۔ اسے کسی چیز کی ہوش ہی نہیں تھی سوائے اپنے بزنس کے بعض دفعہ وہ ساری ساری رات باہر رہتا۔

بعض دفعہ وہ دو دو تین تین دن کے بعد گھر آتا اور پھر پتا نہیں کیا ہوا مگر اس کا بزنس ایک بار پھر ٹھیک ہونے لگا تھا ایک بار پھر سے اسے آرڈرز ملنے لگے تھے اور ہر نئے آرڈر کی خبر میرے دل کی ایک دھڑکن کو کم کر دیتی۔ روپیہ نہیں آنا چاہئے اس کے پاس روپیہ نہیں آنا چاہئے روپیہ آئے گا تو یہ اور ثناء.....“ میں آگے کچھ نہ سوچ پانی میرا دل ڈوبنے لگتا۔

”کیا کروں اللہ میں کیا کروں جو سب کچھ پھر پہلے کی طرح ہو جائے۔ خالہ اپنی باتیں کہے جاتیں، میں اپنے منصوبے بناتی رہتی۔ مگر بعض دفعہ منصوبے بھی کام نہیں آتے کچھ بھی کام نہیں آتا بس وہی ہوتا ہے جو خدا چاہتا ہے۔ عمر کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ وہ رات دن اپنے بزنس میں مصروف رہتا تھا اور اس کا بزنس ترقی کرتا جا رہا تھا صرف چار پانچ ماہ میں ہی ان کے گھر میں تبدیلیاں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ خالہ کو پہلے سے دوگنی رقم دینے لگا تھا۔ گھر میں بہت سی چیزوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اور..... اور ثناء خوش رہنے لگی تھی۔

اب میں خالہ کے پاس جاتی تو وہاں میرا دم گھٹنے لگتا۔ ہر گزری ہوئی چیز صحیح ہونے لگی تھی۔ ثناء اکثر مسکرانے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر چمک ہوتی تھی۔ بعض دفعہ وہ اور عمر ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے تو مجھے لگتا جیسے کسی نے مجھے آگ میں پھینک دیا ہے اور اس دن تو میں بے تماشا روئی تھی جب مجھے خالہ سے پتہ چلا تھا کہ عمر نے ثناء کی جاب چھڑوا دی ہے۔

میں خالہ کی بات پر گم صم ہو گئی تھی۔ میرا ہر داؤ ہر دار الٹا ہی پڑتا جا رہا تھا اب میرا جی چاہئے لگا میں کسی طرح اسے زہر دے دوں۔ وہ مر جائے جب تک وہ زندہ ہے اس سے عمر کی جان چھوٹے گی نہ میری۔ مگر اسے زہر دینے کی ہمت نہیں تھی مجھ میں۔

ان دنوں کی شادی کو تین سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا اور پہلی بار میں نے ثناء میں تبدیلی محسوس کی تھی۔ اب وہ خالہ کی کسی بات کسی نکتہ چینی پر چپ نہیں رہتی تھی، وہ وضاحت کر دیا کرتی تھی۔ بڑے پرسکون اور اطمینان انداز میں اور خالہ کو تو بس آگ ہی لگ جاتی تھی۔ اگر وہ شروع سے اسی طرح اپنی پوزیشن کلیئر کرتی ہوتی تو شاید خالہ یہ سب اتنا برا نہ لگتا مگر اب نہیں لگتا تھا کہ وہ ان سے بحث کرنے لگی ہے۔

میں مانتی ہوں، خالہ کو اس طرح سوچنے پر بھی میں نے ہی مجبور کیا تھا۔ میں خالہ سے کہتی رہتی تھی کہ ”اب عمر کے پاس روپیہ آنا شروع ہو گیا ہے اب وہ اسے کبھی رہنے نہیں دے گی اور وہ آپ سے فضول بکواس اس لئے کرتی ہے کیونکہ اسے یہ لگتا ہے کہ آپ لوگ

اس کے شوہر کی کمائی کھا رہی ہیں۔“ میں خالہ کو اس طرح کی باتوں سے خوب بھڑکا دیا کرتی۔ وہ ثناء سے پہلے سے بھی زیادہ جھگڑا کرنے لگی تھیں اور میں پھر پرسکون ہونے لگی تھی۔ اچھا تھا کہ یہ تماشا اسی طرح جاری رہتا۔ پھر مجھے پتا چلا کہ ثناء میرے آنے پر اعتراض کرنے لگی تھی۔ میں خالہ کے سامنے خوب روئی تھی اور خالہ نے بھی مجھے گلے لگا کر خوب آنسو بہائے تھے۔

”جب تک میں زندہ ہوں، کسی کی مجال نہیں جو تمہیں یہاں آنے سے روک سکے پھر یہ چیل کیا کر لے گی۔“

انہوں نے مجھے تسلی دی تھی۔ وہ یہ یقین دہانی نہ بھی کراتیں تب بھی میں جانتی تھی کہ مجھے وہاں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ خالہ کی بدگمانیاں ثناء سے اور بڑھ گئی تھیں۔ عمر بہت مصروف رہتا تھا۔ رات کو بہت لیٹ آتا اور صبح بہت جلدی چلا جاتا۔ خالہ کو اس سے شکوے شکایتوں کا موقع کم ہی ملتا تھا اور یہ غبار پھر وہ ثناء پر برس کر نکالتی تھیں۔

اس شام بھی میں خالہ کے گھر پر تھی جب ثناء کی امی اور ممانی آئی ہوئی تھیں۔ ثناء کی چھوٹی بہن اس کی ممانی کے گھر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بجائے صحن میں خالہ کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ ثناء کچن مین چائے بنا رہی تھی۔

ثناء کی امی بار بار خود ہی خالہ کو مخاطب کرتیں اور کوئی نہ کوئی بات شروع کر دیتیں جبکہ خالہ بڑی بیزاری سے صرف ہوں ہاں کرتی جا رہی تھیں۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا لیکن ثناء کی امی کی کسی بات پر خالہ نے ثناء کی برائیاں کرنی شروع کر دی تھیں۔ اس کی امی کچھ تنگ سی ہو گئی تھیں۔ ثناء کی ممانی نے صورتحال کو قدرے بہتر کرنے کے لئے ثناء اور اس کی بہنوں کی تعریف کی تھی اور خالہ تو پھر جیسے پھٹ ہی پڑی تھیں۔

”ایسا بھی کوئی گن نہیں ہے اس میں۔ وہ ایک بد زبان، بے لحاظ اور بد تمیز لڑکی ہے۔ میری جگہ اگر کوئی اور عورت ہوتی تو اب تک اسے دھکے دے کر گھر سے نکال چکی ہوتی۔ ایک بچہ تک تو وہ پیدا کر نہیں سکی اور عمر کی شادی کو ساڑھے تین سال ہونے والے ہیں۔ یہ تو ہمارا حوصلہ ہے ہم پھر بھی اسے یہاں برداشت کر رہے ہیں ورنہ لوگ تو ایک سال میں ایسی عورت کو فارغ کر کے گھر بھیج دیتے ہیں۔ یہ تو عمر کا ہی دماغ خراب ہے جس نے اسے اب تک رکھا ہوا ہے ورنہ اسے اب بھی لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ایک سے ایک اچھی لڑکی مل سکتی ہے اسے۔“

میں سر جھکائے ایک طرف کرسی پر بیٹھی خالہ کی باتیں سن رہی تھی۔ ثناء کی امی اور ممانی بالکل گم صدمہ بھی تھیں۔ وہ ایک لفظ نہیں کہہ رہی تھیں۔ شاید انہیں خالہ سے یہ سب سننے کی توقع ہی نہیں تھی۔ کچھ دیر تک اسی حالت میں بیٹھے رہنے کے بعد وہ کچھ کہے بغیر اٹھیں اور چلی گئی تھیں۔ انہوں نے چائے بھی نہیں پی تھی۔

ثناء ان سب باتوں سے بے خبر نہیں رہی تھی۔ اس نے بھی یہ سب کچھ سن لیا تھا۔ اپنی امی اور ممانی کے سامنے وہ بالکل چپ رہی تھی لیکن ان کے جاتے ہی وہ تیر کی طرح خالہ کے پاس آئی تھی۔

”آپ کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ آپ میری ماں سے میرے بارے میں ایسی باتیں کریں؟“

اس کی آواز نیچی تھی لیکن لہجہ تلخ تھا۔ پہلی دفعہ میں نے اسے خالہ سے اس انداز میں بولتے سنا تھا۔ خالہ اس کے سوال پر بھڑک اٹھی تھیں۔

”جو سچ ہے، وہ تو میں کہوں گی، چاہے کسی کو کڑوا لگے۔ تمہاری ماں سے بھی میں نے سچ ہی کہا ہے۔“

”تھوڑا سچ اپنے بارے میں بھی کہہ دیتیں۔“ اس نے کافی بدتمیزی سے کہا تھا میں نے بڑی دلچسپی سے اس کے سرخ چہرے کو دیکھا تھا۔

”تمہیں اگر اتنا خوف تھا تو اپنی ماں کو یہاں بلایا کیوں؟ یہاں جو آئے گا، میں اسے تمہاری اصلیت تو ضرور بتاؤں گی۔“

”کیا اصلیت ہے میری؟ پہلے آپ مجھے تو بتائیں۔“

”مجھ سے فضول بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس قسم کی زبان درازی تمہاری ماں برداشت کرتی ہوگی میں نہیں۔“

خالہ اس کی بات پر مزید گرم ہو گئی تھیں۔

”میری ماں نے مجھے یہی ایک چیز تو نہیں سکھائی، جس کی سزا میں آج تک بھگت رہی ہوں۔ میں نے آپ کی بہت عزت کرنے کی کوشش کی تھی مگر کچھ لوگ عزت کے قابل ہوتے ہی نہیں۔“

”تمہاری ماں عزت کے قابل ہے؟“

”میری ماں کے بارے میں بات نہ کریں۔ وہ دوسروں کی زندگیوں کی طرح آپ کی طرح اجیرن نہیں کرتیں۔ آپ کی طرح لوگوں کے سامنے اپنی داستانیں لے کر نہیں بیٹھتیں۔“

اس کا ہر جملہ میری خوشی میں اضافہ کر رہا تھا تو خدا خدا کر کے یہ کفر ٹوٹ ہی گیا تھا۔

”کیوں نہ بتاؤں تمہارے بارے میں۔ لوگوں سے کیوں نہ کہوں کہ تم بانجھ ہو۔ تم نے اس گھر میں بربادی کے علاوہ اور دیا ہی کیا ہے۔“ خالہ ایک دم چیخنے لگی تھیں۔

”مجھ سے اس قسم کی بات نہ کریں۔ میں اب برداشت نہیں کروں گی۔“

”برداشت نہیں کر سکتیں تو جاؤ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ اپنی یہ منحوس شکل لے کر غائب ہو جاؤ پھر یہاں کھڑی کیوں ہو؟“

”میں کیوں جاؤں یہاں سے، یہ میرے شوہر کا گھر ہے، وہ لایا تھا مجھے یہاں پر۔ وہ کہے گا تو جاؤں گی آپ کے کہنے پر نہیں۔“

”یہ تمہارے شوہر کا نہیں، میرے شوہر کا گھر ہے، ان کے نام ہے تمہارے شوہر کی ابھی اتنی اوقات کہاں کہ ایک کمرہ بھی بنا سکے۔“

خالہ بھی اتنی ہی بلند آواز سے چلا رہی تھیں۔ میں نے اس موقع پر تھوڑا ڈراما ضروری سمجھا۔ میں نے خالہ کو چپ کر دانے کی کوشش کی۔

”خالہ! آپ چھوڑیں، دفع کریں آپ کیوں اپنا دل دکھاتی ہیں۔“

میں نے خالہ سے کہا تھا اور وہ میری بات پر بھڑک اٹھی تھی۔

”یہ میرا اور ان کا معاملہ ہے تم کون ہوتی ہو دخل اندازی کر نیوالی۔ تمہیں کوئی حق ہی نہیں ہے درمیان میں بولنے کا، بلکہ تمہیں اس وقت یہاں ہونا بھی نہیں چاہیے۔ تم جاؤ یہاں سے یہ میرا اور ان کا معاملہ ہے تمہارا اور میرا نہیں۔“

اس نے بڑے ترش انداز میں اچانک مجھ سے کہا مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ مجھے یوں جھڑک دے گی۔

”یہ میری خالہ ہیں میں بھی ان سے بات کر رہی ہوں، تم سے نہیں اور تم مجھے اس گھر سے نہیں نکال سکتیں۔ یہ تمہارا نہیں میری خالہ کا گھر ہے۔“

میں نے بھی اسے اسی طرح جواب دیا تھا۔ وہ میری بات پر اور مشتعل ہو گئی تھی۔

”فساد کی جڑ تم ہی ہو۔ یہ سب باتیں تم ان کے کانوں میں ڈالتی ہو۔ اگر تم یہاں نہ آؤ تو اس گھر میں کوئی بھگڑا نہ ہو۔“

اس کی بات سن کر میری آنکھوں میں نمی آگئی تھی (دل میں میں نے سوچا تھا کم بخت نے صحیح اندازہ لگایا ہے مگر بہت دیر سے) میں نے خالہ کی طرف دیکھا اور میری آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے (مجھے اس کے لیے خاصی محنت کرنی پڑی تھی)

خالہ نے یک دم اسے صلواتیں سنانا شروع کر دی تھیں مگر وہ بھی بڑی ثابت قدمی سے اپنے مطالبے پر جمی رہی کہ میں وہاں سے چلی جاؤں۔ ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا تھا۔ تب ہی اچانک عمر آ گیا تھا۔ اس کے لیے یہ منظر یقیناً حیران کن ہوگا۔ میری آنکھوں سے بہتے آنسوؤں نے بھی اسے یقیناً پریشان کیا ہوگا۔

”کیا ہوا ہے؟“ اس نے کافی حیرانگی سے پوچھا تھا۔

”کچھ نہیں ہوا بس میں یہ چاہتی ہوں کہ شاملہ یہاں سے چلی جائے اور دوبارہ یہاں کبھی نہ آئے۔“

وہ اس کی بات پر مزید حیران ہوا اور میں نے اپنے آنسوؤں کی رفتار میں اور اضافہ کر دیا تھا۔

”شاء کبھی ہے کہ اس گھر میں سارے جھگڑے میری وجہ سے ہوتے ہیں میں فساد کی جڑ ہوں مجھے یہاں سے نکال دینا چاہیے حالانکہ میں تو صرف خالہ کے لیے آئی ہوں۔“ شاء نے اس سے کہا تھا۔

”شاء! یہ سب تم نے کہا ہے؟“ اسے یقین نہیں آیا تھا شاید، اس لیے اس نے شاء سے پوچھا تھا۔

”ہاں، میں نے کہا تھا اور میں پھر کہتی ہوں، اس سے کہو کہ ہمارے گھر سے چلی جائے۔“ وہ اب بھی پہلے ہی کی طرح بات کر رہی تھی۔

”احقانہ باتیں مت کرو اور کمرے میں جاؤ۔“ اس نے اسے جھڑک کر کہا مگر شاء پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”میں یہاں سے نہیں جاؤں گی کسی قیمت پر یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ پہلے اسے یہاں سے نکالو پھر میں یہاں سے جاؤں گی۔“

وہ اپنی ضد پر قائم تھی۔ اس کی بات پر خالہ نے ایک بار پھر بولنا شروع کر دیا تھا، شاء بھی چپ نہیں رہی تھی۔ خالہ جس قدر بلند آواز سے بول رہی تھیں وہ ان سے بھی بلند آواز میں بات کر رہی تھی۔ عمر کچھ دیر تک ان دونوں کو چپ کروانے کی کوشش کرتا رہا مگر دونوں میں سے کوئی بھی اس کی بات نہیں سن رہا تھا۔ وہ جھنجھلا گیا اور اس نے بلند آواز میں شاء سے کہا۔

”بس شاء! اب چپ ہو جاؤ۔ میں تمہارے منہ سے مزید کچھ نہیں سننا چاہتا۔“

”میں چپ نہیں کروں گی۔“ اس نے اب بھی اتنی بلند آواز میں کہا تھا اس کے

لہجے میں عمر جیسے ٹھنڈے آدمی کو بھی مشتعل کر دیا تھا۔

”میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم اپنی زبان بند کر لو۔“ وہ چلایا تھا۔

”کیوں، میں ہی کیوں اپنی زبان بند رکھوں۔ تمہاری امی کیوں نہیں؟ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اتنے سال سے میں کیا کرتی آرہی ہوں۔ خاموشی، خاموشی، بس خاموشی۔ کیا میں جانور ہوں۔ لیکن اب میں کچھ برداشت نہیں کروں گی۔ تم اگر مجھے چپ کروانا چاہتے ہو تو اس گھر میں شاملہ کا آنا جانا بند کرو۔“

”شاملہ یہاں بچپن سے آرہی ہے، اب بھی آتی رہے گی۔ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔“

عمر نے تیز آواز میں اس سے کہا تھا اور خوشی کی ایک لہر میرے اندر دوڑ گئی۔

”ہاں۔ تم کیوں چاہو گے کہ وہ یہاں آنا بند کرے۔ تمہارے لیے ہی تو آئی ہے وہ۔“ اس کی بات پر وہ بے حد حیران نظر آیا پھر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ میں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا تھا۔

”شاء! تمہارا ذہن بے حد گھٹیا ہے اور تمہاری سوچ اتنی ہی گندی ہے۔ میں نے تمہیں بہت غلط سمجھا تھا۔ تم بہت عام سی لڑکی ہو۔ تم میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا کہ میں تم سے شادی کرتا۔“

عمر کے کہنے گئے ہر لفظ نے میرے کانوں میں امرت گھول دیا تھا۔ مجھے شاء کی آنکھوں میں ہلاکی بے یقینی نظر آئی۔ شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب عمر نے کہا ہے کچھ دیر اسی طرح گم سم رہنے کے بعد اس نے ایک بار پھر بولنا شروع کر دیا تھا۔

”میں گھٹیا نہیں تم گھٹیا ہو، یہ گھٹیا ہے اور میں پھر کہوں گی، بار بار کہوں گی اسے یہاں سے نکالو اس سے کہو کہ یہ یہاں سے چلی جائے۔“

”یہ نہیں جائے گی۔ تم چلی جاؤ تم نکل جاؤ یہاں سے۔“ وہ اس کی بار بار پر دھاڑا تھا۔

”تم مجھے یہاں سے جانے کو کہہ رہے ہو، اس کے لیے؟“

وہ میری طرف انگلی اٹھائے عجب بے یقینی کے عالم میں اس سے کہہ رہی تھی۔

”ایک لفظ مت کہنا، اب ایک لفظ مت کہنا۔ بس یہاں سے چلی جاؤ، یہاں سے نکل جاؤ۔ میں تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔“ عمر کی آنکھوں میں جیسے خون اتر رہا تھا۔

”میں نہیں جاؤں گی۔ میں کبھی نہیں جاؤں گی۔ مجھے کیسے نکال سکتے ہو تم، کیسے کہہ سکتے ہو، مجھ سے کہ میں یہاں جاؤں۔ میں نے تمہارے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ میں نے اس

گھر کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ عمر حسن! میری وجہ سے تم اپنے پیروں پر کھڑے ہو۔ میں سہارا نہ دیتی تو تم کہاں ہوتے۔ میں اگر.....“

وہ اس سے کہہ رہی تھی مگر اس نے دانت پیٹتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

”تم..... یہاں..... سے..... جاؤ..... تم..... میرے..... گھر..... سے..... نکل.....

جاؤ۔“

میں نہیں جاؤں گی۔ کبھی نہیں جاؤں گی۔ یہ میرا بھی گھر ہے اور میں تمہاری بیوی ہوں۔ مجھے تم نکال نہیں سکتے۔ اس طرح تو کبھی نہیں نکال.....“

”تو پھر ٹھیک ہے پھر میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔“

”عمر نے جو کہا تھا، اس کی توقع کسی کو نہیں تھی۔ مجھے نہ خالہ کو نہ ثناء کو اور..... اور نہ ہی شاید عمر حسن کو۔ سب کچھ غصے میں ہوا تھا مگر سب کچھ ہو گیا تھا۔ مجھے لگا تھا جیسے کسی نے میرے وجود کی آگ کو ٹھنڈے پانی سے بجھا دیا تھا۔

خالہ کے چہرے پر بھی عجیب سا سکون اور ٹھہراؤ تھا۔ ہاں وہ..... وہ عمر حسن کو بس دیکھتی جا رہی تھی۔

اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا مگر اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی، بلا کی بے یقینی اور عمر حسن اب بھی سرخ آنکھوں اور سرخ چہرے کے ساتھ اس کے جانے کا منتظر تھا۔ میں بھی اب وہاں نہیں رہنا چاہتی تھی جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اب اس ڈرامے سے میری Exit ہو جانی چاہیے تھی۔ میں اسی طرح بہتے آنسوؤں کے ساتھ چہرہ چھپاتی تقریباً بھاگتی ہوئی اپنے گھر آ گئی تھی۔

بعد میں کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ ہاں خالہ نے بتایا تھا کہ ثناء کچھ کہے اور کچھ لیے بغیر وہاں سے اسی خاموشی سے چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد عمر حسن بھی وہاں سے چلا گیا تھا اور پھر ساری رات واپس نہیں آیا تھا۔

اس نے دوسرے دن تحریری طور پر بھی اسے طلاق بھجوا دی تھی۔ اب ان دنوں کے درمیان مصالحت کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں لیکن ثناء کے گھر سے کوئی اس کا جہیز کا سامان لینے بھی نہیں آیا تھا۔ عمر ایک دن خود ہی ساری چیزیں اکٹھی کر کے ان کے گھر پہنچا آیا تھا۔ خالہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے ثناء کے ابو سے کہا تھا کہ جو چیزیں وہ بیچ چکا ہے اور جو روپیہ اس نے ثناء سے لیا تھا، وہ انہیں دو تین ماہ تک واپس کر دے گا۔

میرے راستے کی ہر رکاوٹ دور ہوتی گئی۔ میں نے اپنے کارڈز بڑی مہارت کے

ساتھ کھیلے تھے۔ میں صرف خالہ کے گھر ہی نہیں روٹی تھی، گھر آ کر بھی میں نے امی کو اسی طرح روٹے ہوئے سب کچھ بتایا تھا کہ کس طرح ثناء نے مجھ پر عمر کے ساتھ تعلقات کا الزام لگایا ہے۔ میں نے اپنی طرف سے بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا تھا۔

امی اور خالہ نے کوشش کی تھی کہ اس جھگڑے میں کہیں میرا ذکر نہ آئے لیکن میں چاہتی تھی ایسا ہو۔ میں نے اپنی ہر کرن، ہر دوست کو یہ سب بتایا تھا کہ یہ طلاق میری وجہ سے ہونے والے جھگڑے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ میں چاہتی تھی کہ ہر جگہ میرا نام عمر حسن کے نام کے ساتھ آئے ہم دونوں کی بدنامی ہو اور پھر امی مجھے اس سے بیاہ دیں اور شاید اس سب کے بغیر عمر حسن بھی مجھ سے کبھی شادی نہ کرتا۔

دو تین ماہ میں پورا محلہ اور پورا خاندان ہمارے رشتے کے بارے میں چہ میگوئیاں کرنے لگا تھا۔ میں نے خالہ کے گھر جانا چھوڑ دیا۔ میں ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ ثناء کی وجہ سے میں بدنام ہو گئی ہوں۔ میری زندگی برباد ہو گئی ہے۔ خالہ بھی مجھ سے شرمندہ تھیں وہ جب بھی آتیں ان کے سامنے میں پیروں روٹی ان کے سامنے اپنی قسمت کی دہائیاں دیتی۔ ان کے دل کا بوجھ اور بڑھ جاتا۔ انہوں نے عمر حسن کی طرف سے بھی مجھ سے معافی مانگی تھی وہ شرمندہ تھا کہ اس کی بیوی کی وجہ سے میرے خلاف لوگوں میں اس قسم کی باتیں ہو رہی ہیں۔

امی بڑی محنت سے دن رات میرے رشتے کی تلاش میں مصروف تھیں۔ دو تین جگہ انہوں نے میری بات طے کرنے کی کوشش کی اور جب بات طے ہونے لگی تو میں کسی نہ کسی طرح اس سارے معاملے کی خبر ان لوگوں تک پہنچا دیتی۔ نتیجہ ان کے انکار کی صورت میں ہوتا میرے ماں باپ اس صورت حال سے بے حد پریشان تھے لیکن میں نہیں تھی۔

پھر میں نے امی سے کہہ دیا تھا کہ میں بدنام تو اس کے ساتھ ہو چکی ہوں بہتر ہے کہ وہ وہیں میری شادی کر دیں۔ شروع میں امی کو میری اس بات پر شاک لگا اور انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا لیکن جب میں نے ان سے کہا کہ اگر کہیں اور میری شادی ہو بھی گئی اور بعد میں ان لوگوں کو اس معاملے کے بارے میں پتا چلا تو کیا ہوگا میری زندگی تو ایک بار پھر خراب ہو جائے گی۔

امی میری اس بات پر سوچنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ انہوں نے خالہ سے بات کی تھی وہ تو پہلے ہی تیار تھیں عمر حسن شادی پر رضامند نہیں تھا لیکن میرے ماں باپ اور خالہ اور خالو نے پتا نہیں اسے کیا کیا واسطے دیئے۔ کیا کیا دلیلیں دیں کہ وہ مجبور ہو گیا تھا۔

شاء کو طلاق دینے کے پورے ساڑھ چار ماہ کے بعد اس سے میری شادی ہو گئی اور شادی بے حد دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ خالہ نے اپنے سارے ارمان نکالے تھے اور ہمارے گھر کی بھی یہ پہلی شادی تھی۔ عمر حسن میرا کیا ہوا تھا، مجھے لگا تھا، دنیا میری ہو گئی ہے۔ کسی نے محبت میں اتنے صبر آزمائیاں نہیں گزارے ہوں گے جتنے میں نے گزارے تھے۔ کسی نے کسی کو پانے کے لیے اتنی دعائیں نہیں کی ہوں گی جتنی میں نے کی تھیں اور میں نے اسے پانی لیا تھا۔ وہ شادی پر بجھا بجھا تھا۔ مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اس نے شادی کی رات کو مجھ سے معافی مانگی تھی کہ اس کے اور شاء کے جھگڑے کی وجہ سے مجھے اتنی پریشانی اٹھانی پڑی۔

میرا دل چاہا میں اس سے کہوں کہ مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی جو واحد پریشانی تھی، وہ ساڑھے چار ماہ پہلے جا چکی تھی۔ مگر میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ میں بے حد خوش تھی۔ بہت مسرور تھی۔ اس کے کمرے میں آنے کے خواب پتا نہیں میں نے کب سے دیکھنے شروع کیے تھے اور میں وہاں آئی گئی تھی۔ اس کی بیوی بن کر۔

لوگوں کا عشق شادی کے بعد ختم ہونا شروع ہو جاتا ہے، میرا اور بڑھنے لگا تھا۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں خود کو اس کے قدموں میں بچھا دوں۔ میں اس کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی، وہ اگر دن کو رات کہتا تو میں بھی رات ہی کہتی۔ بس میں یہ چاہتی تھی کہ اسے کبھی بھی ایک لمحے کے لیے بھی شاء یاد نہ آئے وہ اس کے بارے میں نہ سوچے۔ وہ کہیں میرا اور اس کا موازنہ نہ کرنے لگے۔ مگر پتا نہیں کیا بات تھی۔

میں اس کے معاملے میں جتنی پر جوش ہوتی گئی وہ اتنا ہی سرد ہوتا گیا۔ کزن کی حیثیت سے وہ مجھ سے جتنی باتیں کیا کرتا تھا، اب اتنی گفتگو بھی نہیں کرتا تھا۔ بس خاموش رہتا تھا اس کی خاموشی سے میرا دل ڈوبنے لگتا۔ عجیب طرح کے وہم میرے دل میں آنے لگتے تھے۔ کہیں یہ شاء کے بارے میں تو نہیں سوچ رہا، کہیں اسے وہ یاد تو نہیں آ رہی۔ میں سوچتی اور مجھے ہول اٹھنے لگتے۔

میں نے اس گھر سے شاء کی ہر نشانی ختم کر دی تھی۔ اپنے بیڈروم کے کمرے میں بدلوا دی تھی گھر کے ہر کمرے کی ڈیکوریشن بدل دی تھی۔ ہر وہ چیز جس کے بارے میں مجھے علم تھا کہ یہ شاء خرید کر لائی تھی وہ میں نے اٹھا کر بیچ دی تھی یا پھینک دی تھی۔

میری شادی کو چھ سات ماہ گزرے تھے، جب مجھے پتا چلا تھا کہ شاء کی بھی شادی ہو گئی

ہے۔ اس خبر نے میرے دل کو ایک عجیب سا سکون دیا تھا، ایک عجیب سے تحفظ اور خوشی کا احساس ہوا تھا مجھے۔ میں کسی کا بھی برا نہیں چاہتی تھی۔ میں شاء کا برا بھی کبھی نہیں چاہتی لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ عمر حسن کی زندگی میں آ گئی تھی جو میری زندگی تھا اور اب جب وہ اس کی زندگی سے نکل گئی تھی تو مجھے اس سے کوئی شکوہ نہیں رہا تھا۔ میری خواہش تھی کہ اس کی بھی کسی اچھی جگہ شادی ہو جائے اور وہ بھی خوش رہے اور اب اس کی شادی کی خبر نے مجھے پرسکون کر دیا تھا۔

بہت دنوں تک میں عمر حسن کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھتی رہی میں اس کے چہرے پر پتا نہیں کیا ڈھونڈنا چاہتی تھی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ شاء کی شادی سے کہیں وہ پریشان تو نہیں مگر میں اس کے چہرے پر کچھ بھی تلاش نہیں کر پائی وہ ویسا ہی تھا جیسا پہلے تھا۔ افسردہ، خاموش۔ کسی تیسرے احساس کا اظہار نہیں تھا نہ چہرے پر نہ باتوں میں۔ میں مطمئن ہو گئی تھی۔

”سب کو ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں خود کو تسلیاں دیتی رہتی۔



جب سے میں عمر کے گھر آئی تھی، اس کا کاروبار پھیلتا ہی گیا تھا۔ روپیہ بارش کی طرح ہم پر برس رہا تھا۔ خالہ ہر ایک سے کہتیں کہ میں ان کے گھر کے لیے بہت خوش قسمت ثابت ہوئی ہوں۔ میری وجہ سے گھر میں روپیہ آ رہا ہے، میری وجہ سے کاروبار ترقی کر رہا ہے۔ میں ان کی باتوں پر بے حد مسرور ہوتی۔

مجھے بے حد فخر ہوتا۔

”ہاں یہ سب میری وجہ سے ہی ہے۔ میں یہاں نہیں تھی تو یہاں کیا تھا مگر اب میں ہوں تو جیسے سب کچھ ہے۔“

میں دل ہی دل میں سوچتی اور یہ کوئی خوش غمی نہیں تھی۔ اس کا کاروبار دن دو گئی اور رات چو گئی ترقی کر رہا تھا۔ اس کا ثبوت وہ بڑی بڑی رقوم تھیں جو وہ مجھے اور خالہ کو خرچ کرنے کے لیے دیا کرتا تھا، کم از کم اس معاملے میں مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

شادی کے بعد اس نے کبھی مجھے کسی چیز کی تنگی کا شکار نہیں ہونے دیا تھا۔ مجھے شروع سے ہی روپیہ پانی کی طرح بہانے کی عادت تھی اور میری یہ عادت شادی کے بعد بھی قائم رہی، وہ مجھے جتنے روپے دیتا، میں ایک بار شاپنگ پر جاتی اور خرچ کرتی۔ پھر میں اسے اور روپے مانگتی اور وہ ایک لفظ کہے بغیر میرا مطالبہ پورا کر دیتا۔

اس نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا تھا کہ میں اتنے روپوں کا کیا کرتی ہوں میں خود ہی

اپنا ہر نیا لباس، ہر نیا زیور بڑے شوق سے اسے دکھاتی اور وہ کسی دلچسپی کے بغیر اسے دیکھتا اور میرے پوچھنے پر سرسری انداز میں تعریف کر دیتا۔ میرے لیے یہ بھی کافی تھا۔

میں ہر وقت خود کو سجا سنوار کر رکھتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ عرصن کو سادگی پسند ہے اسے زیادہ ایک اپ اور بھاری بھر کم بھڑکیلے لباس پسند نہیں ہیں۔ لیکن یہ سب مجھے پسند تھا اور خالہ بھی یہی چاہتی تھیں کہ میں خوبصورت ہوں اور مجھے سجا سنوار کر رہنا چاہئے، اس طرح میں اس کے دل میں اپنی جگہ بنا لوں گی۔

عمر نے بھی کبھی مجھے اس سے نہیں روکا نہ ہی اس نے کبھی مجھ سے کہا کہ اسے یہ سب پسند نہیں ہے، بس وہ مجھے سراہتا نہیں تھا مگر میں خود ہی اس سے پوچھتی رہتی کہ میں کیسی لگ رہی ہوں اور وہ کہہ دیتا۔

”اچھی لگ رہی ہو۔“ اور میں اس کی بات پر جیسے ہواؤں میں اڑنے لگتی۔

ان دنوں زندگی بے حد خوبصورت تھی۔ میں ماں بننے والی تھی اور مجھے یقین تھا کہ میرا بچہ عمر کو بھی بدل دے گا۔ اس کی خاموشی توڑ دے گا۔ میرے ہاں شادی کے ڈیڑھ سال بعد بیٹی پیدا ہوئی لیکن عمر کی خاموشی نہیں ٹوٹی۔ وہ بیٹی سے محبت کرتا تھا۔ اسے بے تحاشا چیزیں لاکر دیتا تھا۔ اسے گود میں بھی اٹھا لیتا لیکن پھر بھی وہ افسردگی ختم نہیں ہوتی تھی جس نے اس کے وجود کو گھیرا ہوا تھا۔ مگر اب میں مطمئن تھی۔ میری پوزیشن اولاد ہونے کے بعد بہت مضبوط ہو چکی تھی۔

مجھے اب کوئی اس گھر سے ثناء کی طرح نہیں نکال سکتا تھا۔ عمر دیے بھی اب بہت مصروف رہنے لگا تھا کیونکہ وہ فیکٹری بنا رہا تھا۔ اس کے پاس فرصت اب بہت کم ہی ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ خالہ سے بھی میرے تعلقات اب اتنے خوشگوار نہیں رہے تھے۔ کچھ عرصے تک تو انہوں نے میرے بڑے ناز اور لاڈ اٹھائے تھے مگر پھر انہیں میری بہت سی باتوں پر اعتراض ہونے لگا تھا۔

میں بازاروں میں بہت جاتی ہوں، میں گھر کے معاملات میں ان کی رائے نہیں لیتی، میں کہیں جانے سے پہلے ان سے اجازت نہیں لیتی، میں اپنے گھر اتنے چکر کیوں لگاتی ہوں، میں بہت فضول خرچ ہوں، میں گھر کے کاموں کو ہاتھ نہیں لگاتی، میرے مزاج آسمان پر رہتے ہیں، میں نے عمر کو ان سے بالکل جدا کر دیا ہے۔ وہ ان کے پاس آ کر بیٹھتا ہی نہیں۔

کوئی ایک شکایت نہیں تھی انہیں مجھ سے۔ انہیں تو بس شروع سے بولنے کی عادت

تھی، یہ عادت اب کیسے چھوٹ جاتی مگر میں کوئی ثناء نہیں تھی جو زبان پر ٹیپ لگا کر پھرتی پھر جب میرے شوہر کو میری کسی بات پر اعتراض نہیں تھا تو وہ اعتراض کرنے والی کون ہوتی تھیں۔ عمر کو میں نے ان سے جدا نہیں کیا تھا وہ خود ان کے پاس نہیں بیٹھتا تھا پھر میں اسے کیسے پکڑ پکڑ کر ان کے پاس بٹھاتی اور یہ اچھا ہی تھا۔ ان کے پاس بیٹھ کر اس نے کیا سنتا تھا، میری شکایتیں۔

ایک دو بار خالہ سے میرا بہت زیادہ جھگڑا بھی ہوا تھا اور خالہ نے جب عمر سے اس بارے میں شکایت کی تو اس نے بڑی تضحی سے ان سے کہا تھا وہ آئندہ میرے بارے میں اس سے کوئی شکایت کریں نہ ہی وہ ایک لفظ سنے گا۔ خالہ اس کی بات پر جیسے شاک میں آ گئی تھیں۔ مگر مجھے بے حد فخر ہوا تھا خود پر اور عمر پر۔ اس کے دل میں میرے لئے کچھ تھا تب ہی تو اس نے میری طرف داری کی تھی۔ اس سے میری محبت میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔



ہماری شادی کو تین سال ہوئے تھے اور پتا نہیں کیوں لیکن ایک دم عمر کے رویے میں بہت بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ بے حد پریشان رہنے لگا تھا۔ بعض دفعہ رات کو میری آنکھ کھلتی تو وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا ہوتا۔ میں نے اس کی پریشانی کی وجہ جاننے کی کوشش کی تھی مگر وہ خاموش ہی رہا تھا بلکہ کافی بے رخی سے ساتھ مجھے جھڑک دیتا تھا۔ ان دنوں وہ ارم سے بھی کھنچا رہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ کسی کاروباری مسئلے کی وجہ سے پریشان تھا۔ مگر اب کاروبار اتنا پھیل چکا تھا کہ میں کم از کم یہ نہیں سوچ سکتی تھی کہ پہلے جیسے حالات لوٹ آئیں گے۔

اس کی یہ کیفیت دو تین ماہ رہی تھی۔ وہ زیادہ وقت گھر میں گزارتا نہ ہی مجھ سے بات کرتا اور اگر میں اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی تو وہ کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ میں اگر کبھی اس کے کندھے پر بھی ہاتھ رکھ دیتی تو وہ یوں میرا ہاتھ جھٹکتا جیسے میں کوئی غلیظ چیز ہوں۔ اس نے ان دو تین ماہ میں ایک بار بھی ارم کو نہیں اٹھایا نہ ہی اس کے پاس گیا۔ میں اس کے رویے سے بے حد پریشان تھی۔

ان دنوں ایک بار پھر میں نے خلوص نیت سے خدا سے اس کے ٹھیک ہو جانے کی دعا کی تھی اور ایک بار پھر میری دعا قبول ہو گئی تھی۔ دو تین ماہ تک اسی طرح رہنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو گیا تھا اور صرف ٹھیک نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے چہرے کی مسکراہٹ بھی

لوٹ آئی تھی۔ شادی کے تین سال بعد وہ اس افسردگی سے باہر نکل آیا تھا۔ ثناء کا طلم ٹوٹ گیا تھا۔ اور میں..... میں اس کا دل جیتنے میں کامیاب ہو ہی گئی تھی۔

اب وہ اکثر مجھ سے بات کر لیا کرتا۔ کبھی مجھے کوئی گفٹ بھی لادیتا، کبھی اپنے ساتھ کہیں گھمانے بھی لے جاتا۔ ارم سے بھی پہلے سے زیادہ محبت کرنے لگا۔ ہاں خالہ کے ساتھ اس کا رویہ ویسا ہی تھا۔ ان کے ساتھ وہ اب بھی کھنچا کھنچا ہی رہتا تھا ہر ماہ وہ کھڑے کھڑے انہیں کچھ رقم تمہا دیتا۔ ان کا حال حوال پوچھتا اور چلا جاتا۔

خالہ بعد میں بولتی رہتیں لیکن کوئی ان کی نہیں سنتا تھا۔



وقت آہستہ آہستہ گزرتا جا رہا تھا۔ ہماری شادی کو دس سال گزر گئے تھے ان دس سالوں میں بہت سی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ میرے ہاں ایک اور بیٹی ہوئی تھی اور اس بیٹی کی پیدائش پر عمر حسن نے کہا تھا کہ اب وہ مزید کوئی بچہ نہیں چاہتا۔ مجھے بیٹے کی بے پناہ خواہش تھی اور میں نے بہت اصرار کیا تھا کہ کم از کم ایک بیٹا ضرور ہونا چاہئے مگر اس نے بڑی سختی سے میرے اس مطالبے کو رد کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ دو بچے کافی ہیں، وہ ان ہی کی اچھی طرح تعلیم و تربیت کرنا چاہتا ہے۔ دو سے زیادہ بچوں کو وہ وقت نہیں دے سکتا اور بیٹے اور بیٹیوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا، بس اولاد اچھی ہونی چاہئے۔

مجھے اس کی باتوں پر خوشی اور حوصلہ ہوا تھا کہ اس کے نزدیک بیٹیاں بھی بیٹوں کے برابر ہیں لیکن میرے دل میں پھر بھی بیٹے کا مال ضرور تھا۔ مجھے اس کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ آخر اتنا بڑا کاروبار کل کون سنبھالتا۔ عمر کو اس کی بھی فکر نہیں تھی۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو بھی اپنے ساتھ بزنس میں لگایا ہوا تھا۔

اور یقیناً وہ سوچتا ہوگا کہ انصر اس کے بعد کاروبار سنبھال سکتا ہے لیکن میں اپنے دل میں کچھ اور منصوبے رکھتی تھی۔ اگر بیٹا نہیں تو پھر میرے دامادوں کو یہ کاروبار سنبھالنا چاہئے۔ میں نے اپنے دل میں طے کر رکھا تھا۔ بزنس تھا کہ وہ پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ پہلے ایک فیکٹری تھی اب تین فیکٹریاں تھیں اور عمر اب بھی پاگلوں کی طرح رات دن بزنس میں لگا رہتا۔ مہینے میں ایک بار ضرور یا تو اسے کراچی جانا پڑتا یا پھر بیرون ملک اور ہر دفعہ واپسی پر کوئی نہ کوئی نیا کانٹریکٹ ضرور اس کے ساتھ ہوتا۔

میں اس بڑھتے ہوئے بزنس پر بے پناہ خوش تھی۔ اس لئے میں نے کبھی گھر میں کم وقت دینے پر اس پر اعتراض نہیں کیا۔ وہ سب کچھ میرے گھر کے لئے ہی کر رہا تھا۔ میرے

بچوں کے لئے کر رہا تھا۔ میرے لئے کر رہا تھا۔ میں جانتی تھی پھر مجھے اعتراض کیوں ہوتا۔ ان دس سالوں میں وہ اپنی سب سے چھوٹی بہن کی شادی کر چکا تھا۔ انصر کی بھی شادی ہو چکی تھی۔

شادی کے چھٹے سال ایک حادثے میں چچا کا انتقال ہو گیا تھا۔ اگلے ہی سال ہم اپنے نئے گھر میں منتقل ہو گئے تھے خالہ کو ہم ساتھ نہیں لائے وہ خود بھی آنا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ انصر اور اس کی بیوی کے ساتھ اسی پرانے گھر میں تھیں۔ اب ان کا سارا طمخ ختم ہو چکا تھا وہ بے حد خاموش رہنے لگی تھیں اور گوشہ نشین ہو گئی تھیں۔

سارا دن وہ اپنے کمرے کے ایک کونے میں تسبیح لئے بیٹھی رہتیں اس عمر میں آ کر سب ایسے ہی خاموش ہو جاتے ہیں۔ کسی کو پتا نہیں چلتا کہ اس خاموشی سے پہلے لوگوں نے کیسے کیسے طوفان برپا کئے ہوئے تھے۔ ساری عمر خالہ نے بھی اپنی زبان سے لوگوں کو نشتر کی طرح کاٹا تھا اور اب انہیں اپنی آخرت کا احساس ہوتا ہوگا۔

میں جب بھی خالہ کو دیکھتی مجھے یہی خیال آتا تھا کبھی کبھی جب میں پچھلے دس سال کے بارے میں سوچنے بیٹھتی تو مجھے خیال آتا کہ عمر حسن کو جیتنے کے لئے میں نے کیسی جنگ لڑی تھی۔ کون سا جتن تھا جو میں نے نہیں کیا تھا۔ کون سا حربہ تھا جو نہیں آزمایا تھا۔ لیکن اس کا صول میرے لئے خسارے کا سودا ثابت نہیں ہوا تھا۔ مانتی ہوں میں نے کچھ ناجائز کام بھی کئے تھے لیکن محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ عمر حسن میری محبت تھا اور ثناء سے میری جنگ تھی پھر میں نے وہی کیا جو جائز تھا۔ کم از کم میری نظر میں اور کیا ہوا تھا، کس کا گھر تباہ ہوا تھا، سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔

عمر کا گھر تباہ ہوا مگر اس کی شادی مجھ سے ہو گئی اور آج وہ بے حد خوش ہے۔ کون سی چیز ہے جو اس کے پاس نہیں ہے۔ ثناء کا گھر برباد ہوا مگر اس کی بھی شادی ہو گئی۔ وہ بھی اپنے گھر خوش ہو گئی۔ میری خواہش عمر حسن تھا۔ مجھے بھی وہ مل گیا۔ میری زندگی بھی برباد ہونے سے بچ گئی۔

”بعض دفعہ ایک گھر توڑنے سے بہت سی زندگیاں سنور جاتی ہیں۔“ میں اکثر سوچا کرتی۔



زندگی اسی طرح رواں دواں تھی۔ میری شادی کو سترہ سال ہونے والے تھے۔ ہم تین سال پہلے ایک بار پھر پہلے سے بڑے گھر میں شفٹ ہوئے تھے۔ زندگی بے حد پرسکون تھی۔ میری بیٹیاں بڑی ہو گئی تھیں اور عمر نے انہیں شہر کے بہترین سکول میں داخل کروایا ہوا

تھا۔ وہ ان کی تعلیم کے بارے میں شروع سے ہی بہت دلچسپی لیتا تھا تھا۔ مجھے ان کے بارے میں کبھی بھی زیادہ فکر کرنی نہیں پڑی۔ ویسے بھی مجھے خود تو تعلیم میں کوئی دلچسپی تھی نہ ہی میں اس سلسلے میں ان کی کوئی مدد کر سکتی تھی کیونکہ میں خود صرف مشکل سے ایف اے ہی کر سکتی تھی۔ اس لئے ان کی تعلیم کا مسئلہ میں نے عمر کے لئے ہی چھوڑا تھا۔ وہ خود تو انہیں نہیں پڑھاتا تھا مگر اس نے ان کے لئے بہت مہنگے اور بہترین ٹیوٹورلگوار کھے تھے اس کے پاس ان کو پڑھانے کے لئے وقت ہوتا بھی کہاں۔

پچھلے سترہ سالوں میں اس نے کاروبار کو اتنا پھیلا لیا تھا کہ اب وہ چاہتا بھی تو اس سے جان نہیں چھڑا سکتا تھا۔ انصر بھی بے حد مصروف رہتا تھا۔ عمر پہلے کی نسبت اب زیادہ دنوں کے لئے گھر سے غائب رہتا تھا۔ ہاں اب بعض دفعہ مجھے اس کی کمی محسوس ہونے لگی تھی۔

وہ کبھی بھی کسی فنکشن پر ہمارے ساتھ جانے کے لئے وقت نہیں نکال سکا تھا اور نہ ہی وہ کبھی مجھے یا بچوں کو اپنے ساتھ کسی فنکشن میں لے کر گیا تھا بلکہ اس کے دوست بھی کبھی ہمارے گھر نہیں آئے تھے، نہ ان سے ہمارا ملنا جلنا تھا۔ جب بھی اسے کبھی کسی فنکشن کی دعوت آتی تو یا تو وہ ہمیں بتاتا ہی نا اور اگر کبھی بتا دیتا اور میں ساتھ جانے کی فرمائش کرتی تو وہ لے جانے سے انکار کر دیتا۔ مجھے یہ لگتا کہ شاید اسے پسند نہیں ہے کہ میں اس کے ساتھ اس قسم کی گیٹ ٹو گیڈرز میں جاؤں۔ اس لئے میں زیادہ اصرار نہیں کرتی تھی۔ مگر گرمیوں کی چھٹیوں میں بھی جب بچے بہت اصرار کرتے تو بھی وہ ہم لوگوں کو کبھی اپنے ساتھ کچھ دنوں کے لئے کسی تفریحی مقام پر نہیں لے جا سکا۔

گرمیوں میں اس کے اپنے بیرون ملک کے ٹورز آ جاتے تھے۔ وہ ہمیں کہیں جانے سے نہیں روکتا تھا بلکہ ہمارے جانے کے پورے انتظامات کر دیا کرتا تھا اور انصر کی فیملی کے ساتھ ہمیں کہیں نہ کہیں بھجوا دیا کرتا تھا لیکن پھر بھی میرا دل چاہتا کہ وہ ساتھ ہو، کچھ دنوں کے لئے ہم تنہائی میں بیٹھ کر کچھ اچھی باتیں کرتے، جہاں اس کی کوئی مصروفیت آڑے نہ آئے۔ مگر اس کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا تھا بعض دفعہ میں جذباتی ہو کر اسے ایسی بات کہتی تو وہ بڑی غیر دلچسپی سے کہتا۔

”دیکھو شامکہ! میں بہت پریکٹیکل آدمی ہوں یہ رومانس وغیرہ نہیں کر سکتا، میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے اور نہ ہی یہ رومانس کی عمر ہے، ہماری بچپان بڑی ہو رہی ہیں۔ اب ہمیں اپنی خواہشات کے بجائے ان کی خواہشات کے بارے میں سوچنا چاہئے۔“

میرا دل چاہتا، میں اس سے کہوں کہ اس عمر میں کیا، ہم نے تو کسی بھی عمر میں رومانس نہیں کیا۔ اس کے پاس ہمیشہ وقت کم ہوتا تھا۔ اس کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی کام ہوتا تھا، بعض دفعہ میرا دل چاہتا میں اس سے پوچھوں کہ تم نے ثناء سے رومانس کیسے کیا تھا۔ کیا تب تم پریکٹیکل آدمی نہیں تھے؟ مگر میں بس چپ ہو جاتی۔



پھر اچانک میری زندگی میں ایک طوفان آ گیا تھا۔ میں کبھی اس کی فیکٹری گئی تھی نہ آفس لیکن اس دن شاپنگ سے واپسی پر قائد اعظم روڈ سے گزرتے ہوئے میری گاڑی کا ٹائر پنچر ہو گیا۔ ڈگی میں دوسرا ٹائر بھی نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا کہ قائد اعظم روڈ پر ہماری فرم کا ہیڈ آفس ہے، میں نے سوچا کہ میں وہاں چلی جاتی ہوں اور اگر وہاں ہو تو وہ اپنے ڈرائیور کو کہہ کر مجھے گھر ڈراپ کروادے گا۔ میرے ڈرائیور کو بھی اس آفس کا پتا تھا اور جہاں میری گاڑی پنچر ہوئی تھی، وہاں سے کچھ فاصلے پر ہی وہ آفس تھا۔ ڈرائیور مجھے وہاں تک چھوڑ گیا۔

میں آفس کے اندر چلی گئی تھی۔ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی ریسپشنسٹ سے میں نے اپنا تعارف کروایا تھا وہ حیرانی سے میرا منہ دیکھنے لگی تھی۔ مجھے اس کی حیرانی سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے عمر کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ آفس میں نہیں ہیں، اس پر میں نے اس سے کہا کہ وہ آفس کی کسی گاڑی پر مجھے گھر ڈراپ کروانے کا انتظام کرے۔ وہ میرے مطالبے پر عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

”دیکھیں، یہ تو میں جانتی ہوں کہ آپ مسز عمر نہیں ہیں لیکن آپ کون ہیں؟ یہ میں نہیں جانتی۔ نہ ہی یہ جانتی ہوں کہ آپ غلطی سے یہاں آئی ہیں یا کسی نے آپ کو بھیجا ہے۔“

مجھے اس کی بات پر غصہ آ گیا تھا۔

”کیا سمجھ رہی ہو تم مجھے؟ کیا خیال ہے تمہارا کہ میں کون ہوں؟“

”میں مسز عمر کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ عمر صاحب کو کئی بار لہجے پر لینے آتی ہیں اور ویسے بھی کبھی کبھار آتی رہتی ہیں اور آپ مسز عمر نہیں ہیں۔“

اس کی بات مجھے بم کے دھماکے جیسی لگی تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے کسی نے مجھے چار سو چالیس دولت کا شاک دیا ہو۔

”او خدا کیا کہہ رہی ہے؟“ میرا دل دھڑکنے لگا تھا۔

”عمر! تم۔“ میں آگے کچھ نہیں سوچ سکی۔ میرے تاثرات سے بے خبر وہ کہہ رہی تھی۔

”اگر آپ مسز عمر ہیں تو آپ کو اپنے گھر کا علم ہونا چاہئے آپ اپنے گھر کا ایڈریس بتادیں؟“

میں نے عجیب سی کیفیت میں اپنے گھر کا ایڈریس دہرایا۔ اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔

”لیکن عمر حسن صاحب کے گھر کا ایڈریس 104 ڈی بلاک ماڈل ٹاؤن ہے۔ گلبرگ میں ان کے بھائی کا گھر ضرور ہے مگر اس کا ایڈریس بھی وہ نہیں جو آپ بتا رہی ہیں۔ آپ کوئی بہت بڑی فراڈ۔“

میں نے اس کی بات پوری سننا گوارا نہیں کیا تھا۔ تیز قدموں سے میں آفس سے باہر نکل آئی تھی۔ میں بے حد طیش میں اس جگہ پر آئی جہاں میری گاڑی تھی۔ گاڑی اب بھی وہیں تھی لیکن ڈرائیور نہیں تھا شاید وہ پاس کے کسی دکان سے کسی آدمی کو لینے گیا تھا۔ میں وہیں کھڑی اس کا انتظار کرتی رہی۔ وہ گاڑی کا ٹائز اتار کر پاس ہی کہیں پتھر لگوانے گیا تھا۔ جب وہ آیا تو میں نے اسے گھر کے بجائے ماڈل ٹاؤن کا ایڈریس بتا کر وہاں چلنے کے لئے کہا۔

وہ مجھے مطلوبہ گھر کے سامنے لے آیا تھا۔ اس گھر کے سامنے میرا گھر ایک جھوپڑی تھا۔ وہ گھر بلاشبہ خوبصورتی کا شاہکار تھا۔

”عمر حسن! میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں۔“

میں نے اپنے دل میں عزم کیا تھا۔ میں اس گھر کے اندر چلی گئی تھی میرا وجود جیسے آگ میں جل رہا تھا جی چاہ رہا تھا میں اس گھر اور اس کی ہر چیز کو آگ لگا دوں۔ پھر وہ بچہ میرے سامنے آیا تھا اور میرا دل چاہا میں اپنے بال نوچنے لگوں۔ اپنے کپڑے پھاڑ دوں اس بچے کے کلڑے کر دوں۔

”عمر حسن! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ میرا دل لہو ہو رہا تھا۔ میری آنکھوں میں بھی خون اتر رہا تھا۔

اور پھر میں نے اسے دیکھا تھا مسز عمر کو، اس عورت کو جس نے میرے حق پر ڈاکہ ڈالا تھا، جس نے میرا گھر برباد کر دیا تھا۔ وہ چہرہ شناسا تھا۔ میں نے اسے دیکھا اور یوں لگا جیسے کسی نے میرے جلتے ہوئے وجود کو ایک برقی قبر میں دفن کر دیا ہو۔

ہاں وہ ثناء تھی۔ وہی ثناء جس سے میں نے عمر حسن کو چھینا تھا۔ میں کچھ بول سکی نہ کچھ سوچ سکی۔ اس کی آنکھوں میں بے تحاشا سکون تھا۔ مجھے لگا جیسے اس کی آنکھیں مجھ پر ہنس رہی ہوں۔ اس نے اپنے بیٹے کا ہاتھ تھاما اور اندر چلی گئی میں بھاگتی ہوئی باہر آ گئی۔

سترہ سال میں پہلی بار میں دل سے روئی تھی اور اتنا روئی تھی کہ شاید کبھی کوئی نہیں روئے گا۔ میں جہاں سترہ سال پہلے تھی، اب بھی وہیں کھڑی تھی۔ سترہ سال میں نے خود کو فریب دے دے کر گزارے تھے اور مجھے پتا ہی نہیں کہ عمر حسن سراب ہے۔ نہ وہ سترہ سال پہلے میرا تھا نہ اب میرا ہے۔ میں اپنا کمرہ بند کر کے سارا دن ماتم کرتی رہی تھی اور مجھے اب کرنا ہی کیا تھا۔

وہ رات کو گھر آیا تھا۔ اسے کچھ کہنے، اسے کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ وہ پہلے ہی باطمینان تھا اور بے حد پرسکون تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ میرے سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔

”میں نے تم سے کبھی محبت نہیں کی۔ نہ پہلے کبھی، نہ آج، نہ ہی آئندہ کروں گا، میں تم سے محبت کر ہی نہیں سکتا۔ تم سے میرا رشتہ محبت کا رشتہ ہے نہ ضرورت کا۔ صرف مجبوری کا رشتہ ہے۔“

وہ بڑے سکون سے میرے کانوں میں صور پھونک رہا تھا۔

سترہ سالوں میں پہلی بار وہ اس طرح رو برد مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے سب کچھ کہا تھا، سب کچھ۔ مجھے خواہش تھی کہ وہ مجھ سے بہت سی باتیں کرے۔ اس نے آج میری وہ خواہش پوری کر دی تھی۔

”عمر! میں نے تم سے محبت کی تھی۔ تمہارے لئے قربانی دی تھی۔ تمہارا گھر بسایا تھا۔“

میں نے اس سے کہا تھا۔ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا وہ بڑی بے رخی سے مسکرایا تھا۔

”یہ سب تمہاری خواہش تھا۔ میری نہیں۔ میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ مجھ سے محبت کرو۔ میں نے نہیں کہا تھا کہ میرا گھر بناؤ اور کون سی قربانی دی ہے تم نے میرے لئے۔ کوئی قربانی نہیں دی تم نے۔ قربانی ثناء نے دی تھی۔ ایک دو نہیں بہت سی اور اب تک دیتی آرہی ہے۔ یہ وہ تھی جو میرے لئے بڑے گھر کو چھوڑ کر آئی تھی۔ یہ وہ تھی جس نے مجھ سے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ یہ وہی تھی جس نے میری کنگالی کے دنوں میں مجھے اور میرے گھر کو سپورٹ کیا۔ یہ وہ تھی جس نے میری ماں کی ہر غلط اور ناجائز بات کو برداشت کیا۔ تمہیں برداشت کیا۔ یہ وہ تھی جس نے اپنا پورا زہور میری بہن کی شادی کے لئے بچ دیا۔ قربانی اگر کسی نے دی تو اس نے دی، تم نے نہیں۔ تمہیں تو سب کچھ ملا۔ بتاؤ کیا تمہیں ملا تمہیں؟ شادی کے بعد سے کون سی خواہش تمہاری پوری نہیں ہوئی؟ میں نے تمہیں سب کچھ دیا۔ سب کچھ تاکہ تم کبھی مجھ پر کوئی احسان نہ جتا سکو۔ مجھ پر اگر کسی کے احسان ہیں تو ثناء کے اور ایسا کوئی نہیں ہے جس کے احسان کا بدلہ میں نہ دے سکوں۔“

اس نے مجھے آسمان سے زمین پر لپٹا تھا۔

”شائلہ! میں سب کچھ جان گیا تھا۔ تمہاری اور امی کی اصلیت دیر سے سہی مگر میں پہچان گیا تھا۔ تم نے پوری پلاننگ سے میرا گھر برباد کیا تھا۔ میں تب سوچتا تھا کہ تم صرف امی کے لئے آتی ہو مگر شہاء ٹھیک کہتی تھی، تم امی کے لئے نہیں اس گھر کو برباد کرنے کے لئے آتی تھیں۔ بہت ہنگامہ چلایا تھا تم نے کہ شہاء نے تمہیں بدنام کر دیا ہے۔ اب کوئی تم سے شادی کرنے کو تیار نہیں ہے۔ نہیں شائلہ! تمہیں بدنام ہونے کا کوئی دکھ نہیں تھا۔ تم بہت خوش تھیں کیونکہ تم یہی چاہتی تھیں کہ تم بدنام ہو اور میں مجبور ہو کر تم سے شادی کر لوں۔“

”یا اللہ کیا ہر انکشاف آج ہی ہو گا۔“ میں نے کرب سے آنکھیں بند کر لی تھیں مگر وہ آواز بند نہیں ہوئی۔

”تمہارا والہانہ پن، تمہاری بے اختیاریاں، تمہارے انداز، تمہاری باتوں ہر چیز نے شہاء کے شے کی تصدیق کی تھی۔ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھیں اور اس کے لئے جو چاہا تم نے کیا۔ میں جان گیا تھا۔ میں تمہیں جان گیا تھا۔ تمہارے اندر کیا تھا۔ مجھ سے کچھ بھی چھپا نہیں رہا لیکن میرے پاس تم سے جان چھڑانے کا کوئی رستہ نہیں تھا۔ مجھے شہاء سے صرف دو دن کے لئے نفرت ہوئی تھی، صرف دو دن کے لئے اور اس دو دن نے میرے اور اس کے درمیان اتنی دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔ جنہیں پار کرنے میں مجھے تین سال لگ گئے۔ میرے غصے، میری جلد بازی، میری حماقت نے ڈھائی سال تک اسے ایک جہنم میں رہنے پر مجبور کیا تھا اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا تھا۔ تمہاری وجہ سے میں نے اسے طلاق دی۔

تمہاری وجہ سے اسے اس شخص کے ساتھ ڈھائی سال گزارنے پڑے جس نے اسے جسمانی اور ذہنی دونوں طرح سے ناز چرایا۔ تم نے کبھی سگریٹ سے جسم پر پڑنے والے آبلے دیکھے ہیں؟ نہیں! کیونکہ میں نے کبھی تمہارے جسم کو سگریٹ سے نہیں جلایا۔ تمہارے جسم پر کبھی کسی نے ٹھوکریں ماریں ہیں؟ نہیں! اس کے جسم پر بہت دفعہ ماری گئی ہیں۔ تمہیں کبھی میں نے بیٹوں سے پیٹا ہے؟ نہیں! مگر اسے اس کا شوہر بیٹا رہا ہے۔ تمہیں میں نے کبھی گالی نہیں دی اسے بہت دی گئی ہیں اور یہ سب ایک دن دو دن یا ایک ہفتہ، دو ہفتہ نہیں ہوا، یہ سب ڈھائی سال ہوا ہے اور یہ سب میری اور تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ میں اسے طلاق نہ دیتا تو وہ کبھی اس ذہنی مریض کے ہتھے نہ چڑھتی اور پھر طلاق کے لیبل سے بچنے کے لئے یہ سب چھپاتی نہ پھرتی۔ لیکن میں نے اسے طلاق دے دی جو اس نے برداشت کیا ہے

دہ تم کبھی کیلف اور قربانی کے لفظ تمہیں صرف کہنا آتے ہیں تم ان کا مطلب نہیں

جانتیں۔ تم جانتی ہو، میں نے اسے کہاں دیکھا تھا؟ وہ ایک سرکاری ہسپتال میں اپنے ہاتھ کی ٹوٹی ہوئی ہڈی اور خون سے لٹھڑے ہوئے چہرے کے ساتھ ایک جھکٹھے میں کھڑی تھی اور مجھے دیکھ کر اس نے اپنے چہرے کو چادر سے چھپا لیا تھا۔ تم اس کرب کا اندازہ نہیں کر سکتیں جس سے میں گزرا تھا۔

شہاء وہ تھی جسے میں نے کبھی سخت ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اور وہ شخص معمولی بات پر اسے جانوروں کی طرح پیٹتا تھا۔ پتا ہے شائلہ! اس دن میرا دل کیا چاہتا تھا؟ میرا دل چاہتا تھا، میں بھی تمہارے جسم پر اسی طرح ٹھوکریں ماروں جیسے وہ اس کے جسم پر مارتا تھا، جلتے ہوئے سگریٹ کو تمہارے جسم پر مسل کر بجھاؤں تاکہ تمہیں پتا چلے کہ تم نے شہاء کے ساتھ کیا کیا تھا۔“

وہ کہتا جا رہا تھا۔ بس کہتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں اور اس کے چہرے پر میرے لئے اتنی نفرت تھی کہ میں اسے دیکھ نہیں پائی۔ میں نے اپنے سر کو گھٹنوں میں چھپا لیا وہ تب بھی خاموش نہیں ہوا تھا۔

”میں اس دن تمہیں طلاق دے دینا چاہتا تھا۔ میں تمہیں رکھنا نہیں چاہتا تھا مگر مجھے ارم کا خیال آ گیا۔ وہ بہت چھوٹی تھی۔ اسے ابھی تمہاری ضرورت تھی۔ میں ایک بار پھر جلد بازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے صبر کیا پھر میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔ میں نے اس کے والدین سے مل کر اس شخص سے اس کو طلاق دلوائی تھی اور پھر اس سے شادی کر لی تھی۔ ایک سال تک ہم دونوں خاموش رہے ایک دوسرے سے کہنے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ اگر کبھی روتی تو مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ میں اسے خاموش کر داسکوں۔ اسے کوئی دلاسا دے سکوں۔ ایک مجرم کی طرح میں اس کے سامنے جایا کرتا تھا اور یہ سب تم نے کیا تھا۔ اس سب کی ذمہ دار تم تھیں۔“

میں اس کی آواز سے اس کے دل کی کیفیت جان رہی تھی۔ آج جیسے یوم حشر تھا۔

”جب ارم کچھ بڑی ہوئی تو میں تمہیں طلاق دے دینا چاہتا تھا۔ میں نے شہاء سے اس بارے میں بات کی تھی اور اس نے سختی سے مجھے مجبور کیا تھا کہ میں ایسا نہ کروں، وہ نہیں چاہتی تھی کہ تمہاری بیٹی کی زندگی برباد ہو۔ تمہارے ساتھ وہ کچھ ہو جو اس کے ساتھ ہوا تھا۔ اس نے مجھے تمہارے ساتھ شہزادہ بنا کر قبول کر لیا تھا۔ پھر ایسے بہت سے مواقع آئے تھے جب میں تم سے جان چھڑانا چاہتا تھا، میں صرف ایک گھر چاہتا تھا، شہاء کے ساتھ۔ دو گھر دوں سے تنگ آ گیا تھا۔ لیکن ہر بار وہ نہیں مانی۔ ہر بار وہ مجھے مجبور کر دیتی کہ میں تمہیں طلاق نہ دوں۔“

اس نے ایک ایک کر کے بے شمار بھالے میرے سینے میں اتار دیئے تھے۔

”تو تمہارے ساتھ پچھلے سترہ سال میں نے بھیک میں ملی خیرات کے طور پر گزارے ہیں۔“ میں اپنے سر کو اٹھا نہیں پار ہی تھی۔

”میرے اور ثناء کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ میں تم سے اسی لئے اور کوئی اولاد نہیں چاہتا تھا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہارا کوئی بیٹا ہو اور ثناء کے بیٹوں کے ساتھ میرے کاروبار کو شیر کرے۔ میرا سب کچھ ثناء اور اس کی اولاد کا ہے اور میں چاہتا تھا کہ میرا نام اور میری نسل ثناء سے ہی چلے۔ تم پوچھتی تھیں تاکہ اتنے بڑے کاروبار کو کون سنبھالے گا۔ میرے اور ثناء کے بیٹے سنبھالیں گے۔ میں اپنا تقریباً سارا کاروبار اور جائیداد ان چاروں کے نام کر چکا ہوں۔ تمہارے لئے میں نے یہ گھر رکھا ہے اور ارم اور اقصیٰ کے لئے بنک میں کچھ روپیہ ڈیپازٹ کر دیا چکا ہوں۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز پر تم لوگوں کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ اس شہر میں سز عمر کے نام سے اگر کوئی جانا جاتا ہے تو وہ ثناء ہے۔ تم اگر اپنا تعارف اس حوالے سے کراؤ گی تو لوگوں کے مذاق کا نشانہ بنو گی۔ اس لئے آئندہ کبھی اس حوالے سے اپنا تعارف مت کروانا، نہ ہی کبھی دوبارہ میرے گھر جانا۔ تم خاندانی بیوی ہو مگر دوسری بیوی، ہمیشہ دوسری ہی رہو گی۔ تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ تم شاپنگ کرتی رہو۔ خاندان سے میل ملاپ رکھو اور وہاں میرے حوالے سے عزت حاصل کرتی رہو۔ مگر ثناء میری پہلی بیوی ہے اور جہاں جہاں میں جاؤں گا، وہاں میری بیوی کی حیثیت سے وہی جائے گی اور اسے ہی عزت ملے گی تمہیں نہیں۔“

میں نے آنسوؤں سے ترچہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا وہ آج بھی اتنا ہی دور نظر آ رہا تھا جتنا سترہ سال پہلے تھا۔

”تم نے اتنے سال مجھ سے یہ سب چھپایا کیوں؟“ میں نے اس سے پوچھا تھا۔

”ہاں، صرف تم سے میں نے چھپایا تھا اور کسی سے نہیں۔ امی اور انصر دونوں ثناء سے میری شادی سے واقف ہیں۔ تمہیں بتا گئے ہیں۔ تمہیں ضرورت ہی نہیں محسوس کی۔“

میں اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی تھی۔ میرے قدموں تلے سے زمین کھینچنے میں وہ اکیلا نہیں تھا۔ وہ بے حد مطمئن، بے حد پرسکون تھا۔ اس نے میرے پاس کچھ بھی رہنے نہیں دیا تھا اور میں پچھلے سترہ سالوں میں یہ سوچ کر خوش ہوتی رہی تھی کہ میرے پاس سب کچھ ہے اور یہ ”سب کچھ“ ہمیشہ کے لئے ہے، مگر یہ سب فریب تھا۔ ثناء کا آسیب ہمیشہ میری زندگی میں رہا

تھا اور اس آسیب نے ایک بار پھر میرے وجود کو نگل لیا تھا۔

”عمر! میں تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ تم مجھے طلاق دے دو، اتنا بڑا دھوکا کھا کر میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“

میں نے پتا نہیں یہ کہنے کا حوصلہ کہاں سے پیدا کیا تھا۔

”مجھے تمہیں طلاق دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ خوشی ہوگی لیکن تم اچھی طرح اس بات کے بارے میں سوچ لو اور پھر مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا۔ میں ارم اور اقصیٰ کو تم سے نہیں چھینوں گا۔ وہ تمہارے پاس ہی رہیں گی۔ میں انہیں مثل کاک بنانا نہیں چاہتا لیکن تم یہ ضرور سوچ لو کہ تمہارے اس فیصلے سے ان دونوں کے ذہن اور زندگی پر کیا اثر ہوگا تمہیں کچھ سالوں کے بعد ان دونوں کی شادی بھی کرنی ہے اور کسی مطلقہ کی بیٹی کو بیاہ کر لانے سے پہلے لوگ ہزار بار سوچتے ہیں پھر بھی اگر تم طلاق ہی چاہتی ہو تو ٹھیک ہے۔ میں تمہیں طلاق دے دوں گا لیکن بہتر ہے تم اچھی طرح اس بارے میں سوچ لو۔“

وہ یہ کہہ کر بڑی لاپرواہی سے اپنا بریف کیس اٹھا کر چلا گیا اور میں تب سے اسی کرسی پر جھول رہی ہوں۔ چیزوں کو جننے ہوئے کتنے مہینے کتنے سال لگ جاتے ہیں مگر جب وہ ختم ہونے لگتی ہیں تو پھر سب کچھ لحوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ میں کرسی پر جھولتے ہوئے سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے مرر میں اپنے وجود کو دیکھ رہی ہوں۔ مرر مجھے سبز کپڑوں میں ملبوس تراشیدہ بالوں والی ایک فریبی مائل چالیس سالہ عورت کا عکس دکھا رہا ہے جس کا ماضی ایک فریب تھا اور مستقبل ایک خواب رہا ہے۔ جس کا خوب صورت چہرہ اس مرد کے دل کو نہیں جیت پایا تھا جسے اس نے سب سے زیادہ چاہا تھا۔

”میں یہ نہیں مانتی کہ مرد کے لئے قربانی دی جائے اور وہ اسے بھون جائے۔ اس کا کوئی صلہ نہ دے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ بندہ جو آپ کا شوہر ہے، آپ سے محبت کرتا ہے، آپ اس کے لئے کچھ کریں تو وہ اسے بھلا دے۔ اس کے نزدیک اس کی کوئی وقعت ہی نہ ہو اور پھر ہم دونوں میں تو ذہنی ہم آہنگی ہے۔ ہمیں تو اپنی بات ایک دوسرے تک پہنچانے کے لئے بعض دفعہ لفظوں کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ کم از کم عمر حسن وہ واحد شخص ہے جس کے بارے میں میں کہہ سکتی ہوں کہ وہ احسان فراموش نہیں ہے۔“

بہت سال پہلے ایک بار ثناء نے اپنی کسی دوست سے کہا تھا۔ اس کی آواز میرے کانوں میں لہرا رہی تھی۔ ہاں عمر حسن، احسان فراموش نہیں تھا۔ اس میں وہ خوبیاں تھیں جو عام مردوں میں نہیں تھیں اور ان خوبیوں کی وجہ سے ہی میں اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی

مجھ میں اس جیسی کوئی خوبی نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے اس کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش کی تھی۔

ہم باکمل لوگ مکمل لوگوں کے ساتھ کبھی نہیں چل سکتے، کبھی ہمارا سانس پھول جاتا ہے اور کبھی وہ ہمیں بہت پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

میرے ساتھ یہ دونوں باتیں ہوئی تھیں۔ مجھے اپنے کسی فعل پر کوئی شرمندگی، کوئی افسوس نہیں ہے۔ میں نے جو ٹھیک سمجھا، اسے حاصل کرنے کے لئے کیا۔ میں انسان تھی کوئی فرشتہ نہیں اور پھر سب یہی کرتے ہیں۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا، اگر میری وجہ سے ثناء کو تکلیفیں اٹھانی پڑیں تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ یہ سب اس کی قسمت میں تھا پھر عمر حسن مجھے ان سب چیزوں کا ذمہ دار کیسے ٹھہرا سکتا ہے۔ میں نے سترہ سال کے دوران سب کچھ پالیا تھا۔ دولت، گھر، بچے، سکون، میں نے سوچا تھا، اب دنیا میں کچھ اور پانے اور حاصل کرنے کے لئے باقی نہیں رہا، مگر مجھے یہ پتا نہیں چلا تھا کہ عمر حسن، ہاں بس عمر حسن میرا نہیں ہوا۔ میں نے اس کو اتنا چاہا تھا کہ اس کے عشق میں اپنے وجود کو آگ بنا ڈالا تھا اور اس آگ نے کتنوں کو جلایا۔ مجھے کبھی اس کا احساس نہیں ہوا۔

اب یہاں اس کمرے میں کرسی پر جھولتے ہوئے میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں۔ اس سے طلاق لے لوں تو اس عمر میں اپنے چہرے، اپنے ماتھے پر یہ داغ کیسے سجالوں۔ اپنی بیٹیوں کو میں کیا بتاؤں کہ میں عمر حسن سے طلاق کیوں لے رہی ہوں۔ اپنے ماضی کے کارنامے کو ان کے سامنے کیسے رکھ دوں۔ وہ تو پھر بہت سے سوال کریں گی میرے بارے میں، عمر حسن کے بارے میں اور ثناء کے بارے میں اور میں انہیں کوئی جواب نہیں دے سکتی اور اگر انہیں مطمئن کر بھی دوں تو ان لوگوں کو کیسے مطمئن کروں گی جو میری بیٹیوں کا رشتہ لینے آئیں گے اور اور اگر میں طلاق نہ لوں تو زندہ کیسے رہوں؟ پچھلے سترہ سال جس فریب، جس سراب کے ساتھ رہی ہوں، اس کے ساتھ آگے کیسے رہوں۔ اس کی بے اعتبار نظروں اور اجنبی لہجے کو کیسے برداشت کروں جو میرا خون کر دیتے ہیں اور یہ کیسے برداشت کروں کہ وہ اسی شہر میں ایک گھر میں اس عورت کے پاس بھی جاتا ہے جسے وہ سب سے زیادہ چاہتا ہے۔ یہ کیسے برداشت کروں کہ میرے لئے اس کی نظروں میں نفرت اور اس کے لئے محبت ہو۔ میں دورا ہے پر کھڑی ہوں اور جانتی ہوں کہ منزل دونوں ہی رستوں پر نہیں ہے پھر بھی مجھے ایک رستہ چننا ہے اور میں انتخاب نہیں کر پارہی۔

اور اب میں آپ سے پوچھ رہی ہوں۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں کون سا رستہ

چنوں۔ مجھے یہ بتانے کی طرورت نہیں ہے کہ میں نے اچھا کیا یا برا۔ مجھ پر نیکی اور بدی کا فتویٰ جاری مت کیجئے۔ میں سب جانتی ہوں، صرف یہ نہیں جانتی کہ مجھے کیا فیصلہ کرنا چاہئے اس لئے آپ سے آپ کی مدد چاہتی ہوں۔ شاید آپ مجھے اس برزخ سے نکال لیں جس میں، میں اپنی مرضی سے گری ہوں مجھے بتائیں اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟



کوئی بات ہے تیری بات میں

ڈور نیل تیسری بار بجی تھی جب اس نے جھنجھلا کر ہلاآ خراٹھنے کا ارادہ کر ہی لیا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل سے اس نے رسٹ واچ اٹھا کر ادھ کھلی آنکھوں سے وقت دیکھا صبح کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔

اس نے بیڈ سے اٹھ کر سلپرز پہنے اور پھر شرٹ پہن لی۔ شرٹ پہنتے ہوئے نیل ایک بار پھر بجی تھی اور وہ بری طرح جھنجھلایا ہوا تھا۔

گیٹ پر جو کوئی بھی تھا وہ بڑے تواتر سے نیل بجا رہا تھا اور کافی مستقل مزاج بھی لگتا تھا۔

واچ مین اس وقت اپنے کوارٹر میں ہوتا تھا اور وہ جانتا تھا کہ دروازہ اسے ہی کھولنا پڑے گا کیونکہ گھر میں اس وقت کوئی نہیں تھا بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتے ہوئے وہ اندر سے نکل آیا۔

پورچ سے گیٹ تک کا فاصلہ طے کرنے کے دوران نیل پھر بجی تھی اور اس بار اس نے عقبی لان سے جیک کو بھونکتے ہوئے بھاگتے دیکھا۔ اس کے گیٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی جیک گیٹ پر پہنچ گیا تھا اور اپنے اگلے پنجوں سے گیٹ کو بجاتے ہوئے وہ بڑے زور و شور سے بھونک رہا تھا۔

گیٹ کے نچلے حصے میں لگی ہوئی سلاخوں سے اس نے کسی لڑکی کی ٹانگیں دیکھی تھیں جو کتے کے بھونکنے پر گیٹ سے کافی دور چلی گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ نیل دوبارہ بھتی اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کی چین اتار کر اسے کھول دیا۔

سامنے موجود چہرہ اس کا شناسا نہ تھا۔ وہ انیس بیس سال کی ایک لڑکی تھی جو چادر میں لپیٹی ہوئی تھی۔ دھوپ میں کھڑے رہنے کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس سے

پہلے کہ وہ کچھ کہتا وہ بول اٹھی تھی:

”سوری جی میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔“

شاید اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ جھنجھلایا ہوا تھا۔ وہ اسکی معذرت پر کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا ورنہ وہ اسے بار بار تیل کرنے پر مجبور کرنا چاہتا تھا۔

”میں ٹیچر ہوں، ہم لوگ فیصل آباد سے یہاں ایک شارٹ کورس کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ہم یہ ساتھ والی عمارت میں ٹیچرے ہوئے ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ وہاں سارے کرسیز ہوتے ہیں لیکن میں مسلم ہوں۔ مجھے دراصل آٹھواں سپارہ چاہئے اگر آپ مجھے دے دیں تو میں پڑھ کر آپ کو واپس کر جاؤں گی۔“

اس نے اس لڑکی کی بات کافی حیرت سے سنی تھی کیونکہ اسے ایسی کسی فرمائش کی توقع ہی نہیں تھی۔ چند لمحوں کے لئے وہ شش و پنج میں پڑا رہا۔

”اوکے میں دیکھتا ہوں۔“ وہ ہلاآ خراٹھ کر واپس مڑ گیا۔

”پلیز ایک منٹ“ وہ دو قدم ہی چلا تھا کہ دوبارہ اس لڑکی نے اسے آواز دی۔ وہ واپس مڑ آیا۔

”دیکھیں یا تو آپ اس گیٹ کو اندر سے بند کر کے جائیں یا اس کتے کو یہاں سے لے جائیں۔“ اس نے جیک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا جو بڑے اطمینان سے زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔

”ایک تیسرا راستہ اور بھی ہو سکتا ہے میں آپ کو اندر کیوں نہ لے جاؤں۔“ وہ بے اختیار بولتے بولتے رکا تھا۔

”یہ کچھ نہیں کہتا“ اس نے مسکرا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

”کر تو بہت کچھ سکتا ہے۔“ جواب بہت برجستہ تھا۔ اگرچہ اس لڑکی کی نگاہ ابھی تک کتے پر ہی مرکوز تھی۔

”یہ کرتا بھی کچھ نہیں۔“ اس نے ایک بار پھر مسکرا کر کہا۔

”پھر بھی آپ گیٹ بند کر کے جائیں۔“ وہ ابھی بھی اپنے مطالبے پر قائم تھی۔

”آپ اندر آ جائیں۔“ اس نے ہلاآ خراٹھ سے پیشکش کر ہی دی۔

”نہیں شکر یہ آپ بس مجھے سپارہ لا دیں۔“

اس نے اس لڑکی کے انکار پر کندھے اچکائے اور بنا کچھ کہے گیٹ بند کر کے اندر کی طرف چل دیا۔

چھوٹے ہوئے اسے جانے کا اشارہ کیا تھا اور وہ اس کے اشارے پر بھاگتا ہوا پھر عقبی لان کی طرف چلا گیا۔ کتے کے جانے پر وہ کافی مطمئن نظر آ رہی تھی۔

وہ اسے اپنی دادی کے کمرے میں لے آیا اور پھر وہیں دروازے پر کھڑا ہو گیا۔

”سامنے والی الماری میں ہیں۔“ اس نے اشارے سے لڑکی کو بتایا تھا اور خود اطمینان سے ٹن کو دوبارہ منہ سے لگا لیا۔ وہ لڑکی الماری کھول کر بڑی احتیاط سے سیپاروں کو دیکھنے لگی تھی۔ وہ دروازے سے ٹیک لگائے سپرائٹ کے سب لیتا ہوا اس کی کارروائی دیکھتا رہا۔ اسے جلد ہی سیپارہ مل گیا تھا اور باقی سیپاروں کو اسی احتیاط کے ساتھ اس نے واپس رکھ دیا۔ پھر الماری بند کر کے وہ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اس کے قریب رک کر سیپارے کو سیدھا کیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر اس نے اردو میں لکھے ہوئے آٹھ پراگشت شہادت پھیرتے ہوئے کہا:

”یہ اردو کا آٹھ اور انگلش کا Eight ہے۔“

اس نے بے اختیار اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ اب اس کی طرف ایسے دیکھ رہی تھی جیسے جاننا چاہ رہی ہو کہ وہ اس کی بات سمجھا ہے یا نہیں اس نے بغیر سوچے سمجھے سر ہلا دیا۔

پھر وہ کچھ کہے بغیر بیرونی دروازے کی طرف چلنے لگی۔ دروازہ سے نکلنے ہوئے اس نے اچانک مڑ کر کہا۔

”میں پڑھنے کے بعد اسے واپس کر جاؤں گی۔“ وہ صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

گیٹ بند کر کے جب وہ واپس لوٹا تو وہ مسلسل اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بہت عجیب سا تاثر چھوڑا تھا اس نے اس پر، لیکن جلد ہی وہ اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔



وہ فیکٹری جانے کے لئے تیار ہو کر پورچ میں کھڑی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا جب تیل ایک بار پھر بجی تھی۔ اسے ایک دم اس لڑکی کا خیال آیا تھا اور وہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے رک گیا تھا۔ واچ میں اس وقت دروازے پر موجود تھا اس لئے اب کی بار اسے دروازہ کھولنے کے لئے نہیں جانا پڑا۔ وہ وہیں گاڑی کے کھلے دروازے سے بازو نکالے گلاسز ہاتھ میں لئے اسے دور سے آتا دیکھتا رہا۔ وہ سیدھی اس کے پاس آئی تھی۔ سیپارہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے شکر یہ ادا کیا تھا۔ پھر جب اس نے سیپارہ پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس نے اچانک پوچھا۔

وہ اندر آ کر سوچ میں پڑ گیا کہ سیپارہ اسے ل کہاں سکتا ہے۔ بچپن میں بلاشبہ اسے قرآن پاک پڑھا تھا لیکن اب بہت عرصے سے اس نے کبھی قرآن پاک کی تلاوت ہی نہیں کی تھی۔ غلطی اس کی نہیں تھی وہ پچھلے چھ سات سال سے امریکا میں تھا اور اس سے پہلے جب وہ پاکستان میں تھا تب بھی اس پر والدین کی طرف سے اس قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی اور فطری طور پر بھی وہ مذہب سے کچھ دور ہی تھا۔ پھر باہر رہنے سے تو وہ جو سال میں دو بار جیسے تیسے عید کی نماز پڑھ لیتا تھا اس سے بھی گیا تھا۔ اس لئے اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سیپارے یا قرآن پاک کہاں تلاش کرے۔

چند لمحے وہ ایسے ہی پریشانی کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر ایک خیال آنے پر اپنی دادی کے کمرے کی طرف چل دیا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ دادی باقاعدگی سے نماز پڑھتی تھیں اور ان کے کمرے میں یقیناً قرآن پاک بھی ہوگا۔ کمرے میں داخل ہونے کے چند لمحوں تک متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر تخت پوش کے ساتھ والی الماری کی طرف بڑھ گیا اور الماری کھولتے ہی اس کے سامنے بڑے سلیقے اور نفاست سے رکھے گئے بہت سے سیپارے اور قرآن پاک آگئے تھے۔ وہ سیپاروں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے ایک دم ٹھنک گیا۔ بے وضو ہونے کا خیال آنے پر اس نے واش روم جا کر ہاتھ دھوئے۔ پھر واپس آ کر وہ آٹھواں سیپارہ تلاش کرنے لگا۔ لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ سیپاروں کے اوپر عربی اور اردو میں گنتی کے نمبر تھے اور دونوں ہی گنتیاں اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔ اس نے کچھ اندازہ کرنے کی کوشش کی آٹھواں سیپارہ کون سا ہو سکتا ہے۔ لیکن جس مقدس کتاب کو اس نے پچھلے پندرہ سولہ سال سے کھول کر نہیں دیکھا تھا اب اس کے بارے میں کچھ یاد کیسے آ جاتا۔ اس نے ان پاروں کو ویسے ہی رکھ دیا۔

واپس لاؤنچ میں آ کر اس نے فریج سے سپرائٹ کاٹن نکالا اور اسے کھول کر پیتے ہوئے باہر آ گیا۔ جب اس نے گیٹ کھولا تو وہ لڑکی اس کے ہاتھ میں اپنی مطلوبہ چیز کی بجائے سپرائٹ کاٹن دیکھ کر بہت حیران ہوئی تھی۔

”دیکھیں میں نے سیپارہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن مجھے وہ نہیں ملا کیونکہ مجھے عربی یا اردو کی گنتی نہیں آتی۔ آپ ایسا کریں کہ خود ہی اندر آ کر مطلوبہ سیپارہ لے لیں۔“ اسے لگا کہ اس کی بات پر لڑکی نے ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ لیکن وہ نظریں چرا کر ایک طرف ہٹ گیا۔

چند لمحے سوچنے کے بعد لڑکی نے اندر قدم رکھ دیا۔ اس نے جیک کو پاؤں سے

”آپ نے وضو کیا ہوا ہے؟“ اس کے سوال کے جواب میں اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور اس لڑکی نے سپارہ پڑاتے ہوئے ایک دم ہاتھ واپس کھینچ لئے تھے۔ اسے بے ساختہ شرمندگی کا احساس ہوا تھا۔

”تو پھر آپ سپارہ کیوں لے رہے ہیں؟“

اسے لگا کہ اس لڑکی کے لہجے میں ہلکی سی تعجب تھی۔ وہ اس کی بات کا جواب نہیں دے سکا لیکن اس نے بڑی ناگواری سے اسے کہا تھا۔

”آپ ایسا کریں کہ اندر رکھ آئیں ملازم اندر ہے۔“ وہ کہہ کر گاڑی میں بیٹھنے لگا تھا جب اس نے دوبارہ اسے آواز دی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی زک گیا ورنہ اس کا موڈ بری طرح بگڑ چکا تھا۔

”مجھے ایک درخواست کرنی ہے، کیا جتنے دن میں یہاں ہوں کیا آپ کے گھر سے قرآن پاک لے کر پڑھ سکتی ہوں۔“ وہ اسے بس دیکھ کر رہ گیا۔ اس کے لہجے میں چند لمحے پہلے کی ترشی کی بجائے عجیب سی التجا تھی۔

”Why not (کیوں نہیں) لیکن آپ ایسا کریں کہ ایک قرآن پاک لے جائیں اور جب آپ کو واپس جانا ہو تب آپ واپس کر جائیں۔“ اس نے اس کے سامنے ایک تجویز پیش کی تھی۔

”میں نے یہ سوچا تھا لیکن پھر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اسے کہاں رکھوں گی۔ وہاں زیادہ تر غیر مسلم ٹھہرتے ہیں اور وہ ہے بھی ان کا مذہبی مرکز وہاں الماریاں تو ہیں لیکن میں وہاں قرآن پاک رکھنا نہیں چاہتی کیونکہ پہلے وہاں کیا رکھا گیا ہو۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کو تکلیف ہوگی لیکن صرف چند دنوں کی تو بات ہے۔ کم از کم مجھے یہ تسلی تو رہے گی کہ قرآن پاک، پاک جگہ پر رکھا گیا ہے۔“

”میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ..... میں تو صرف آپ کی آسانی کے لئے کہہ رہا تھا۔ اگر آپ کو آنے میں کوئی پرالیم نہیں تو ٹھیک ہے..... آپ جب چاہیں آ سکتی ہیں۔“ اس نے بڑے کھلے دل سے اسے آفر کی تھی۔ اس لڑکی نے بڑی ممنونیت سے اسے دیکھا۔ پھر وہ اس کا شکر یہ ادا کر کے اندر چلی گئی۔ وہ اسے اندر جاتا دیکھتا رہا۔ چند لمحوں کے بعد وہ اندر سے نکل آئی اور گیٹ کی طرف چل دی۔

”ایکسکوز می! آپ کا نام کیا ہے؟“ اس نے اسے روکا تھا وہ اس سوال پر کچھ بچکچائی تھی جیسے وہ جواب نہ دینا چاہ رہی ہو۔

”میرا نام مریم ہے“ بلاخراس نے کہہ دیا۔

”تھینک یو بس یہی پوچھنا تھا“ وہ دوبارہ گیٹ کی طرف چل دی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے اسے دیکھتا رہا۔



اگلے دن وہ تین بجے آئی تھی۔ آج پھر اسے نیند سے اٹھ کر دروازے پر آنا پڑا۔ اگرچہ اسے گیٹ نہیں کھولنا پڑا تھا لیکن لاؤنج کا دروازہ اس نے ہی کھولا تھا کیونکہ ملازم اس وقت سروٹ کوارٹر میں موجود تھا اور وہ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے ڈور لاک کر گیا تھا۔ ملازم کو اس نے کہا تھا کہ شام تک اسے ڈسٹرب نہ کرے۔

کچی نیند سے جاگتے ہی اس کے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا تھا کہ شاید ملازم کسی کام سے دوبارہ آیا ہے۔ اسی لئے وہ شرٹ کے بٹن بند کیے بغیر ہی نیچے آ گیا۔ لیکن اب دروازہ کھولنے پر اس لڑکی کو دیکھ کر نہ صرف اس کا غصہ بھاپ بن کر اڑ گیا تھا بلکہ اسے بے تحاشا شرمندگی بھی ہوئی تھی۔ اس لڑکی نے اسے دیکھتے ہی نظریں جھکا لی تھیں۔

”اوه آپ ہیں..... اندر آ جائیں۔ دراصل میں سو رہا تھا۔“ اس نے تیزی سے اپنی شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے جیسے اپنے حلیے کی وضاحت کی تھی۔

”کل تو آپ ساڑھے گیارہ بجے آئی تھیں“ اس نے پوچھا تھا۔ ”ہاں کل سنڈے تھا اس لئے ہمیں جلدی فری کر دیا گیا تھا۔ باقی دنوں میں ہمیں سات سے تین بجے تک کام کرنا ہوتا ہے۔ لیکن شاید میں ٹھیک وقت پر نہیں آئی۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں اگر آپ نہیں بھی آتیں تب بھی مجھے کچھ دیر بعد اٹھنا ہی تھا کیونکہ مجھے فیکٹری جانا تھا۔ سو مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔“

اس نے اس لڑکی کی شرمندگی دور کرنے کے لئے جھوٹ بولا۔

”آپ چاہیں تو کل بھی اسی وقت آ جائیں کیونکہ صبح تو میں فیکٹری ہوتا ہوں کل تو میں سنگاپور سے آیا تھا اس لئے فیکٹری جانے کی بجائے سو گیا تھا۔“

وہ دادی کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اسے تفصیل بتانے لگا۔ اس نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ سپارہ لینے کے بعد جب وہ کمرے نکلی تو اس نے پوچھا۔

”آپ کچھ پینا پسند کریں گی۔“

”نو تھینک یو..... بس مجھے یہی چاہئے تھا۔“

اس لڑکی نے ایک قہرے میں اپنی بات مکمل کی اور دروازے سے باہر نکل گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ دوبارہ آئی تھی اور اس نے دادی کے کمرے میں جا کر سپارہ رکھ دیا تھا۔ وہ لاؤنج میں بیٹھ کر ہی اس کا انتظار کرتا رہا تھا اور اس کے واپس جانے کے بعد دوبارہ اپنے کمرے میں جا کر سو گیا تھا۔

پھر یہ جیسے روزمرہ کا معمول بن گیا تھا۔ وہ آتی سپارہ لیتی وہ اسے چائے کافی کی آفر کرتا، وہ انکار کرتی اور چلی جاتی۔ پھر کچھ دیر بعد واپس آ کر سپارہ اپنی جگہ پر رکھ دیتی۔ ان دونوں کے درمیان اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ لیکن پتا نہیں کیوں اسے وہ لڑکی اچھی لگی تھی۔

ایسا بالکل نہیں تھا کہ وہ پہلی لڑکی تھی جو اسے اچھی لگی ہو۔ اس کی زندگی میں بہت سی لڑکیاں آتی رہی تھیں۔ امریکا جانے سے پہلے بھی اس کی بہت سی گرل فرینڈز رہی تھیں لیکن ان کی دوستی نے کبھی جائز حدود کو کراس نہیں کیا تھا۔ لیکن باہر جا کر ہر دوستی آخری حد پار کرتی رہی تھی اور یہ سب اس کے لئے ایک معمول کی بات بن چکا تھا کیونکہ جس طبقے سے وہ تعلق رکھتا تھا۔ وہاں ان سب باتوں کو غیر معمولی نہیں سمجھا جاتا تھا، یہ ایک عام سی بات تھی۔ پھر اس کے والدین کی طرف سے بھی اس پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی اور فطری طور پر بھی وہ لڑکیوں کی کھپنی پسند کرتا تھا۔ اس میں ایک خاص قسم کی روڈ نہیں تھی جس نے اس کی اچیل کو بہت بڑھا دیا تھا۔

خوبصورت تو وہ تھا ہی لیکن اپنی خوبصورتی کو استعمال کرنا بھی اچھی طرح سے جانتا تھا۔ امریکہ میں بہت سی لڑکیوں کے ساتھ اس کے تعلقات رہے تھے۔ جینفیر تو دو سال تک اسی کے فلیٹ میں رہی تھی اور اس کی فیملی یہ سب جانتی تھی لیکن انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اور واحد زریعہ اولاد ہونے کی وجہ سے اسے ہمیشہ ہی بہت اہمیت دی گئی تھی اور اسی لئے وہ بے حد خود سورا کڑ ہو گیا تھا۔ وہ گھر میں کسی سے خاص لگاؤ نہیں رکھتا تھا سوائے اپنے باپ کے..... لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ کسی کی عزت ہی نہ کرتا ہو۔ وہ اپنی ماں اور بہنوں سے ہمیشہ دیکھے لہجے میں ہی بات کرتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اگر کہیں ان کی کوئی غلطی یا خامی نظر آتی تو وہ صاف صاف کہہ دیا کرتا تھا۔ اسے بناوٹ پسند نہیں تھی نہ اپنے گھر والوں کی نہ دوسروں کی..... سنجیدگی اس کے مزاج کا خاصہ بن چکی تھی اور زندگی کے بارے میں وہ اپنے الگ اور واضح نظریات رکھتا تھا جو قد امت پرست لوگوں کے لئے کافی قابل اعتراض ہو سکتے تھے۔ لیکن بہر حال اس کے طبقے کے لئے نئے نہیں تھے۔

پاکستان واپس آنے کے بعد بھی لڑکیوں میں اس کی دلچسپی ختم نہیں ہوئی تھی۔

یہاں بھی لڑکیوں کے ساتھ اس کی دوستی تھی اور بعض لڑکیوں کے ساتھ یہ دوستی تمام جائز حدود پار کر چکی تھی۔ اسے پاکستان واپس آنے کے بعد امریکہ اور یہاں کے ماحول میں کچھ زیادہ فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ بس یہ تھا کہ جو کام وہاں کلمے عام کر سکتا تھا یہاں وہی کام کچھ احتیاط سے کرنا پڑتا تھا۔ لڑکیوں کے ساتھ ایسے تعلقات رکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت کی عزت اس کے دل سے یکسر ختم ہو گئی۔ اپنی کلاس کی لڑکیوں کو تو وہ بالکل قابل احترام نہیں سمجھتا تھا اور باقی لڑکیوں کے لئے بھی اس کے خیالات زیادہ مختلف نہیں تھے اور بد قسمتی سے جس لڑکی سے بھی اس کا ٹکراؤ ہوا اس نے اس کے ان خیالات کو اور مضبوط کیا تھا۔

جب مریم پہلی بار اس کے سامنے آئی تھی تو اس نے اس لئے کوئی کشش محسوس نہیں کی تھی کیونکہ وہ زیادہ خوبصورت نہیں تھی اور نہ ہی وہ عام طور پر لڑکیوں کی طرح سخی سنوری ہوئی تھی۔ لیکن پھر اس سے چند حرکتیں ایسی سرزد ہوئی تھیں کہ وہ اس میں عجب سی کشش محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ وہ اسے اس چادر سے باہر بھی دیکھے جو وہ اپنے ارد گرد لپیٹے رکھتی تھی۔ ایک عجیب سانس اسے مریم سے ہو گیا تھا لیکن بہر حال یہ محبت نہیں تھی۔ پھر ایک دن وہ نہیں آئی۔ وہ شام تک لاشعور طور پر اس کا انتظار کرتا رہا۔ ایک عجیب سی بے چینی اسے لاحق ہو گئی تھی۔ اسی بے چینی میں وہ ساتھ والی عمارت کے سامنے ایک چکر بھی لگا آیا جہاں وہ مقیم تھی اور جہاں اس وقت مکمل سکوت تھا۔

شام کو وہ حسب معمول جاٹنگ کے لئے ماڈل ٹاؤن پارک چلا آیا۔ جاٹنگ ٹریک پر دوسرے چکر میں اس نے کچھ دور گھاس پر بیٹھی جس لڑکی کو دیکھا تھا وہ مریم ہی تھی۔ اس کے ساتھ چند لڑکیاں اور بھی تھیں اور وہ سب کچھ کھانے میں مشغول تھیں۔ اپنے ساتھ جاٹنگ کرتی سارہ کا ساتھ اسے ایک دم زہر لگنے لگا تھا اور وہ اس سے پچھا چھڑانے کا سوچنے لگا۔ ٹریک کا دوسرا چکر لگاتے ہی اس نے سارہ سے معذرت کر لی تھی کہ اب وہ اکیلا بھاگنا چاہتا ہے اور وہ اس کے اس اچانک بدلے ہوئے رویے پر ہکا بکارہ گئی تھی۔

تیسرے چکر میں وہ بھاگتے ہوئے جگہ کی طرف آ گیا تھا جہاں اس نے مریم کو کچھ دیر پہلے بیٹھے ہوئے دیکھا تھا یہ دیکھ کر اس نے سکون کی سانس لی کہ وہ وہیں بیٹھی ہوئی تھی بلکہ اب اس کے پاس وہ لڑکیاں بھی نہیں تھیں۔ وہ ٹریک چھوڑ کر اس کی طرف چلا آیا۔

قدموں کی آہٹ پر مریم نے اس کی طرف دیکھا تھا اور شناسائی کی چمک اس کی آنکھوں میں لہرائی، باپ کارن کھاتے ہوئے اس نے اپنی چادر کو ٹھیک کیا تھا۔

”ہیلو آج آپ کیوں نہیں آئیں“ اس نے چھوٹے ہی پوچھا تھا۔

”میں آئی تھی لیکن آپ اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ آج سڈے تھا نا اس لئے میں صبح دس گیارہ بجے آپ کے گھر گئی تھی اس وقت ملازم وہاں پر تھا“ اس نے وضاحت کی اور اس نے بے اختیار اپنا نچلا ہونٹ بھیجا تھا۔ چند لمحوں تک دونوں کے درمیان مزید کوئی بات چیت نہیں ہوئی لیکن پھر اس نے دوبارہ گفتگو کا سلسلہ جوڑنے کی کوشش کی تھی۔

”کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“

اس کے چہرے کا اضطراب اس کی آنکھوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا۔ اس نے نظریں جھکا کر جھپکتے ہوئے کہا۔

”دیکھیں میں یہاں اپنے سکول کی ٹیچرز کے ساتھ آئی ہوں اور وہ کسی کام سے گئی ہیں بس چند لمحوں تک آ ہی جائیں گی۔ اگر آپ یہاں بیٹھیں گے تو یہ مناسب نہیں ہوگا۔“

وہ اس کی بات پر چپ سا ہو گیا تھا۔

”آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا“ مریم نے اس کی خاموشی پر سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

”اُوہ نو کوئی بات نہیں میں دراصل آپ سے یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ آپ اور کب تک یہاں ہیں۔ میرا مطلب ہے لاہور میں.....؟“

”بس ایک ہفتہ اور“

”او کے تھینک “Have a nice time

وہ کہتا ہوا دوبارہ جاگنگ ٹریک کی طرف مڑ گیا تھا۔ وہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔ بلاشبہ وہ بہت خوبصورت تھا۔ اب وہ جاگنگ ٹریک پر بھاگنے لگا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر اسے دور جاتے دیکھتی رہی۔ ہاف بازوؤں والی سفید ٹی شرٹ اور بلیک ٹراؤزر میں کھلے گریبان کے ساتھ وہ بہت دلکش لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لئے رشک تھا۔

اس شام ٹریک پر بھاگتے ہوئے اس کی سوچ کا محور وہ لڑکی ہی رہی تھی۔ وہ اسے سمجھ نہیں پایا تھا اور اسے یہ بھی پتا نہیں چل رہا تھا کہ کیا اس کی کشش میں کچھ کمی آگئی تھی کہ وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنے میں یوں ناکام ہو گیا تھا۔ اسے کبھی بھی لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے کوشش نہیں کرنی پڑی تھی۔ لیکن پہلی دفعہ اس کے سامنے ایک ایسی لڑکی آگئی تھی جسے وہ لاشوری اور غیر ارادی طور پر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اگلے دن وہ پھر سہ پہر کو ہی آئی تھی۔ وہ بمشکل سیز جیوں سے نیچے اتر کر دروازہ کھولنے آیا تھا۔ دروازہ کھول کر اس نے اسے راستہ دیا اور خود لاؤنج کی ایک چیئر کھینچ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اس دن وہ پہلے کی طرح اس کے ساتھ دادی کے کمرے میں نہیں گیا تھا۔ اسے پاؤں

میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔ آنکھیں بند کئے کرسی پر جموتے ہوئے اس نے اچانک مریم کی آواز سنی تھی۔

”ارے آپ کے پاؤں کو کیا ہو گیا“ اس نے واپسی پر اس کے پاؤں پر بندھی ہوئی پٹی پر نظر پڑتے ہی پوچھا تھا۔ اس نے اس کی آواز پر آنکھیں کھول دیں۔ مریم نے اب غور سے اس کا چہرہ دیکھا تھا جو بہت زرد تھا شاید اسے بخار بھی تھا۔

”Nothing serious“ بلا وجہ ہی کل رات کو میں لان میں پھر رہا تھا کسی Insect (کیڑے) نے کاٹ لیا۔“

وہ بے اختیار اس کے قریب چلی آئی..... پر تاسف نظروں سے اس کے پاؤں کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے کہا۔

”پاؤں سوچ گیا ہے نا.....؟“

”ہاں کافی زیادہ..... میں ایسے ردعمل کی توقع نہیں کر رہا تھا پھر ادھر سے بخار بھی ہو گیا ہے۔“ وہ واقعی کافی تکلیف میں اور تھکا ہوا تھا۔

”میں آپ کو کچھ لکھ کر دیتی ہوں آپ اسے پانی میں ڈال کر اس وقت تک پانی پیتے رہیں جب تک کہ پاؤں ٹھیک نہیں ہو جاتا۔“

”What؟“

وہ اس کی پیشکش پر بری طرح حیران ہوا تھا۔

”آپ ایسا کیا لکھیں گی جسے پی کر میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

”آپ گھبرائیں نہیں میں آپ کو قرآنی آیات لکھ کر دوں گی اس کاغذ کو پانی میں بھگو کر پینے سے آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ بھی ایک طریقہ علاج ہے۔“

مریم نے جیسے اس کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس نے بڑی غیر دلچسپی سے اس کی بات سنی اور بڑی بے رخی سے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔

”تھینک یو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں ڈاکٹر سے بیٹریج کروا چکا ہوں اور کچھ میڈیسن بھی لی ہے امید ہے شام تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔ ویسے بھی میں اس قسم کی چیزوں پر Believe نہیں کرتا۔“

اس کے لہجے میں دعویٰ فطری اکٹرا پن تھا لیکن اس نے برامانے بغیر کہا:

”پتا ہے پچھلے سال میرے ہاتھ پر بھی کسی کیڑے نے کاٹ لیا تھا“ اس نے اپنی کلائی اس کے آگے کی تھی جس پر ایک مدہم سا نشان تھا۔

بیٹھے ہدایات دیں۔ وہ وہاں سے پیپر اور پین لے کر اس کے پاس چلی گئی اور لاؤنج کے ٹیبل کے قریب کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

”آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں، وہاں صوفہ پر بیٹھ جائیں۔“ اس نے مریم کو کارپٹ پر بیٹھنے دیکھ کر کہا۔ اب اسے اس ساری مصروفیات میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

”نہیں..... میں یہاں ٹھیک ہوں“ اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دے کر ڈائری ٹیبل پر رکھ دی اور پھر گھنٹوں کے بل بیٹھ کر ایک ہاتھ ڈائری پر جمائے اور ٹیبل پر جھک کر بڑی احتیاط سے کچھ لکھنے لگی۔ اسے یہ پوز بہت دلچسپ لگا تھا۔ اس وقت وہ ایک ایسے سنوڈنٹ کی طرح لگ رہی تھی جو سالانہ امتحان میں پرچہ سوالات دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے اسے حل کرنے کی فکر میں ہوتا ہے۔ وہ لکھنے کے ساتھ کچھ پڑھ بھی رہی تھی اور وہ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ پہلے کا ناقابل برداشت درواب جیسے ختم ہو گیا تھا۔ پھر اچانک اس نے اس کی خاموشی توڑنے کے لئے پوچھا۔

”آپ لکھ کیا رہی ہیں.....“ جواب میں اس نے سراسر اٹھا کر اسی طرح منہ میں کچھ پڑھتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا اور دوبارہ کاغذ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ جیسے دھک سے رہ گیا تھا۔ اس کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ کچھ عجیب سی بات تھی اس لڑکی میں جسے وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔ اسے اس وقت وہ بہت عجیب سی چیز لگی تھی۔ بے اختیار کا اس دل چاہا تھا کہ وہ ہمیشہ یونہی اس کے سامنے رہے۔ ایسا کب ہوا تھا کہ اس نے کسی کی ناراضگی دور کرنے کی کوشش کی ہو۔ ایسا کب ہوا تھا کہ اس نے کسی سے اتنی نرمی برتی ہو۔ لیکن اس وقت وہ بے اختیار یہ سب کر رہا تھا۔ شاید وہ وقت ہی کچھ انہونیوں کا تھا۔

چند منٹوں کے بعد اس نے اپنا کام ختم کر دیا۔ پھر کاغذ پر پھونک مارتے ہوئے اسے نہ کرنے لگی۔ پھر وہ کارپٹ سے اٹھ کر اس کی طرف آئی تھی۔

”آپ وضو کر کے اسے پانی کی بوتل میں ڈال لیں اور جب بھی پیاس لگے وہی پانی پیئیں جب پانی ختم ہو جائے تو بوتل میں اور پانی بھر لیں۔“

”دیکھیں میں نے اس وقت وضو نہیں کیا اور نہ ہی مجھے وضو کرنا آتا ہے۔“ بڑے اسٹریٹ فارورڈ سے امداد میں اس نے مریم سے کہا تھا۔ اس نے اس کی بات پر کاغذ والا ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا۔

”دوسری بات یہ کہ میں یہاں کا پانی نہیں پیتا ہوں کیونکہ وہ مجھے سوٹ نہیں کرتا۔ میں یا تو ڈسٹنڈ واٹر پیتا ہوں یا منرل، اب آپ بتادیں کہ اسے کون سے پانی میں

”میرا تو پورا بازو کبھی تک سوچ گیا تھا اور ٹھیک ہونے کو ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بھی بہت سے ڈاکٹرز کو دکھایا تھا۔ پھر کسی نے مجھے کچھ آیات لکھ کر دی تھیں اور وہی پانی پی کر ٹھیک ہو گئی تھی۔ بعد میں تو مجھے کسی میڈیسن کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔“

وہ بڑے رساں سے اسے بتا رہی تھی اور وہ اتنا اکتایا ہوا بیٹھا تھا۔ اس لئے فوراً بول اٹھا۔

”آپ نے کسی کو ایلفائیڈ ڈاکٹرز کو نہیں دکھایا ہو گا اسی لئے ٹھیک ہونے میں اتنی دیر لگی۔“ ایک لمحہ کے لئے وہ چپ رہی تھی اور پھر اس کے چہرے پر خشکی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

”جی نہیں..... میں نے کوالفائیڈ ڈاکٹروں کو ہی دکھایا تھا۔ دنیا میں یہ سہولت صرف آپ ہی کو میسر نہیں ہے اور بھی بہت سے لوگ ہیں۔“ یک دم وہ اسی پرانے تکلف کے ماحول میں سمٹ گئی تھی۔ مزید کچھ کہے بغیر اس نے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیا اور اسے عجیب سا بچھتاوا ہوا تھا۔ اس کی خشکی اسے بے حد عجیب اور بے حد اچھی لگی تھی۔

”آپ تو ناراض ہو گئیں..... میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا تھا۔ بہت سے ڈاکٹرز ٹھیک طرح سے ایسی چیزوں کو ٹریٹ نہیں کر پاتے You know یہ کوئی اتنی کاسن چیز نہیں ہے۔“

مریم نے چند لمحوں کے لئے رک رک اسے دیکھا اور پھر دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس نے اس کی وضاحت تسلیم نہیں کی تھی۔

”دیکھیں آپ کیا مجھے وہ Verses (آیات) لکھ کر نہیں دیں گی“ اس بار وہ بے اختیار رک گئی تھی اور اس کی طرف مڑ کر اس نے پوچھا:

”لیکن آپ تو ایسی چیزوں پر یقین ہی نہیں کرتے۔“

”ہاں کرتا تو نہیں But let's try ہو سکتا ہے آپ ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آخر آپ نے اسے پرٹلی آزمایا ہے۔“

اس نے یہ بات صرف اسے خوش کرنے کے لئے کہی تھی ورنہ وہ مکمل طور پر غیر سنجیدہ تھا اور حسب توقع وہ خوش ہو گئی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے میں لکھ دیتی ہوں..... میں اس سپارے کو کہاں رکھوں؟“

اس نے بک شیلٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”اسے وہاں رکھ دو۔“

”پیپر اور پین کہاں ملے گا؟“ یہ اس کا اگلا سوال تھا۔

”فون کے پاس جو کٹ ہے اس میں دیکھ لو۔“ اس نے اسی طرح چیخ پر بیٹھے

ڈال کر پیوں۔ بلکہ آپ ایسا کریں کہ کچن میں چلیں وہاں پانی کی بائٹز ہیں آپ خود ہی ان میں ڈال دیں۔“

وہ اٹھتے ہوئے بولا تھا۔ مریم خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ آہستہ آہستہ لنگراتے ہوئے وہ اسے کچن میں لے آیا۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ کچن کی لائٹ جلا کر اس نے ریفریجریٹر کھولا اور اس میں سے منرل واٹر کی ایک بوتل نکال کر اس کی طرف بڑھادی۔ مریم نے بوتل لے کر اس کی سیل توڑی اور اسے کھول کر وہ کاغذ اس میں ڈال دیا پھر بوتل بند کر کے ایک دفعہ اسے ہلایا اور واپس اس کی طرف بڑھادی۔ وہ اتنی دیر میں ریفریجریٹر سے جوس کے دو پیک برآمد کر چکا تھا۔

”آپ نے میرے لئے اتنا وقت ضائع کیا ہے تو پلیز تھوڑی دیر اور بیٹھ جائیں اور جوس پی کر جائیں۔“

”نہیں تھیک یو مجھے اب جانا ہے بہت دیر ہو گئی ہے۔“ اس نے کچن سے قدم باہر بڑھا دیئے۔ وہ بھی اس کے پیچھے باہر نکل آیا۔ بوتل کو کھول کر وہ پانی کے چند گھونٹ لے رہا تھا جب اس کے آگے آگے چلتی ہوئی مریم کچھ کہنے کے لئے مڑی تھی اور اسے یوں پانی پیتے دیکھ کر ناگواری کی ایک لہری اس کے چہرے پر نمودار ہوئی تھی۔

”اس کو اس طرح تو نہیں پیتے“ کافی خشکی سے اسے ٹوکا گیا۔ وہ بوتل بند کرتے کرے رک گیا۔

”تو کیسے پیتے ہیں؟“ چند لمحوں اور اس کے سوال پر اسے گھورتی رہی پھر مڑ کر کچن میں چلی گئی وہ اس کے پیچھے آیا تھا۔ گلاس اسٹینڈ سے اس نے ایک گلاس لیا اور اس کے قریب چلی آئی۔

”یہ بائبل مجھے دیں“ اس نے خاموشی سے بوتل اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے ڈانٹنگ نینل پر گلاس رکھ کر اس میں پانی اٹھایا۔ گلاس کو آدھا بھرنے کے بعد اس نے ایک کرسی کھینچی اور اسے مخاطب کیا۔

”اب آپ یہاں بیٹھ کر بسم اللہ پڑھ کر یہ دعا کریں کہ اللہ مجھے اس تکلیف اور آزمائش سے نجات دے اور پھر یہ پانی تین گھونٹ میں پی لیں۔“ وہ اس کے کہنے پر چیخ پر بیٹھ گیا لیکن بسم اللہ نہیں پڑھ سکا۔ وہ شاید سمجھ گئی تھی اس لیے اس نے اسے بسم اللہ پڑھ کر سنائی تھی۔ سمجھتے ہوئے اس نے بھی بسم اللہ پڑھ لی تھی اور اچانک اسے پتا چلا تھا کہ وہ بسم اللہ بھی بھول چکا تھا۔ پھر اسی کے ساتھ ساتھ وہ دعا دہرائی تھی۔

”اب آپ دائیں ہاتھ سے گلاس پکڑ کر آہستہ آہستہ پانی پی لیں۔“ وہ اس کے پاس کھڑی اسے انسٹرکشن دے رہی تھی اور وہ کسی معمول کی طرح ان پر عمل کر رہا تھا۔

”یہ کوئی عام پانی یا مشروب نہیں ہے جسے آپ چلے پھرتے ایسے ہی پیتے رہیں۔ اسے پینے کے کچھ آداب ہیں..... اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ واقعی ٹھیک ہو جائیں تو اسے اس طرح پیا کریں جیسے میں نے بتایا ہے ورنہ آپ کا پاؤں ٹھیک نہیں ہوگا۔“

اس نے جیسے اسے ڈرایا تھا۔ پھر وہ لاؤنج میں چلی آئی اور اپنا سپارہ لے کر چلی گئی۔ وہ واپس کمرے میں جانے کی بجائے وہیں لاؤنج میں چلا آیا۔ واپس کمرے میں جاتا تو تھوڑی دیر بعد جب وہ سپارہ واپس کرنے آئی تو اسے دوبارہ نیچے آنا پڑتا اور وہ اس ڈرل کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اسی لئے اس کے انتظار میں وہیں بیٹھ گیا۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس آئی تھی اور اسے دیکھتے ہی اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا:

”اب آپ کو کیسا محسوس ہو رہا ہے؟“

”ویل..... مجھے تو کوئی فرق محسوس نہیں ہوا..... ابھی تک ویسے ہی درد ہے۔“

بڑی صاف گوئی سے اس نے جواب دیا تھا۔

”اچھا.....“ وہ جیسے سمجھ گئی تھی پھر شاید اس نے اس سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔

”کوئی بات نہیں اتنی جلدی درد ٹھیک نہیں ہو سکتا نا..... ابھی تو تھوڑا سا وقت ہی گزرا ہے۔“

پھر وہ سپارہ اندر رکھ کر واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد اس نے لاؤنج کا دروازہ لاک کیا اور اوپر کے کمرے میں جانے سے پہلے پتا نہیں کیا۔ بیچ آ کہ وہ بوتل بھی اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔ بوتل کو روم ریفریجریٹر میں رکھنے کے بعد وہ بیڈ پر لیٹ گیا۔ مریم کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

دوبارہ جب وہ بیدار ہوا تھا تو اس وقت کافی شام ہو چکی تھی۔ کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ اس نے رسٹ وایج اٹھا کر ٹائم دیکھا شام کے ساڑھے سات بجے تھے اور وہ پچھلے چار گھنٹوں سے بے خبر سو رہا تھا۔ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھے ہی پہلا خیال اسے پاؤں کا آیا تھا جسے اس نے ہلایا تھا تو درد کی ایک لہری محسوس ہوئی تھی۔ لیکن بہر حال اب اسے پہلے کی طرح پاؤں میں مسلسل درد نہیں ہو رہا تھا۔ اسے صرف اس وقت درد محسوس ہوتا جب وہ پاؤں کو تیزی سے حرکت دیتا۔ یہ چیز اس کے لئے کافی خوش آئند تھی۔ ورنہ پچھلی پوری رات بھر کو حرکت نہ

دینے کے باوجود وہ درد سے بے قرار تھا اور اسی وجہ سے وہ سلیپنگ پلا لینے کے باوجود بھی ٹھیک طرح سے نہیں سو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صبح اسے ہلکا ہلکا بخار ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن اس وقت اس بخار کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔

اس نے لائٹ آن کی اور اپنے بچہ کا معائنہ کرنے لگا۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے پاؤں کی سوجن بھی کچھ کم ہو گئی تھی..... اور یہ چیز بڑی مسرت آمیز تھی۔ پاؤں پر پلاسٹک بیگ چڑھا کر اس نے ہاتھ لیا تھا اور بہت پرسکون حالت میں نیچے آ گیا۔ ڈیڑی اس وقت گھر آ چکے تھے۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے اس سے پاؤں کے بارے میں دریافت کیا تھا اور اس نے انہیں مطمئن کر دیا تھا۔ وہ اس وقت اپنے ڈیڑی کے ساتھ ڈنر کر رہا تھا جب ڈاکٹر اسے دیکھنے کے لئے آیا تھا۔ اس کے پاؤں کا معائنہ کرنے کے بعد وہ کافی مطمئن ہو گیا تھا اور اسے ایک انجکشن اور چند مزید میڈیسینز دے کر چلا گیا۔

ڈنر کے بعد وہ کچھ دیر تک باپ کے ساتھ کاروباری معاملات پر گفتگو کرنے کے بعد دوبارہ اوپر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ دادی دوسرے بچے کے پاس رہنے گئی ہوئی تھی اور اس کی مچی اس کی بہنوں کے ساتھ امریکہ اپنے میکے گئی ہوئی تھیں۔ اس لئے گھر میں بالکل سکوت تھا۔ لیکن جب وہ گھر میں موجود ہوتی تھیں تب بھی وہ اپنا زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارنے کی بجائے اپنے کمرے میں گزارنا بہتر سمجھتا تھا۔

اس وقت بھی اس نے کمرے میں آ کر ٹی وی آن کر لیا تھا۔ بیڈ پر لیٹنے سے پہلے اس نے جب میڈیسن لینے کے لئے گلاس میں پانی ڈالا تو اسے اس پانی کا خیال آیا تھا لیکن اس نے لا پرواہی سے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اسے قطعاً بھی یقین نہیں تھا کہ اسے وقتی طور پر جو آرام آیا ہے اس میں اس پانی کا کوئی ہاتھ ہو سکتا ہے بلکہ اسے یقین تھا کہ یہ ڈاکٹر کے ٹریٹمنٹ کا نتیجہ ہے۔ اب وہ دوپہر کے واقعات کے بارے میں بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنی چند گرل فرینڈز سے فون پر بات کی اور پھر اپنے سب سے کلوز فرینڈ کو کال کر کے اس سے باتیں کرنے لگا۔ کافی دیر اس سے باتیں کرتے رہنے کے بعد وہ مووی چینل پر آنے والی فلم دیکھنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

فلم دیکھتے ہوئے اسے ابھی آدھ گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ اچانک اسے اپنے پاؤں میں درد کی لہریں سی اٹھتی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور پاؤں کو غور سے دیکھنے لگا جس کی ظاہری حالت میں اسے کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی تھی لیکن درد میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔ کچھ دیر گزرنے پر درد کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ اٹھ کر دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس نے

درد کم کرنے کے لئے ایک پین کھری لیکن درد میں کمی ہونے کی بجائے اضافہ ہی ہوتا گیا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد ڈاکٹر کو کال کیا اور اس کی انسٹرکشنز کے مطابق اور ٹیبلٹس لیں لیکن نتیجہ اب بھی وہی تھا۔ کل رات کی نسبت آج اسے زیادہ درد محسوس ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنا پاؤں دیکھا اور جیسے دھک سے رہ گیا تھا۔ پاؤں میں کہیں کہیں سرخی مائل نیلے دھبے نظر آرہے تھے۔ اسی بے چینی میں اسے اس پانی کی بوتل کا خیال آیا تھا اور جانے کیا سوچ کر وہ بمشکل پاؤں گھسیٹتا ہوا فریج کے پاس گیا اور اس لٹری کی ہدایات کے مطابق اس نے پانی نکال کر پی لیا۔ پھر وہ واپس بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔ درد ضبط کرتے ہوئے وہ تقریباً آدھ گھنٹہ تک اسی طرح پاؤں کو حرکت دینے بغیر لیٹا رہا۔ پھر اچانک اسے محسوس ہونے لگا کہ درد کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے ایک بار پھر اٹھ کر اپنے پاؤں کا جائزہ لیا۔ اس پر ابھی بھی دھبے نظر آرہے تھے لیکن اب پہلے کی طرح درد نہیں ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر اس نے ریفریجریٹر سے پانی نکال کر پیا اور پھر بیڈ پر سونے کے لئے لیٹ گیا۔ اس بار درد اتنا کم ہو چکا تھا کہ اسے بستر پر لیٹے ہی کچھ دیر بعد نیند آنے لگی۔

صبح دیر سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس وقت دس بجے تھے اور پاؤں کو دیکھتے ہی ایک اطمینان کا سانس اس نے لیا تھا۔ جو دھبے رات کو اس کے پاؤں پر نظر آئے تھے اب وہ کہیں بھی نہیں تھے۔ یہ دیکھ کر تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی کہ وہ پاؤں پر وزن ڈال کر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا تھا۔ ورنہ پہلے وہ صرف پاؤں کو زمین پر ہلکا سا ٹکا کر ہی کھڑا ہو سکتا تھا۔ تکلیف سے چھٹکارا پا کر اسے یقیناً خوشی ہو رہی تھی لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ درد سے نجات دلانے میں کس کا ہاتھ تھا..... پانی کا یا میڈیسینز کا۔ رات کو پانی پینے کے باوجود بھی اسے یہ یقین نہیں ہو رہا تھا کہ واقعی اس پانی کو پینے سے ہی اسے درد سے نجات حاصل ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ آئی تھی اور اس نے پاؤں کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے کہہ دیا۔

”بہت حد تک ٹھیک ہے بٹ ٹو بی دیری فریک مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ آپ کے دیئے ہوئے پانی کا کمال ہے یا پھر ڈاکٹر کی میڈیسینز کا۔“

”اس کا ایک مل یہ ہو سکتا ہے کہ آپ میڈیسن لینا چھوڑ دیں آپ کو خود ہی پتا چل جائے گا کہ یہ پانی کا اثر ہے یا میڈیسن کا.....“ وہ اس کی بات پر مسکرانے لگا۔

”اچھا چلو یہ بھی کر کے دیکھ لیتا ہوں“ پھر اس نے اگلے دو دن میڈیسن نہیں لی اور صرف پانی ہی پیتا رہا اور نتیجہ حیران کن تھا۔ چوتھے دن اس کا پاؤں بالکل ٹھیک ہو چکا تھا۔ اب

فرینڈ شپ کرنا چاہتا ہوں اور اس لئے بھی کہ مجھے آپ اچھی لگی ہیں۔“
وہ اس کے تاثرات سے بے خبر کہتا جا رہا تھا اور وہ جیسے غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔
اس نے ایک دم پیکٹ اس کے ہاتھ سے کھینچ کر زور سے دیوار پر دے مارا تھا۔
”آپ نے مجھے بہت غلط سمجھا ہے۔ میں تو صرف قرآن پاک لینے کے لئے آپ
کے گھر آتی تھی اور آپ.....“

وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر غصے میں دروازے کی طرف چل پڑی۔
”مریم آپ بھی مجھے غلط سمجھ رہی ہیں“ وہ ایک دم اس کے سامنے آ گیا تھا۔
”آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں..... یہ تو صرف ایک گڈول گفت تھا اور کچھ
نہیں، بلکہ میں پھر بھی ایک سکپوز کرتا ہوں۔ آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ بہت عرصے کے بعد کسی
نے میرے سامنے اس طرح مذہب پر یقین ظاہر کیا ہے جو نیچر لی مجھے اچھا لگا ورنہ اور کوئی بات
نہیں ہے۔“

وہ وضاحتیں پیش کر رہا تھا اور اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ رہا تھا۔ اب اسے
انسوس ہو رہا تھا کہ شاید اس نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اسے اب یاد آ رہا تھا کہ پچھلے
پندرہ دن سے وہ اس سے کتنے مہذبانہ انداز میں پیش آتا رہا تھا۔

”مجھے بھی انسوس ہے کہ میں نے آپ کو غلط سمجھا۔ بس مجھے ایسے ہی غصہ آ گیا تھا۔
آپ نے تو واقعی ہمیشہ اسی طرح میری عزت اور مدد کی ہے۔“
مریم نے کھلے دل سے اس سے معذرت کی تھی، شرمندگی کے تاثرات اس کے
چہرے پر نمایاں تھے۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ بڑی عجیب نظروں سے اسے دیکھنے
کے بعد اس نے مریم سے کہا۔

”اس آل رائٹ..... آئیں میں آپ کو باہر تک چھوڑ آؤں۔“ وہ اس کے ساتھ
چل پڑی تھی لیکن اب بھی اپنی حرکت پر پشیمان تھا۔ گیٹ کی طرف جاتے ہوئے اچانک وہ
اس سے کہنے لگا۔

”دیئے آئندہ کے لئے ایک مفید مشورہ میں آپ کو دیتا ہوں۔ قرآن پاک سے
عقیدت اور محبت اچھی چیز ہے لیکن آئندہ کبھی اس طرح اکیلے کسی کے گھر مت جائیں۔“ وہ
یک دم رک گئی وہ بھی ٹھہر گیا۔

”کیا مطلب.....؟“ وہ واقعی اس کی بات نہیں سمجھی۔
”ہاں کبھی بھی اکیلے کسی کے گھر مت جائیں اور کسی تنہا مرد کے پاس تو بالکل بھی

اسے چلنے پھرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوتا تھا اور زخم کو صرف دبانے پر ہی اس میں
ہلکا سا درد محسوس ہوتا تھا ورنہ پاؤں بالکل ٹھیک تھا۔ لیکن بہر حال اسے یہ یقین اب بھی نہیں آیا
تھا کہ وہ صرف پانی کی وجہ سے صحت مند ہو گیا ہے۔ اسے لگتا تھا کہ شروع میں اس نے جو
میڈیسن لی تھی شاید یہ سب اس کا اثر ہے لیکن بہر حال یہ بات اس نے مریم کے سامنے نہیں کی
اور اس کے سامنے یہی ظاہر کیا کہ جیسے اسے بھی اس پانی کی کرامت پر یقین آ گیا تھا۔ پاؤں
ٹھیک ہوتے ہی وہ پھر اپنی سرگرمیوں کی طرف لوٹ آیا تھا۔

ہفتہ کا دن تھا اور رات کو سونے کے لئے لیٹتے ہوئے اس کو اچھی طرح یاد تھا کہ صبح
اتوار ہے اور وہ جلدی آئے گی اس لئے اس نے آفس دیر سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ صبح جب
وہ آئی تھی تو بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے حسب معمول اسے چائے کافی کی آفر کی تھی اور
حسب معمول مریم نے آفر ٹھکرا دی تھی۔ جب وہ سپارہ واپس کرنے آئی تو وہ لاؤنج میں ٹی
وی آن کئے بیٹھا تھا۔ سپارہ اندر رکھ کر وہ واپس آئی تھی اور اس نے کہا تھا۔

”میں نے آپ کو بہت ڈسٹرب کیا لیکن بس آج آخری دن تھا..... کل ہم لوگ
واپس چلے جائیں گے۔“

اس کے چہرے کی مسکراہٹ ختم ہو گئی تھی۔
”آپ لوگ کل جا رہے ہیں.....؟“ اس کے سوال پر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
”کیا آپ مجھے اپنا فون نمبر یا ایڈریس دیں گی“ وہ اس کی بات پر حیران ہو گئی تھی۔
”وہ کیوں.....؟“ وہ اس کی بات کا مناسب جواب نہیں دے پایا بس کندھے
اچکاتے ہوئے اس نے کہا:

”نہیں ایسے ہی۔“
”میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔“ اسے بڑی سختی سے جواب دیا گیا تھا وہ
بس اس کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔

”اچھا ایک منٹ ٹھہر جائیں“ وہ یہ کہہ کر تیزی سے اندر چلا گیا اور وہ حیرانگی سے
اسے جاتا دیکھتی رہی۔ پھر جتنی تیزی سے وہ اوپر گیا تھا اتنی ہی تیزی سے واپس آ گیا۔
”یہ آپ کے لئے ہے“ اس نے ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ وہ بوکھلا کر

پچھے ہٹ گئی۔
”کیوں؟“

”اس لئے کہ آپ نے میرا پاؤں ٹھیک کیا تھا اور اس لئے بھی کہ میں آپ سے

نہیں چاہے وہ سولہ سال کا بچہ ہو یا سو سال کا بوڑھا۔
”کیا مطلب.....؟“ اب کی بار وہ ہکا بکارہ گئی تھی۔

”میرا مطلب وہی ہے جو آپ سمجھ رہی ہیں۔ آپ اتنے دنوں سے یہاں آ رہی ہیں کیا آپ نے میرے علاوہ یہاں کسی کو دیکھا ہے۔“
اس نے بڑی سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”ملازم تھے تو سہی۔“ مریم نے جیسے خود کو خوش فہمی سے بہلانے کی کوشش کی تھی۔
وہ اس کی بات پر تمسخرانہ انداز میں ہنس دیا۔

”اچھا ملازم تھے مگر کمب، مجھے اچھی طرح یاد ہے جب آپ پہلے دن آئی تھیں تو گیٹ پر وراج مین تک نہیں تھا اور ملازم اپنے کوارٹرز میں تھے۔“

”گھر میں کوئی نہیں تھا؟“ اس نے بمشکل سوال کیا تھا۔
”نہیں گھر میں کوئی نہیں تھا۔ اتنے دنوں میں کیا آپ نے میرے کسی فیملی ممبر کو

دیکھا ہے۔ نہیں دیکھا نا، آپ دیکھ بھی کیسے سکتی ہیں کیونکہ وہ تو یہاں ہیں ہی نہیں..... وہ امریکہ گئے ہوئے ہیں۔ صرف فادر یہاں ہوتے ہیں لیکن وہ بھی صبح نو بجے چلے جاتے ہیں اور پھر رات کو واپس آتے ہیں اور پھر کئی دفعہ ایسا ہوا کہ گیٹ پر وراج مین کے علاوہ میرے گھر میں کوئی نہیں ہوتا تھا۔ مثلاً اس دن جب آپ مجھے وہ پانی والی بنا کر دے رہی تھیں۔“

وہ اطمینان سے کہتا جا رہا تھا اور وہ ہلنق بنی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔
”پر میں تو صرف چند منٹ کے لئے آتی تھی اور فوراً چلی جاتی تھی۔“ اس نے جیسے

اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی تھی۔
”ہاں آپ جلدی چلی جاتی تھیں لیکن وہ صرف اس لئے کہ میں آپ کو جانے دیتا

تھا۔ ورنہ چاہتا تو آپ کا قیام طویل بھی ہو سکتا تھا۔“
”پر میں قرآن پاک لینے آتی تھی۔“

اس کا لہجہ کمزور اور معذرت خواہانہ ہوتا جا رہا تھا۔
”اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ آپ کس لئے آتی ہیں۔“

”لیکن آپ تو مسلم ہیں..... میں نہیں مانتی کہ آپ میرے ساتھ کوئی بدتمیزی کر سکتے تھے۔“

اب کی بار وہ کھکھلا کر بڑے دلکش انداز میں ہنسا تھا۔
”آپ کیا سوچتی ہیں یہاں سارے کرائمنز نان مسلم کرتے ہیں؟“

”آپ ایسے تو نہیں لگتے۔“

ایک بار پھر وہ ہنس پڑا تھا۔

”میرے بارے میں آپ کا یہ اندازہ بھی غلط ہے۔ اگر آپ مجھے جانتیں تو یہاں آنے سے پہلے کم از کم ایک ہزار بار ضرور سوچتیں اور اکیلے آتے ہوئے تو شاید لاکھ بار“ وہ اس کی متغیر ہوتی ہوئی رنگت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”آپ نے تو اتنے دنوں سے میرا نام تک پوچھنا گوارا نہیں کیا۔ کسی مہذب آدمی کو بھڑکانے کے لئے تو اتنی بے رحمی ہی کافی ہوتی ہے پھر آج بھی آپ نے بڑا کارنامہ کیا۔“

میرا گفٹ اٹھا کر پھینک دیا۔ کمال کیا۔ لیکن آپ دیکھ لیں وراج مین آج بھی گیٹ پر نہیں ہے اور اکثر اس وقت نہیں ہوتا۔ آپ نے جارحیت اس جگہ دکھائی تھی جہاں صرف میں تھا اور کوئی

نہیں۔ آپ خود سوچیں اگر مجھے آپ کی اس حرکت پر غصہ آ جاتا تو کیا ہوتا۔“
وہ اس کی بات پر پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے ہونٹ کاٹنے لگی تھی۔ وہ جان گیا

کہ اب اگر اس نے کچھ اور کہا تو وہ شاید پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے گی۔
”آئیں اب میں آپ کو گیٹ تک چھوڑ آؤں۔“

وہ سر جھکائے اس کے ساتھ چلنے لگی۔
”ویسے آپ کس کلاس کو پڑھاتی ہیں۔“

چلتے چلے اس نے اس سے پوچھا۔
”دن کو۔“ اس نے اتنی ہلکی آواز میں جواب دیا کہ وہ بمشکل سن پایا۔

”آپ کو پڑھانا بھی اسی کلاس کو چاہئے۔ ویسے جو کچھ ابھی میں نے آپ سے کہا ہے وہ اپنے سٹوڈنٹس کو ضرور سکھانا۔“ وہ اس کے طنز کو سمجھنے کے باوجود بھی چپ ہی رہی۔ گیٹ

کی چھین اتارتے ہوئے اس نے کہا۔
”اگر آپ نہ رونے کا وعدہ کریں تو ایک بات اور بتاتا ہوں۔“ وہ خاموشی سے اس

کا چہرہ دیکھنے لگی۔
”آپ پہلے دن یہاں آئی تھیں اس دن.....“ وہ بولتے ہوئے یک دم رک گیا پھر

دھیمی آواز میں اس نے کہا۔
”اس دن میں ڈرنک کر رہا تھا“ مریم کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

”اور جس دن آپ مجھے وہ پانی کی ترکیب بتا رہی تھیں اس دن آپ کے آنے سے پہلے میں ڈرنک کر رہا تھا اور میں نے آپ کے بارے میں وہی سوچا تھا جو کوئی مرد کسی

اس نے کیس میں سے گھڑی نکال لی۔

”آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں اس لئے میں آپ سے کوئی بد تمیزی نہیں کر سکا شاید میں آپ سے.....“ کوئی کہہ رہا تھا۔ گھڑی کو گال سے چھوتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔



عورت کے بارے میں سوچ سکتا ہے اور آج آپ نے کتنی آسانی سے میری ایکسکیوز کو مان لیا حالانکہ میں نے وہ گفٹ آپ کو اسی نیت سے دیا تھا جو آپ پہلے سمجھی ہیں اور آپ پتا نہیں اسٹوڈنٹ ہیں یا کیا ہیں کہ ان میں سے کچھ بھی جان نہیں پائیں تو پھر خود کو اتنے رسک میں کیوں ڈالتی ہیں۔ یار عقل کی ضرورت ہوتی ہے جب دوسرے لوگوں سے ملنا ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں کچھ جان پائیں۔ آپ تو شاید.....“

وہ اس کی آنکھوں میں ابھرنے والی نمی دیکھ کر یک دم چپ ہو گیا۔ اسے پہلی بار اپنے تجربے کی بے رحمی کا احساس ہوا تھا **But inspite of everything I must admit** کہ آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں کوئی بد تمیزی نہیں کر سکا۔ شاید میں.....“

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔ آنسوؤں سے بھیلے ہوئے چہرے کے ساتھ اس نے سر اٹھا کر آخری بار اسے دیکھا جو بہت گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ کچھ کہے بغیر گیٹ کر اس کر گئی تھی۔

ایک ہفتہ کے بعد اسے اسکول کے ایڈرس پر ایک پارسل ملا تھا۔ اسے بہت حیرت ہوئی تھی کہ اسے اسکول کے ایڈریس پر پارسل کون بھیج سکتا ہے۔ پارسل کھولتے ہی کرشن ڈی اور کی ایک بہت خوبصورت اور قیمتی گھڑی نے اسے چونکا دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنا قیمتی تحفہ اسے کون بھیج سکتا تھا۔ بڑے تجسس سے اس نے پیکٹ میں سے نکلنے والے کارڈ کو کھولا تھا۔ کارڈ پر تحریر لفظوں نے اسے چونکا دیا۔

**An ordinary gift for an extraordinary girl
who restored my faith in God and the
chastity of woman.**

Your humble admirer

Walid Haider

چند لمحوں کے لئے اسے اس کا سانس جیسے حلق میں اٹک گیا۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ کس کا بیجا ہوا تحفہ تھا۔ لیکن پھر وہ اس تحریر کو دو بارہ پڑھنے لگی۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ اس نے وہ کام کیسے کیا ہے جس کا وہ ذکر کر رہا تھا۔ ہاں البتہ اس نے اسے ضرور کچھ سکھایا جسے وہ باقی ساری زندگی فراموش نہیں کر سکتی تھی۔

”کبھی کسی مرد کے پاس اکیلے مت جانا چاہے وہ سولہ سال کا بچہ ہو یا سو سال کا بوڑھا۔“

ہوئی گھاس میں جمع شدہ پانی سے محفوظ ہونے والے مینڈکوں کی آوازیں اس سناٹے کو توڑ رہی ہیں اور کبھی کبھار سڑک کے کنارے لگے ہوئے درختوں کی گیلی شاخوں پر پناہ لینے والے پرندوں کی چچہاہٹ بھی۔ یہ اس علاقے کی سب سے خوبصورت سڑک ہے اور میرا اور اس کا ساتھ اب بیس سال پر مشتمل ہے۔ بیس سال پہلے اس سڑک کے دائیں بائیں گھروں کی بہت محدود تعداد تھی، خالی پلاٹ سبزے سے ڈھکے رہتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ اس سڑک پر کوئی ایک بھی خالی پلاٹ نہیں مگر گھروں کے آگے سڑک کے کنارے گھاس اور درخت ضرور باقی ہیں۔

میں اس سڑک پر واک کرنے والا اکیلا شخص ہوں، میری عمر کے لوگ، نوجوان لڑکے، لڑکیاں، ادھیڑ عمر عورتیں، والدین کے ساتھ دس بارہ سال کے بچے..... وقتاً فوقتاً کوئی نہ کوئی میرے پاس سے گزرتا جاتا ہے۔

پورا سال میں اس سڑک پر بڑی خاموشی کے ساتھ چیزوں پر غور کیے گزرتا رہتا ہوں مگر سال میں ایک دن نوٹس لگیا کا دن ہوتا ہے۔ اس دن میں اس سڑک سے گزرتے ہوئے ماضی کے علاوہ اور کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچتا اور وہ آج کا دن ہوتا ہے، پندرہ اگست..... 54 سال پہلے اس تاریخ کو میں نے اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ لفظ خاندان شاید میں جذبات میں آ کر استعمال کر گیا۔ میرے ساتھ صرف میرا باپ تھا۔ سینتالیس سال کا ایک دکھ بھرا، ادھ مو قائل..... جس قافلے میں میں پاکستان آیا تھا اس میں کم از کم چھ قائل تھے۔ باقی کے لوگ کیا تھے یہ میں نہیں جانتا۔

سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کا پہلا گروپ میرے پاس سے گزرنے والا ہے۔ ان کی آوازیں میرے کانوں میں پڑ رہی ہیں۔ ”2025ء تک پاکستان تقسیم ہو جائے گا پچھلے تین سالوں سے امریکن ٹھنک ٹھنک یہی رپورٹ دے رہے ہیں اور ان کے اندازے صحیح ثابت ہوتے ہیں۔“

”2025ء تو بہت دور ہے، جس طرح کے حالات ہیں یہ کام تو اس سے پہلے ہی ہو جائے گا۔“ تین لوگوں کا میرا ہم عمر گروپ اب میرے پاس سے گزر رہا ہے، ہم نے سر کے اشارے اور مسکراہٹوں سے سلام و دعا کا تبادلہ کیا اور ایک دوسرے کے پاس سے گزر گئے۔

”2025ء میں پاکستان ٹوٹ جائے گا۔“

کیانی صاحب کا جملہ میرے ذہن میں اٹک گیا ہے۔

میں چودہ سال کا تھا جب میں اپنے باپ کے ساتھ پاکستان آیا، ہندوستان کی تقسیم

منٹھی بھر مٹی

میں نے جھک کر زمین پر پڑی ہوئی وہ جھنڈی اٹھالی۔ رات ہونے والی موسلا دھار بارش نے گھروں اور دیواروں پر لگی ہوئی جھنڈیوں کو زمین بوس کر دیا تھا۔ میں کچھ دیر اس جھنڈی کو دیکھتا رہا پھر میں نے اسے اپنے ٹریک سوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ اس راستے پر نظر آنے والی پہلی جھنڈی..... بہت سال پہلے میرے باپ نے پاکستان کی سرزمین پر پہلا قدم رکھتے ہی وہاں کی مٹی کو ایک رد مال میں باندھ کر اسی طرح اپنی جیب میں رکھا تھا۔ مٹی کی وہ ننھی سی پوٹی آج بھی میرے پاس محفوظ ہے اور ہر سال کسی نہ کسی سڑک سے اٹھائی جانے والی ایک جھنڈی بھی..... شاید میری کوئیکشن دنیا کی عجیب ترین چیزوں پر مشتمل ہے۔ اپنے یوم آزادی کے بجائے اگلے دن کسی نہ کسی سڑک پر گری ہوئی کوئی پھٹی، مسلی، پھیلے ہوئی ایک جھنڈی پھر میں ہر اس جھنڈی کو تاریخ اور سن کے ساتھ اپنی الجھ میں محفوظ کر لیتا ہوں.....

پچھلے بیس سال سے اسے اسی مخصوص سڑک پر میں صبح کی سیر کے لئے آ رہا ہوں، برسات..... سردی..... گرمی..... خزاں..... بہار..... کوئی موسم، کوئی تہوار میرا معمول نہیں بدل سکا حتیٰ کہ موسلا دھار بارش اور تیز طوفان بھی۔

رات کی بارش نے ہر چیز کو گیلا کر رکھا ہے۔ تارکول کی سیاہ سڑک بھیگ کر کچھ اور چمکدار اور نمایاں ہو گئی ہے۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے درخت اور پودے بارش کے پانی میں دھل کر کچھ اور نکھر گئے ہیں۔ اس وقت بھی آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں اور شاید کچھ دیر بعد بارش ایک بار پھر شروع ہو جائے گی۔ برسات کی ہوا میں وہی مخصوص نمی ہے جسے پچھلے کئی سالوں سے اس موسم میں میں محسوس کرتا آ رہا ہوں۔ ہوا میں خنکی بھی ہے۔

کشمیر کی طرف سے آنے والے جھونکوں کی مرہون منت..... صبح سویرے اس سڑک پر ٹریفک غائب ہے۔ اور اس کے ساتھ گاڑیوں کا شور بھی۔ البتہ سڑک کے کنارے لگی

کے بعد میرے باپ کا تعلق پٹالہ سے تھا۔ وہ زمیندار تھا، تین بہنوں اور دو بھائیوں پر مشتمل ہمارا گھرانہ اس علاقے کے بہت کم مسلمان گھرانوں میں سے ایک تھا۔ ہم لوگ وہاں بڑے سکون کی زندگی گزار رہے تھے۔ تحریک پاکستان کا آغاز ہونے کے بعد بھی ہم لوگوں کو کوئی زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ جس گاؤں میں ہم تھے وہاں کی اکثریت ان پڑھ لوگوں پر مشتمل تھی۔ انہیں ملکی سیاست کے بارے میں زیادہ معلومات تھیں نہ دلچسپی۔ لیکن آہستہ آہستہ تحریک پاکستان میں شدت کے ساتھ ہی چوپال میں شام کو سیاست اور جناح کا یہ مطالبہ زیر بحث لایا جانے لگا میرا باپ بھی ان مسلمانوں میں شامل تھا جو اس مطالبے کو ایک حماقت سمجھتے تھے۔

”یعنی اپنی ساری زمینیں چھوڑ کر میں پاکستان چلا جاؤں کیونکہ وہ ملک مسلمانوں کے لیے ہے۔ جناح کا دماغ خراب ہے۔ کوئی اپنی مٹی چھوڑ کر جاتا ہے۔ کوئی اپنا گھر بار اور زمینیں چھوڑ کر صرف مذہب کے لیے نہیں چل پڑے۔“

مجھے یاد ہے میرا باپ کئی سال یہی بات رات کو گھر میں ماں کے سامنے دہرایا کرتا تھا اور گھر میں موجود سب لوگ اس کے ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ جب زندگی سکون سے گزر رہی ہو تو پھر اس طرح کے مطالبات حماقت کے علاوہ کچھ بھی نہیں لگتے۔

میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور میرا بھائی سب سے بڑا تھا تینوں بہنیں دونوں کے درمیان آئی تھیں۔

گاؤں میں جب کبھی مسلم لیگ والے مسلم لیگ کے لئے کنوینٹ کرنے کے لیے آئے، میرے باپ نے بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح ان کا مذاق اڑایا۔

”تم لوگوں کو ووٹ دیں؟ کیوں ووٹ دیں، بنوارہ کرنا چاہتے ہو تم لوگ..... مہینہ بیٹھیں بڑھانا چاہتے ہو ہماری۔ کا گھریس ہے ہماری بات سننے والی۔ ہمارے لیے وہی کافی ہے۔“

میرے باپ نے ہر دفعہ لیگیوں کو اسی طرح دھکارا۔ کئی بار لیگیوں کے گھر گھر جا کر عوام رابطہ مہم کے دوران میرے باپ نے گھر کا دروازہ ہی نہیں کھولا۔ وہ لوگ دروازہ بجاتے، تھک کر اگلے گھر چلے جاتے۔

میرے باپ کی سوچ میں تب بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی جب اس نے میرے بڑے بھائی کو ہائی اسکول کے بعد آگے تعلیم کے لیے جالندھر بھجوایا۔ گھر میں صرف میں اور میرا بھائی ہی تھے جنہیں تعلیم دلوانی جارہی تھی۔ میری بہنوں کو تعلیم نہیں دلوائی گئی۔ اس علاقے میں عورتوں کو تعلیم دلوانے کا رواج نہیں تھا اور پھر مسلمان عورتوں کے لیے تو تعلیم شجر ممنوعہ کا درجہ

رکھتی تھی۔ میری ماں اور بہنیں گھر کے اندر بند رہنے والی عورتیں تھیں۔ ماں کبھی کبھار باپ کے ساتھ کھیت پر چلی جاتی مگر بہنوں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ میرا باپ ویسے بھی ایک خوشحال زمیندار تھا جسے گھر کی عورتوں کو کھیتوں پر کام کروانے کی محتاجی نہیں تھی۔

شہر میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی میرے بڑے بھائی کی سوچ میں تبدیلی آنا شروع ہوگئی۔ اب وہ جب بھی چھٹیوں میں گھر آتا تو مسلم لیگ کی بات کرتا، جناح کے گمن گاتا، مسلمانوں کے حقوق پر بولتا۔ دو قومی نظریہ کے حق میں دلیلیں دیتا۔ وہ اپنے کالج کے بہت سے دوسرے مسلمان طلبہ کے ساتھ جناح کی تقریریں سننے جایا کرتا تھا اور شاید یہ Metamorphosis (تبدیلی) وہیں ہوا تھا۔

”ان کی آواز میں جادو ہے، وہ بات کرتے ہیں تو ہندو لیڈرز کو لرزادیتے ہیں، ان کی دلیلوں کے پر نچے اڑا کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ لوگ تو گھروں کے اندر رہتے ہیں، آپ کو کیا پتا شہروں میں انگریز اور ہندو مسلمانوں کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ آج ہندو انگریز کے پالتو کتے کا کام کر رہا ہے۔ انگریزوں کے جانے کے بعد ہندو انگریز کی جگہ لے لے گا اور مسلمان ہندو کی اوز کم از کم میں تو کسی پالتو کتے کا کردار ادا کرنے کو تیار نہیں۔“

میرا بڑا بھائی مظفر چولہے کے پاس چوکی پر بیٹھ کر روٹی کھاتا اور ساتھ بولتا جاتا۔ میری تینوں بہنیں میں اور ماں اس کے گرد بیٹھے اسے مرعوب انداز میں دیکھتے رہتے۔ میری بڑی بہن شکیلہ اسے پورا وقت پکھا جھلتی رہتی۔ ماں گرم گرم روٹیاں اس کے سامنے اتار کر رکھتی جاتی۔ مجھلی بہن صغریٰ ساکن کم ہوتے ہی کٹورہ بھر دیتی۔ چھوٹی بہن مسلسل پانی کا گلاس دیکھتی رہی کہ وہ خالی ہو تو اسے برقی رقماری سے بھرے اور میں..... میں صرف اس کی باتیں، اس کی آواز کا اتار چڑھاؤ، اس کے چہرے کا بدلنا ہوا رنگ دیکھتا رہتا۔ جناح کون تھا؟ مسلم لیگ کیا کام کر رہی تھی؟ دو قومی نظریہ کیا تھا؟ اور پاکستان کیا تھا؟ یہ ہم سب نے مظفر سے جانا تھا۔

وہ ہر بار نئی خبروں کے ساتھ واپس آتا۔ ہر بار اس کی آواز میں پہلے سے زیادہ جوش ہوتا۔ آنکھوں میں پہلے سے زیادہ چمک ہوتی، چہرے پر پہلے سے زیادہ سرخی ہوتی اور جمبوی میں پہلے سے زیادہ خواب ہوتے۔

میرا باپ گھر کا واحد شخص تھا جو مظفر کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اسے گھر میں سب سے زیادہ مظفر سے محبت تھی یہی وجہ تھی کہ وہ اسے ڈانٹتا نہیں تھا مگر اس کی ہر بات کے جواب میں وہ کہتا۔

”تم اس شخص کی تقریروں کی بات کرتے ہو جسے کافر قرار دیا جا چکا ہے۔ کوئی

مولوی اسے مسلمان ماننے کو تیار نہیں، سب کہہ رہے ہیں جناح پاگل ہے، کافر ہے، مسلمانوں میں تفرقہ پھیلا رہا ہے۔ میں تو ان لوگوں کی بات سنوں گا اور اسی پر عمل کروں گا، جناح کی نہیں۔“

میرے باپ کی ایک ہی رٹ ہوتی، چوپال میں اب سیاست پر ہی بات ہوتی تھی۔ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں بحثیں ہوتیں، مسلم لیگ اور کانگریس کے بارے میں بات ہوتی۔ گاندھی، نہرو، مولانا عبدالکلام آزاد اور جناح، جوہر اور لیاقت علی خان کا موازنہ کیا جاتا۔ مسلم لیگ اور اس کے لیڈر کو گالیاں دی جاتیں میرا باپ بھی انہی مسلمانوں میں شامل ہوتا جو اسے گالیاں دیا کرتے تھے۔

1940ء کا عشرہ چل رہا تھا۔ میری بڑی بہن کی منگنی میرے ماموں زاد کے ساتھ ہو چکی تھی۔ کچھ عرصہ تک شادی ہونے والی تھی۔ مگر پھر میرے ماموں زاد نے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا، شادی ملتوی ہو گئی۔ طے یہ پایا کہ وہ تعلیم مکمل کر لے پھر شادی کی جائے گی۔ ان ہی دنوں پنجاب کے کچھ علاقوں میں مسلمانوں کے خلاف بڑے پیمانے پر قتل و غارت کی گئی، چوپال میں یہ خبریں بھی پہنچتی ہیں۔

”ہاں تو جو لوگ غلط کام کرتے ہیں، ان کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ لوگ کیوں مسلم لیگ کے گماشتے بنے پھرتے ہیں۔ نہ یہ مشتعل کرنے والے کام کریں نہ مارے جائیں۔“ سکھ شیخ نے ان فسادات پر چوپال میں بیٹھ کر یہ تبصرہ کیا۔

”مگر اس طرح پورے کے پورے گھر کو جلا دینا اور خاندان قتل کر دینا کہاں کا انصاف ہے۔ قتل تو نہیں کرنا چاہئے۔ وہ جو بات کہتے ہیں سن لیں اور ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیں۔ لیکن مار دینا..... یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔“

پہلی بار میرے باپ نے چوپال میں بیٹھ کر ایسی بات کہی۔

”کیوں انصاف نہیں ہے، یہ فساد کیوں ہیں ان کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے۔ بڑا وارہ کرنا چاہتے ہیں یہ..... گھر میں دیوار اٹھا دینا چاہتے ہیں..... ٹھیک کیا اگر ایسوں کو مارا۔“

چوپال میں بیٹھے ہوئے ایک ہندو نے کہا اور وہاں بیٹھے سب لوگوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ میرا باپ خاموش ہو گیا۔

1945ء کا سال شروع ہو چکا تھا۔ 1945ء اور 1946ء کے دسمبر جنوری میں انتخابات منعقد ہوئے اور یہ وہ انتخابات تھے جن میں میرے بھائی مظفر نے مسلم لیگ کے اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا کام کرتے ہوئے مسلم لیگ کے امیدواروں کی کنویں تک کی۔ وہ اپنے

علاقے سے انتخاب لڑنے والے مسلم کے امیدواروں کے لیے علاقے کے تمام مسلمانوں کے گھر جاتا رہا اور وہاں کے ہندوؤں اور سکھوں کی نظروں میں آ گیا۔

چوپال میں پہلی بار میرے باپ کو اس کے بیٹے کی سرگرمیوں پر سرزنش کی گئی۔ میرا باپ خاموش رہا۔ وہ کیا کہہ سکتا تھا، الزامات سچ تھے۔ اس رات گھر آ کر اس نے پہلی بار میرے بھائی کو ڈانٹا۔ ”نہیں ابا! یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اس بار گھر نہیں بیٹھ سکتا۔ اس بار اگر مسلم لیگ کے ساتھ الیکشنز میں وہ سب کچھ ہوا جو پچھلے الیکشنز میں ہوا تھا اور وہ اتنی بری طرح ہاری جس طرح پچھلی بار ہاری تھی تو ہم سب کچھ ہار جائیں گے۔ انگریز ہمیں ہندوؤں کے حوالے کر کے چلے جائیں گے اور مجھ کو ان کا کتا نہیں بننا۔ اس بار اگر ہم نے مسلم لیگ کا ساتھ نہ دیا تو پھر اگلے کئی سو سال غلامی گزاریں گے اور اس بار غلامی پہلے سے زیادہ بدتر ہوگی۔“

میں نے زندگی میں کبھی اپنے بھائی کو اتنی بلند آواز میں اپنے باپ سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا، مگر اس رات وہ بولتا رہا۔ میرے باپ کی کوئی دلیل اسے قائل نہیں کر سکی۔ جمعیت علمائے ہند کے بیانات کے حوالے بھی اسے متاثر نہیں کر سکے۔

”جو لوگ آج جناح کو کافر کہتے ہیں، وہ کل جناح کا ہاتھ چوما کریں گے اور اس کا مزار بنا کر اس پر فاتحہ پڑھا کریں گے۔ جو لوگ آج پاکستان کے مطالبے کو ذمہ دار کہتے ہیں اور اسے گالیاں دیتے ہیں، وہ کل اسی پاکستان میں پناہ لینے کے لیے بھاگیں گے۔ جناح کافر نہیں ہے وہ پریکٹیکل مسلمان ہے۔ مولویوں کی طرح دین کی بات نہیں کرتا، دین پر عمل کرتا ہے۔ یہ وہ مولوی ہیں جو پچھلے سو سال میں ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریز کی غلامی سے آزاد نہیں کروا سکے اور اب جو آزادی کی بات کر رہا ہے وہ شخص ان کو کافر نظر آتا ہے۔ یہ لوگ دستاریں اور چونے پہن کر بھی میرے لیے اگر آزادی نہیں لاسکتے تو مجھے اس شخص کے پیچھے کھڑے ہونے دیں جو پینٹ کوٹ پہن کر اور سگار پی کر مجھے وہ زمین دلا دے گا، جہاں میں مسجد میں بلند آواز میں اذان دوں تو میرا سر کاٹنے کے لیے ہندو اندر نہ آجائیں۔“

میرا باپ بول نہیں سکا، وہ اس کے بعد کبھی بھی میرے بھائی کے سامنے بول نہیں سکا۔ مسلم لیگ نے 1945ء اور 1946ء کے انتخابات میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی اور وہ مسلمانوں کی تقریباً تمام سٹیٹس جیت گئی۔

کانگریس کے حامی مسلمان امیدوار ہمارے علاقے میں بری طرح ہارے۔ الیکشنز میں جمعیت کے بعد مسلم لیگ کے مطالبے میں اور بھی شدت آ گئی۔ برٹش حکومت اب مسلم لیگ کو پہلے کی طرح نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

سڑک پر چلتے ہوئے مجھے ٹھوکر لگی۔ میں نے بے اختیار خود کو سنبالا اور آنکھوں پر لگائی ہوئی عینک کو ٹھیک کیا۔ اب ہلکی ہلکی ہوا کچھ تیز ہو گئی ہے، بادل پہلے سے زیادہ گھنے ہو گئے ہیں۔ سامنے سڑک پر دو ٹین ايجر لڑکے جاگنگ کرتے ہوئے آرہے ہیں۔ ٹی شرٹس اور شارٹس میں لمبوس..... میں ان دونوں کو بھی پہچانتا ہوں، وہ روز مجھے تقریباً نہیں ملتے ہیں۔ پچھلی رات کے کسی نہ کسی انڈین پروگرام یا انڈین مووی اشار کو ڈیکس کرتے۔ آج بھی ان کا موضوع یہی ہے۔ میں ان کی آوازیں سن رہا ہوں۔ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ۔

”اے آرحمان یار کیا کمال کرتا ہے یہ بندہ، رات کو دوندے ماترم لگا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا دل پر بیٹ پڑ رہی ہے۔ سارا دن پاکستانی چینلو پر پروپیگنڈہ سنتا رہا۔ وہی بکواس..... وہی گانے..... یہ لوگ لبرل ہونا نہیں چاہتے۔ چاہتے ہی نہیں کہ ہمارے اندر سے یہ Prejudice (تعصب) ختم ہو..... ہر چیز ہماری اور ان کی کامن ہے حتیٰ کہ آزادی کے دن بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ پھر بھی یہ چاہتے ہیں ہم ہر وقت ہاتھ میں تلوار پکڑے رکھیں۔ میں تو سمجھتا ہوں

“Across the borders we are one”

اس کی بات جاری تھی مگر وہ دونوں میرے پاس سے گزر چکے تھے، میں اب ان کی آواز نہیں سن سکتا مگر اس کا جملہ ”Across the borders we are one“ اب بھی نعتاً میں بازگشت بن کر پھر رہا ہے۔ سب کچھ کامن ہے، ہر چیز ایک جیسی ہے۔ Prejudice (تعصب)..... پروپیگنڈہ..... بکواس..... میں نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔



میں آج تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ میرے باپ نے اتنے بڑے حادثے کے بعد اپنا ذہنی توازن کیوں نہیں کھویا..... مظفر سے زیادہ اسے کسی سے محبت نہیں تھی میں نے خود نہیں دیکھا مگر دیکھنے والے کہتے ہیں میرے باپ نے میرے بھائی کی لاش کے تمام ٹکڑے خود اکٹھے کیے تھے، برستی آنکھوں کے ساتھ..... کسی چیخ و پکار کے بغیر۔ اس نے میرے بھائی کا پورا جسم اکٹھا کیا، وہ ہر چکر کے بعد جسم کے ٹکڑے دوبارہ گنتا پھر جو ٹکڑے کم ہوتے ان کے نام دہراتا۔ دائیں ٹانگ..... ناک..... بائیں کان..... بائیں ہاتھ..... پیر کا اگٹھا..... دائیں ہاتھ کی چار انگلیاں.....

ہاتھ کی دو انگلیاں وہ آدھ گھنٹہ ڈھونڈتا رہا۔ جب وہ مل گئیں تو اسے جیسے قرار

جو پال میں میرے باپ کے لیے ناپسندیدگی اور بڑھ گئی۔ میرے بھائی کے خلاف باتیں کی جاتیں، میرا باپ اگر بڑا زمیندار نہ ہوتا تو شاید اب تک اسے جو پال سے نکال دیا جاتا مگر اب بھی وہ ایک طرح کے سوشل بائیکاٹ کا شکار تھا حالانکہ وہ اب بھی کانگریس کی بات کرتا تھا اور اس نے ایکشن میں کانگریس کے حامی امیدوار کو بھی ووٹ دیا تھا۔ اس کے باوجود جو پال میں کوئی بھی اس سے خوش نہیں تھا۔

3 جون 1947ء کو تقسیم ہند کا اعلان کر دیا گیا۔ میرا بھائی اس خبر پر خوشی سے پاگل ہو کر گھرا آیا تھا۔ میرا باپ ہمیشہ کی طرح ناخوش تھا۔

”اب ہم پاکستان چلے جائیں گے۔ وہاں مغربی پنجاب میں رہیں گے۔ آپ لوگ انتقامات شروع کر دیں۔“ اس نے میرے باپ سے کہا۔

”میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہاں میری زمینیں اور گھرا رہے ہیں کوئی احمق ہوں جو انہیں چھوڑ جاؤں۔ پھر یہاں ہمیں تکلیف کیا ہے۔“

میرے باپ نے ہمیشہ والا جواب دیا۔

”ہم وہاں کلیم داخل کروائیں تو زمینیں اور گھر ہمیں وہاں بھی الاٹ ہو جائے گا۔“

میرے بھائی نے باپ کو سمجھایا مگر وہ رضامند نہیں ہوا۔

”ٹھیک ہے آپ مت جائیں مگر میں پاکستان میں ہی رہوں گا۔“ میرے بھائی نے اعلان کیا میرے باپ نے پھر بھی اس کی بات پر کان نہیں دھرے۔

تیسرے دن میرے بھائی کو واپس شہر جانا تھا۔ میرے باپ نے اس سے کہا کہ وہ اگلے دن میری ماں اور بڑی بہن کو ساتھ والے گاؤں میں چچا کے گھر چھوڑ آئے۔ میری چچا زاد کی شادی ہونے والی تھی اور میری ماں بڑی بہن کے ساتھ وہاں جانی پھر اسے رہنے کے لیے چھوڑ کر اسی دن بھائی کے ساتھ واپس آ جاتی۔

وہ تینوں چچا کے گھر کبھی نہیں پہنچ سکے۔ گاؤں کے باہر جانے والے رستے پر میری ماں اور بھائی کو بڑی بے رحمی کے ساتھ ذبح کر دیا گیا۔ میرے بھائی کے جسم کے کئی ٹکڑے کر کے وہاں پھینک گئے ہاں البتہ میری ماں پر رحم کیا گیا، اس کی صرف گردن کاٹی گئی جسے ایک درخت پر لٹکا دیا گیا تھا۔ میری بڑی بہن شکلیہ کا اس دن کچھ پتا نہیں چلا البتہ تین چار دن بعد گاؤں کے قریبی جنگل میں اس کی بے لباس لاش کٹی پھٹی حالت میں ملی تھی۔ اسے صرف جنگلی جانوروں نے نہیں ادھیڑا تھا انسانی جانوروں نے بھی بھینچوڑا تھا۔



آ گیا۔ اب اس کے بیٹے کا جسم نامکمل نہیں رہا تھا۔ وہ جسم کا ہر ٹکڑا اٹھا کر اس پر لگی ہوئی گرد اور مٹی صاف کر دیتا اگر چہ وہ خون خشک نہیں کر پاتا تھا مگر وہ سارے نکلے اور مٹی کو ضرور صاف کر دیتا۔ اس کے کندھے پر لٹکا ہوا کپڑا اس خون آلود مٹی اور نکلوں سے بھر گیا تھا۔ میرے بھائی کی عمر اس وقت صرف بیس سال تھی، پورا گاؤں جانتا تھا کہ وہ شریف اور ہر ایک کی عزت کرنے والا تھا۔ اسے کبھی کسی نے جھگڑتے نہیں دیکھا تھا۔ مسلم لیگ کے لیے کام کرنے کے علاوہ اس نے زندگی میں کوئی جرم نہیں کیا تھا اور یہ کوئی معمولی جرم نہیں تھا۔ کم از کم اس زمانے میں اتنی بے رحمی کے ساتھ قتل ہونے کے لیے صرف دو چیزیں کافی تھیں۔ مسلمان ہونا اور مسلم لیگ کا حامی ہونا، اور بد قسمتی سے میرے بھائی میں دونوں خصوصیات تھیں۔

میرے بھائی کے جسم کے ٹکڑے اکٹھے کرنے کے بعد میرے باپ نے درخت سے میری ماں کا سر اتارا تھا۔ پھر وہ دونوں لاشیں گھر لے آیا۔ میں اور میری دونوں بہنیں سکتے میں آگئے تھے۔ اگرچہ میرے باپ نے ہم تینوں کو وہ لاشیں دیکھنے نہیں دیں۔ اس نے سوچا ہو گا کہ ہم تینوں کو خوف اور صدمے کے مارے کچھ..... میں اس وقت چودہ سال کا تھا، میری چھوٹی بہن ساڑھے پندرہ سال کی تھی اور منجھلی بہن سترہ سال کی۔

بھائی کی لاش کو میرے باپ نے خود غسل دیا۔ غسل دینے کے بعد اس نے ایک سفید چادر پر اس کے جسم کے ٹکڑے رکھے اور اس کے اوپر دوسری سفید چادر ڈال کر دونوں چادروں کو چاروں جانب سے سی دیا۔ میں نے اپنے باپ کو کبھی سوئی ہاتھ میں نہیں لیتے دیکھا، نالکے کیسے لگاتے ہیں، یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ بہر حال اس دن ان چادروں کو اس نے خود ہی سیا تھا۔ کیسے سیا ہوگا۔ میں نہیں جانتا کیونکہ اس نے یہ کام اکیلے کمرے میں بند ہو کر کیا تھا۔ جب کمرے کا دروازہ کھلا تو ہم نے صرف وہ سفید بوری سی دیکھی جو اب بھی جگہ جگہ سے خون سے تر ہو رہی تھی۔

اپنی اڑسٹھ سالہ زندگی میں، میں نے آج تک کسی کو ویسا کفن پہننے نہیں دیکھا۔ میری دونوں بہنیں زار و قطار رو رہی تھیں مگر میں..... میں خوف زدہ تھا..... یہ سب کیوں ہوا تھا؟ کیسے ہوا تھا؟ کس نے کیا تھا؟ ان سے بڑا سوال میرے لیے یہ تھا کہ شکلیہ باجی کہاں ہیں؟ میرے اس سوال کا جواب چوتھے دن مل گیا، جب میرا باپ جنگل سے ان کی لاش لایا تھا۔ ہم نے ان کا چہرہ بھی نہیں دیکھا شاید..... وہ بھی دیکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

”تمہیں منع کیا تھا کہ اپنے بیٹے کو ایسے کام مت کرنے دو۔ تم نے بات نہیں سنی، اب ہم تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ تم تو جانتے ہو جوان خون گرم ہوتا ہے۔ لڑکوں کو بڑا

غصہ تھا تمہارے بیٹے پر..... جوش میں کر بیٹھے یہ سب کچھ..... اب صحیح پتا بھی نہیں ہے کہ کس کس نے حصہ لیا اس کام میں..... اس لیے پولیس کو کیا بتاتے۔ تم بس بھول جاؤ یہ سب کچھ..... ہمیں بڑا دکھ ہے جو کچھ تمہارے گھر والوں کے ساتھ ہوا ہے مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ غلطی تمہارے بیٹے ہی کی ہے..... جس نے ایک غلط کام کی ابتدا کی۔“

گاؤں کے سرخی سردار جو گندہ سنگھ نے میرے باپ کی وادسی ان الفاظ میں کی تھی۔

”غلط کام.....“ شاید میرے باپ نے پہلی بار وہاں بیٹھ کر غلط کام کی تعریف کے بارے میں سوچا ہو گا اور شاید..... اس دن ہی پہلی بار گھر آتے ہوئے اس نے راستے میں کھڑے ہندو اور سکھ لڑکوں کو دیکھا ہو گا۔ ان کے قبضوں پر غور کیا ہو گا اور پھر شاید یہ اندازہ لگانے کی کوشش بھی کی ہوگی کہ ان میں سے کس نے اس کی بیوی کی گردن کاٹی۔ کتنوں نے اس کے بیٹے کے ٹکڑے کیسے اور کس کس نے اس کی بیٹی..... بہر حال وہ گھر آ گیا تھا، خاموشی اور بے بسی کے ساتھ..... جھکے ہوئے کندھوں اور خالی آنکھوں کے ساتھ..... خاموش زبان اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ..... پھر اس دن کے بعد وہ دوبارہ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلا نہ ہی ہم تینوں میں سے کوئی کہیں گیا۔

وہ پنجاب کی تقسیم کا انتظار کر رہا تھا۔ منتظر تھا کہ اسے یہ پتا چل جائے کہ اس کا علاقہ پاکستانی پنجاب میں شامل ہو گا یا ہندوستانی پنجاب میں۔

پھر یہ پتا چل گیا کہ ہمارا علاقہ پاکستان کے ساتھ شامل نہیں ہوگا۔

”ہم لوگ پاکستان جائیں گے“ ایک رات میرے باپ نے مجھ سے کہا..... تب تک ساتھ والے دونوں گاؤں میں مسلمانوں کے گھر لوٹے جا چکے تھے اور ہمارے گاؤں کے مسلمان ہجرت کی تیاریوں میں تھے.....

”تم اور میں.....“ میں اپنے باپ کی بات پر حیران رہ گیا۔ ”اور صفائی اور سلی وہ نہیں جائیں گی؟“ میں نے اپنے باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔

”نہیں.....“ مجھے خوف آنے لگا۔ ”آپ انہیں یہاں چھوڑ جائیں گے؟“

”نہیں.....“

میں الجھ گیا۔

”میں..... میں انہیں مار دوں گا۔“

میں بول نہیں سکا۔ چودہ سال کا ایک بچہ یہ سن کر کیا بول سکتا ہے کہ اس کا باپ اس کی دونوں بڑی بہنوں کو قتل کرنے والا ہے۔

”میں نہیں ماروں گا تو کوئی اور مار دے گا.....“ وہ اب رورہا تھا۔

میں پوری رات سو نہیں سکا۔ مجھے لگا کہ میں سوؤں گا اور میرا باپ میری بہنوں کو قتل کر دے گا۔ میرے باپ نے اس رات میری بہنوں کو قتل نہیں کیا۔ یہ کام اس نے اگلی رات کیا۔



مجھے ہلکی ہلکی پھوار اپنے جسم پر گرتی محسوس ہوئی۔ بارش شروع ہو چکی ہے۔ میں جانتا ہوں آہستہ آہستہ برسات کی یہ بارش تیز ہو جائے گی مگر مجھے اس سے کوئی خوف نہیں آرہا۔ اس سڑک پر چلنے والے سب لوگ ہی بارش سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ سامنے سے اب دو عورتیں آ رہی ہیں، شاید وہ اب واپس گھروں کو جا رہی ہیں۔ میں ان کو بھی پہچانتا ہوں۔

”اس ملک میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اصلاح نے تو کینیڈا امیگریشن کے لئے اپلائی کیا ہوا ہے۔ بس چند ہفتوں تک سارا کام ہو جائے گا پھر ہم سب وہیں جا کر سٹیبل ہو جائیں گے۔ پاکستان میں تو اب مجبوری میں ہی رہا جا سکتا ہے۔ میرا سارا میکہ اور سسرال امریکہ اور کینیڈا شفٹ ہو چکا ہے۔ بس اصلاح تھے جو یہاں اٹکے ہوئے تھے۔ ان کی حب الوطنی ختم کرتے کرتے خاصا وقت لگ گیا مجھے.....“ وہ ہنسی۔

”چلو ویر آید درست آید.....“ دوسری عورت نے بھی تہقہہ لگایا۔ وہ دونوں بھی میرے قریب سے گزر گئی ہیں۔

”اس ملک میں کچھ بھی نہیں ہے۔“

اس عورت کا جملہ میرے کانوں میں گونج رہا ہے، وہ عورت وہ جملہ کہنے والی واحد عورت نہیں ہے۔ پچھلے کئی سالوں سے یہ جملہ بہت سے لوگوں سے سن رہا ہوں۔

”کسی بھی ملک میں کچھ نہیں ہوتا۔ ہر ملک زمین کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے اصل چیز اس زمین کے ٹکڑے پر بسنے والے لوگوں میں ہوتی ہے۔ کسی ہمیشہ ان لوگوں میں ہوتی ہے اور یہ خامی اس ملک کا تعارف بن جاتی ہے۔ ایسا سائن بورڈ جسے پھر وہ ملک اٹھائے پھرتا ہے۔“ میں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ یہ بات مجھے کس نے کہی تھی اور مجھے یاد آ گیا کہ یہ بات کس نے کہی تھی۔



میرے باپ نے اگلے دن صحن کے ایک کونے میں اس چھری کی دھار کو تیز کیا جس سے ہر سال بکرے ذبح کیے جاتے تھے۔ وہ کندھے پر پڑے ہوئے کپڑے کے ساتھ اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو صاف کرتا جاتا اور پتھر پر چھری کو رگڑتا جاتا۔ میں ایک

دفعہ اسے چھری ہاتھ میں لیے دیکھ کر کمرے میں آ گیا اور پھر باہر نہیں گیا۔ چار پائی پر بیٹھے میں اپنی دونوں بڑی بہنوں کو کمرے میں آتے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

اس دن میں نے ایک لمحہ کے لئے بھی ان کے چہروں سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ میں جانتا تھا زندگی میں دوبارہ کبھی میں ان چہروں کو نہیں دیکھ سکوں گا۔ وہ رات کو سو گئیں تو میرے باپ نے مجھے کمرے سے باہر جانے کے لیے کہا۔ میں کپکپاتے ہوئے باہر آ گیا، کچھ دیر بعد میرا باپ بھی باہر آ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لائٹن اور دوسرے میں چھری تھی مگر چھری پر خون نہیں تھا۔ میں خشک لبوں کے ساتھ باپ کو دیکھتا رہا۔ ”میں انہیں مار نہیں سکا..... میں اپنے ہاتھ سے انہیں مار نہیں سکتا۔ میں گھر کو جلا دیتا ہوں وہ اس کے ساتھ ہی جمل جائیں گی۔“ میرے باپ نے کانپتی آواز میں کہا۔

اس نے ان کی چار پائیوں کے گرد مٹی کا تیل چھڑک دیا اور پھر آگ لگا کر دروازہ بند کر دیا۔ صحن میں کھڑے ہو کر میں نے اپنی بہنوں کی چیخیں سنی تھیں یا پھر شاید چتا جلنے دیکھی تھی ہم لوگ تب تک وہاں کھڑے رہے جب تک آگ کے شعلے پوری طرح بجڑنے نہیں لگے پھر میں صحن میں بیٹھ کر بلند آواز میں رونے لگا۔ ان بہنوں نے مجھے اپنی گود میں کھلایا تھا، میں نے ان کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا تھا۔ اب ان کی چیخیں..... ان کی چیخیں.....

”یہ جلدی مر جائیں، جلدی مر جائیں، جلدی مر جائیں۔“ میں زمین پر بیٹھا بلند آواز میں دعا کر رہا تھا..... پھر..... پھر..... آہستہ آہستہ آگ نے پورے کمرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور..... اور..... چیخیں دم توڑ گئیں۔

تب میرے باپ نے مجھے اور اس گھنڑی کو لیا جو اس نے پہلے ہی تیار کر کے رکھی تھی اور ہم راتوں رات وہ جگہ چھوڑ گئے ہم دونوں ایک گھوڑے پر سوار تھے جسے میرا باپ دوڑا رہا تھا اور میں اس کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ فجر کے وقت ہم کسی گاؤں میں داخل ہوئے، جہاں اور بھی بہت سے لوگ تھے اور ان میں وہ چھ قاتل بھی تھے۔ ویسے ہی قاتل جیسا میرا باپ تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا..... وہی جو ہر قافلے کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک لمبا سفر طے

کر کے ہم جس دن پاکستان میں داخل ہوئے، وہ پندرہ اگست کا دن تھا اور لاہور کا بارڈر تھا اور تب میرے باپ نے زمین سے مٹی کی ایک مٹھی اٹھا کر اس رومال میں رکھی جو وہ ہر وقت کندھے پر لیے رہتا تھا اور جس سے اُس نے میرے بھائی کے جسم سے گرد صاف کی تھی اور پھر اس کی ایک پوٹلی ہی بنا کر اس نے اپنی جیب میں رکھ لی..... اور..... اور..... اس کے بعد

میرا باپ دھائیں مار مار کر زمین سے سرگرا کر روتا رہا۔

میں نے اسے بھائی، ماں اور شکیلہ ہاجی کے ساتھ ہونے والے حادثے پر بھی اس طرح روتے نہیں دیکھا تھا، تب وہ صرف آنسو بہاتا رہا تھا۔ مگر اس دن وہ بلند آواز میں چیخ چیخ کر روتا رہا تھا۔ وہاں میرے علاوہ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا وہاں اس کے علاوہ بھی اور بہت سے رونے والے تھے۔ صرف میں تھا جو زمین پر بیٹھا گیلی آنکھ کے ساتھ باپ کی دیوانگی دیکھتا رہا۔ اب اتنے سالوں بعد میں سوچتا ہوں کہ وہ کیوں رویا تھا۔ کیا اسے اپنا خاندان یاد آیا تھا۔ زمینیں اور گھر یاد آ رہا تھا یا پھر.....

میں نے اس کے بعد اپنے باپ کو کبھی روتے نہیں دیکھا..... بڑی سے بڑی مصیبت یا تکلیف پر بھی نہیں.....

ہم کمپ میں رہنے لگے۔ ہم نے کلیم جمع کروایا، ہمیں زمین اور گھر الاٹ ہو گیا۔ میرے باپ نے مجھے لاہور پڑھنے کے لیے بھجوا دیا۔ تب تک وہ پچاس کا ہو چکا تھا۔ اس نے دوبارہ شادی نہیں کی..... زمین سے ہونے والی آمدنی کو وہ فلاحی کاموں میں خرچ کرتا رہتا۔ اس کے اپنے سارے شوق اور سرگرمیاں ختم ہو گئی تھیں۔ گھوڑے پالنے کا شوق..... مرنے لڑانے کا شوق..... میلوں میں جانا..... کبوتر پالنا..... اس نے سب کو چھوڑ دیا۔ جب تک میں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کیا وہ ایک بار پھر علاقے کا ایک بڑا زمیندار بن چکا تھا۔ رزق کے معاملے میں وہ ہمیشہ سے خوش قسمت رہا تھا مگر اس بار وہ معمولی سے کپڑے کے لانچے کرتے میں وہ کئی کئی دن گزار دیتا۔ کھیت پر مزارعوں کے ساتھ کام کرتا، ان کے ساتھ ہی کھانا کھا لیتا۔

میرے اور اس کے درمیان کبھی پچھلے واقعات کے بارے میں بات نہیں ہوئی۔ جب تک وہ زندہ رہا اس نے کبھی ماں، بہنوں یا بھائیوں کا نام تک نہیں لیا اور نہ ہی میں نے کبھی لیا۔ ہم دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی بہت کم ہوتی تھی۔ میں لاہور سے گاؤں جاتا وہ میرا حال احوال پوچھتا، میں جواب دیتا، وہ کھانے کا کہتا پھر باہر نکل جاتا۔ جس دن مجھے واپس آنا ہوتا، وہ میرے لیے کچھ چیزیں تیار کروا دیتا، کچھ نوٹ تھماتا اور ٹانگے پر بٹھا دیتا۔ ہر ماہ لاہور آتا، مجھے ہاسٹل میں ملتا پھر وہی چیزیں کپڑے اور روپے دیتا۔ ہم دونوں کچھ دیر خاموشی سے ایک دوسرے کے سامنے نظریں جھکائے بیٹھے رہتے پھر وہ چلا جاتا۔

ماسٹرز کے بعد میں نے انگریز مزید تعلیم کے لیے جانے کی خواہش کی، وہ مان گیا۔ جانے سے پہلے اس نے میری شادی کرنے کی خواہش کی، میں مان گیا۔

اس نے مجھ سے میری پسند پوچھی۔ میں ایک گھنٹہ سر جھکائے کسی ایسی لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا جو مجھے پسند ہوتی۔ تصور میں کسی لڑکی کی شبیہ نہیں آئی میں نے کہا۔ ”کسی بھی تعلیم یافتہ لڑکی سے میری شادی کر دیں۔“ چوتھے دن سلیمہ بانو سے میرا نکاح ہوا، آٹھویں دن میں انگریز آ گیا دو ماہ کے بعد وہ بھی انگریز آ گئی۔

سلیمہ گورنمنٹ کالج لاہور کی تعلیم یافتہ تھی۔ میں بعض دفعہ سوچتا ہوں اگر وہ میری زندگی میں نہ آتی تو کیا ہوتا۔ وہ واقعی میری نصف بہتر ہے۔ اس نے میری زندگی کے بہت سے خلاؤں کو پر کیا، وہ جتنی اچھی بیوی ثابت ہوئی اتنی ہی اچھی بہو تھی۔ میرے پی ایچ ڈی کے دوران مجھے اپنے باپ کی بیماری کی اطلاع ملی، میں اپنی تعلیم چھوڑ کر واپس نہیں جاسکتا تھا اور میرا باپ میرے پاس آنے پر تیار نہیں تھا۔ درمیانی راستہ سلیمہ نے نکالا۔ وہ میرے دو سالہ بیٹے کو لے کر لندن سے پنجاب کے اس گاؤں میں چلی گئی، جہاں بجلی تھی نہ ہی صاف پانی۔ اگلے دو سال اس نے وہیں میرے باپ کے ساتھ گزارے۔ دو سال بعد میرے باپ کا انتقال ہو گیا تو وہ میرے ساتھ واپس لندن آ گئی کیونکہ میرا ڈاکٹریٹ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ میرے باپ نے مرنے سے پہلے گاؤں میں موجود اپنی ساری زمین مزاعوں میں بانٹ دی۔ اس نے ایسا کرنے سے پہلے مجھ سے اور سلیمہ سے اس کی اجازت لی، مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔

”یہ آپ کا اور ابو کا معاملہ ہے مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت ہی نہیں ہے“ سلیمہ نے میرے اجازت لینے پر کہا۔

آٹھ سال تک انگریز رہنے کے بعد میں واپس پاکستان آ گیا۔ یہاں آ کر مجھے پنجاب یونیورسٹی میں جاب مل گئی۔ جو کچھ میں انگریز چھوڑ آیا تھا اس کے سامنے یہ جاب اور سہولتیں کچھ بھی نہیں تھیں مگر میں پھر بھی خوش اور مطمئن تھا۔ میں اپنے ملک کو وہ سب کچھ لوٹانے آیا تھا جو اس نے مجھے دیا تھا اور یہاں واپس آنے کے بعد پہلی بار یہ جملہ میں نے اپنے ایک کولیک کی بیوی سے 1963ء میں سنا جب وہ ہمارے گھر کھانے کی ایک دعوت پر آئے۔ میں چپ چاپ اس عورت کا چہرہ دیکھتا رہا۔ لفظ میرے اندر موم کی طرح گھل گئے تھے۔

”اس ملک میں کچھ بھی نہیں ہے۔“

میں نے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی ہوئی اس عورت کو دیکھا جو رزق برق کپڑوں میں ملبوس تھی، جس کے ہاتھوں میں بہت سے زیور تھے۔

اس ڈائننگ ٹیبل کو دیکھا جو کھانے کے بہت سے لوازمات سے بھری ہوئی تھی اور پھر

اس عورت کی بھری ہوئی پلیٹ کو دیکھا..... پھر مجھے دو چادروں میں سے ہونے اپنے بھائی کی لاش کے ٹکڑے یاد آئے آگ سے جلنے ہوئے گھر میں اپنی دونوں بہنوں کی چھینیں یاد آئیں۔ مٹی کی وہ پوٹلی یاد آئی جو میرے باپ نے مرنے سے پہلے سلیمہ کو اپنے پاس رکھنے کے لیے دی تھی۔ میری بھوک ختم ہو گئی، میں نے چادروں سے بھرا ہوا بیچ دھیرے سے پلیٹ میں الٹا دیا۔

”کسی بھی ملک میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہر ملک زمین کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ اصل چیز اس زمین کے ٹکڑے پر بسنے والے لوگوں کے اندر ہوتی ہے، خامی ہمیشہ ان لوگوں کے اندر ہوتی ہے، اور یہ خامی اس ملک کا تعارف بن جاتی ہے۔ ایسا ساکن بورڈ جسے پھر وہ ملک اٹھائے پھرتا ہے۔“

میں خاموش رہا تھا مگر سلیمہ خاموش نہیں رہی۔ بڑے پرسکون اور ٹھنڈے لہجے میں اس نے اس عورت سے کہا۔ اس بار خاموشی اس عورت پر چھائی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی بیوی کو منھکوں نظروں سے دیکھا جو اب میرے کولیک کو ایک ڈش سرد کر رہی تھی۔



میرا باپ دو سال بیمار رہا تھا، اس کی وفات پر میں پاکستان آیا تب اسے دفنایا جا چکا تھا۔ میں نے اس کا بھی چہرہ نہیں دیکھا..... میں رویا بھی نہیں..... کئی دن میں خاموش رہا۔ سلیمہ نے کوشش کی کہ وہ مجھ سے میرے باپ کے بارے میں بات کرے مگر میں ہر بار موضوع بدل دیتا۔ پھر شاید وہ جان گئی کہ میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔ اس نے دوبارہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

لندن واپس آنے کے کئی ماہ بعد تک میں اسی طرح گم صم رہا۔ باپ کے مرنے کے بعد میرا پورا خاندان مکمل طور پر ختم ہو گیا تھا۔ ایک عجیب سا احساس تنہائی مجھے ہر وقت اپنی پلیٹ میں رکھتا تھا۔

ایک رات میں نے تین بچے سلیمہ کو جگا دیا۔ وہ پریشان ہو گئی۔

”کیا بات ہے؟ آپ ٹھیک تو ہیں؟“

”ہاں میں ٹھیک ہوں..... تم مجھ سے باتیں کرو۔“

”کیا باتیں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”کوئی بھی بات..... کچھ بھی.....“

”اچھا.....“ وہ مجھے پورے دن کی روداد سنانے لگی۔ میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ شاہد

کی شرارتوں کے بارے میں بتاتی رہی، میں سنتا رہا۔ ٹی وی پر آنے والے ایک پروگرام کی تفصیلات سناتی رہی پھر وہ تھک کر خاموش ہو گئی۔

”آپ بھی تو کچھ کہیں.....“ اس نے جیسے شکایت کی۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا سر جھکائے میں نے اس سے کہا۔

”ابا نے..... مرنے سے پہلے..... تم سے..... کچھ کہا..... میرے بارے میں؟“ وہ ساکت ہو گئی۔ شاید اسے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ باپ کی وفات کے دس ماہ بعد میں اس سے پوچھ رہا تھا کہ کیا میرے باپ نے میرے بارے میں کچھ کہا تھا۔

”ہاں.....“ اس بار میں سن ہو گیا۔ میں ہمت نہیں کر پایا کہ اسے وہ الفاظ دہرانے کے لیے کہوں..... میں بنا پلکیں جھپکائے اسے دیکھتا رہا..... وہ اٹھ کر وارڈ روم کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر وہ وہاں کوئی چیز تلاش کرتی رہی پھر وہ ایک پیکٹ لے کر میری طرف چلی آئی۔ میرے قریب بیڈ پر بیٹھ کر اس نے پیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک پوٹلی نکال لی، میرا سانس رک گیا۔ میں اس کپڑے کو ساری عمر خاموش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ وہی کپڑا تھا جسے میں نے اپنے بھائی اور ماں کی لاشیں گھراتے وقت اپنے باپ کے کندھے پر خون سے لتھڑا ہوا دیکھا اور جس سے میرے باپ نے میرے بھائی کے جسم سے مٹی اور تھکے صاف کیے تھے اور پاکستان واپس آنے کے بعد اسی میں میرے باپ نے ایک مٹی مٹی ڈال کر اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔ میں نے اس کے بعد وہ کپڑا اپنے باپ کے کندھے پر کبھی نہیں دیکھا، اور آج اتنے سالوں کے بعد وہ پوٹلی میری بیوی کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے وہ پوٹلی میری طرف بڑھادی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے اسے پکڑ لیا۔

”انہوں نے کہا تھا، جمال سے کہنا واپس ضرور آئے۔ میں نے اس مٹی کے رزق سے اس کی پرورش کی ہے۔ اس پر فرض ہے کہ وہ یہ رزق میری مٹی کو لوٹا دے۔“ میں گم صم اپنی بیوی کو دیکھتا رہا۔

وہ میرے رونے کی رات تھی۔ اس رات میں رویا تھا..... اسی طرح جس طرح میرا باپ زمین سے لپٹ کر روتا رہا تھا۔ میں جان گیا تھا، وہ مٹی میرے لیے رکھی گئی تھی۔ میرا باپ جو ساری عمر ہندوستان اور کانگریس کے گن گاتا رہا..... سردار پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی کی باتیں سنا سنا کر جموتا رہا۔ وہ مرنے سے پہلے میرے لیے پاکستان کی مٹی چھوڑ کر گیا تھا شاید اپنے بیٹے کے جسم کے ٹکڑے اکٹھے کرتے ہوئے اسے پہلی بار احساس ہوا ہو گا کہ مذہب کی بنیاد پر کھڑا کیا ہوا دو قومی نظریہ دیوانے کی بڑ نہیں، حقیقت تھی۔ شاید میری ماں کی کئی

ہوئی گردن درخت سے اتارتے ہوئے اسے احساس ہوا ہوگا کہ آزادی کیا ہوتی ہے۔ شاید شکیلہ باجی کی لاش، ڈھانپتے ہوئے اسے پتا چلا ہوگا کہ ہندو کا پالتو کتا بن جانے کا مطلب کیا ہے اور شاید میری دونوں بہنوں کو گھر میں جلاتے ہوئے اسے پتا چلا ہوگا کہ آزادی، قربانی مانگی ہے۔ حاصل کرنے کے لیے بھی اور قائم رکھنے کے لیے بھی۔

ڈاکٹر بیٹ کے بعد میں نے کچھ عرصہ انگلینڈ میں ایک یونیورسٹی میں پڑھایا اور پھر واپس آ گا۔ اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق، کوئی دوسری سوچ میرے ذہن میں نہیں آئی۔ کوئی پاؤنڈ ز میرے پیروں میں نہیں لپٹے، گھر اور گاڑیاں میرے خوابوں میں نہیں آئیں اور نہ ہی سلیم نے مجھ سے وہاں رکنے کے لیے کہا۔



پھوار بند ہو گئی ہے، میں نے چند گہرے سانس لے کر اس تازہ ہوا کو اپنے اندر اتارا۔ میرے قدم ایک بار پھر تیز ہو گئے۔ سڑک پر اب بھی لوگ نظر آرہے ہیں۔ بارش کے آثار نے کسی کو بھی پریشان نہیں کیا، ظاہر ہے یہ سردیوں کی بارش نہیں ہے۔ اب میرے سامنے عظیم الدین ہاشمی چست چال چلتے ہوئے آرہے ہیں۔ ان کے پیچھے رائل فائل ہاتھ میں لیے ان کا گاڑ بھی ہے۔ ان کے ہاتھ میں ایک موبائل ہے جس پر وہ بات کر رہے ہیں۔ ان کا بیٹا یونیورسٹی میں میرا اسٹوڈنٹ رہ چکا ہے۔ وہ دور سے مجھے دیکھتے ہوئے مسکراتے ہیں اور سر کے اشارے سے سلام کرتے ہوئے فون پر بات جاری رکھتے ہیں۔ میں بھی سر کے اشارے سے ان کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔ وہ فون پر کسی سے کہہ رہے ہیں۔

”لاء اینڈ آرڈر تو تباہ ہو گیا ہے اس ملک میں، اکیلے نکلنے کی تو ہمت ہی نہیں ہوتی۔ پچھلے ماہ پی ایس ایو کے جنجنگ ڈائریکٹر شوکت مرزا کا قتل ہو گیا۔ ڈیڑھ ہفتہ پہلے صدر صاحب کہہ رہے تھے کہ میں اس ملک کے بارے میں کیا کروں..... میرا بس نہیں چلتا۔ آپ خود سوچیں اگر صدر یہ کہے کہ میں شوکت مرزا کی بیوی سے افسوس کرتے ہوئے اسے یہ یقین دہانی بھی نہیں کروا سکا کہ قاتل پکڑے جائیں گے یا نہیں، تو میرا اور آپ کا کیا ہوگا۔ ہم اور آپ تو کس کھیت کی مولیٰ ہیں۔“

وہ اب میرے پاس سے گزر رہے ہیں۔ ”اب اس طرح کے کولڈ بلڈڈ مرڈرز کے بعد اس ملک میں رہنے کو کس کا دل کرتا ہے۔“ وہ میرے پاس سے گزر گئے ہیں۔

پاکستان واپس آنے کے بعد میں یونیورسٹی میں ہی پڑھاتا رہا۔ میرے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ انگلینڈ جیسی سہولتیں میرے پاس نہیں تھیں مگر سلیم نے بھی شکوہ نہیں کیا۔ اس

نے بڑے سلیقے اور طریقے سے میرے پانچوں بچوں کی پرورش کی۔ بچے بڑے ہو گئے، ان کی تعلیمی ضروریات بڑھنے لگیں تو اس نے خود بھی ایک اسکول میں جاب کر لی۔ میرے پانچوں بچے تعلیمی میدان میں بہت اچھے تھے۔ بڑے دونوں بیٹے بہت جلد ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ چلے گئے۔ ان دونوں کی پیدائش وہاں ہوئی تھی اور ان کے پاس نیشنلٹی تھی، وہ ہائی اسکول کے بعد ہی وہاں جا کر کام کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ سب سے بڑے بیٹے نے لندن اسکول آف اکنامکس سے ڈگری حاصل کی، دوسرے نے بھی وہیں سے تعلیم حاصل کی۔ بڑے بیٹے کا تعلیمی ریکارڈ بہت شاندار تھا اس لیے تعلیم کے دوران ہی اسے اقوام متحدہ کی ایک ایجنسی کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل گیا اور بعد میں وہ مستقل طور پر اس کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ خلیق بھی ڈگری حاصل کرنے کے بعد لندن ہی میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرنے لگا۔ بڑی بیٹی ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ان دونوں کے پاس چلی گئی۔ وہاں اس نے سپیشلائزیشن کی۔ چھوٹی بیٹی فزکس میں ایم ایس سی کرنے کے بعد ایک کالج میں پڑھانے لگی۔ سب سے چھوٹا بیٹا نعمان..... ہاں وہ..... پاک فوج میں تھا۔ دو سال پہلے کارگل میں شہید ہو گیا۔



میرا سانس کافی تیز ہو گیا ہے۔ اگر ہوا اتنی ٹھنڈی نہ ہوتی تو اب تک پسینے سے بھیا ہوتا۔

”تیز چلتے ہوئے جب تک پسینہ نہ آئے آپ سمجھیں آپ کو چلنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ یہ سمجھیں آپ نے واک کی ہی نہیں۔“ میرے کانوں میں کسی کی آواز لہرائی۔ آواز نہیں تھی ہدایت تھی، کس کی تھی؟ میں مسکرایا۔

بڑے بیٹے شاید نے لندن میں اپنی مرضی سے اپنی ایک پاکستانی کلاس فیلو سے شادی کی، فائقہ سلمان..... اچھی لڑکی ہے..... طنسار..... مہذب، سمجھدار، خوبصورت، خاندانی..... مگر مادہ پرست۔ ان دونوں کے دو بیٹے ہیں۔ آج کل شاید اور فائقہ چھوٹے بیٹے زبیر کے ساتھ میرے پاس آئے ہیں۔ چند روز رہنے کے لیے۔ شاید مستقل طور پر پاکستان آنے کے لیے تیار نہیں ہوا، میرے سمجھانے کے باوجود بھی۔

”یہاں میرا کوئی فوج نہیں ہے بابا.....! میں بہت آگے جانا چاہتا ہوں۔ یہ ملک ہر لحاظ سے پیچھے ہے۔ کبھی کبھار آنے کے لیے ٹھیک ہے مگر ہمیشہ کے لیے نہیں۔ ویسے بھی فائقہ اسی شرط پر مجھ سے شادی پر تیار ہوئی ہے کہ ہم ہمیشہ باہر ہی رہیں گے۔ امریکہ ہو چاہے

یورپ کا کووی بھی ملک نگر پاکستان نہیں۔ جو معیار زندگی ہم چاہتے ہیں، وہ یہ ملک ہمیں دے ہی نہیں سکتا۔“

میرے بڑے بیٹے کی کئی سال پہلے کی صاف گوئی وہ پہلا جھکا تھا جو مجھے اور سلیمہ کو لگا۔ کئی دن ہم دونوں ایک دوسرے سے نظریں جراتے رہے۔ ہمیں بے یقینی تھی کہ ہمارا بیٹا یہ سب کہہ رہا تھا۔ اس وقت ہمارے تین بچے باہر تھے اور وہ ہمارے ساتھ تھے۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ ان دونوں کو باہر نہیں بھیجیں گے۔ خوش قسمتی سے میرے دونوں چھوٹے بچوں نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔

میری بڑی بیٹی عالیہ کی مگنی میرے ایک کولیک کے بیٹے سے ہو چکی تھی وہ بھی وہیں اگلیڈ میں سپہلا نریشن کے لیے جانے والا تھا اور ہمارا خیال تھا ہم ان دونوں کی جلد ہی شادی کر دیں گے۔ دوسرے بیٹے خلیق سے بات کرنے کے بعد سلیمہ نے اس کی مگنی اپنی بہن کی چھوٹی بیٹی سے کر دی جو ایک کالج میں پڑھا رہی تھی۔ شاید یہ ایک حفاظتی قدم تھا۔ ہمارا خیال تھا یہاں کی لڑکی سے شادی کے بعد وہ مستقل طور پر باہر سیٹل ہونے کا نہیں سوچے گا۔ وہ اسے پاکستان لے آئے گی۔ ایسا نہیں ہوا، صالحہ سے شادی کے کچھ عرصہ کے بعد خلیق نے بھی یہی کہا کہ وہ پاکستان سیٹل ہونا نہیں چاہتا۔ اس بار سلیمہ نے اپنی بہن کے ذریعے اپنی بہو پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی مگر اس کی بہن نے سلیمہ سے کہا۔

”صالحہ پاکستان میں رہنا نہیں چاہتی..... یہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے..... زبردستی ان لوگوں کو واپس بلانے کی کیا ضرورت ہے۔ ان لوگوں نے پاکستان کی خدمت کا ٹھیکہ تو نہیں اٹھا رکھا اور میرا خیال ہے میری بیٹی سمجھدار ہے، وہ بالکل صحیح کہہ رہی ہے۔ اس کے کچھ خواب ہیں..... پاکستان آخر دے کیا سکتا ہے ان دونوں کو..... تم دوبارہ اس سلسلے میں مجھ سے بات نہ کرنا..... وہ دونوں میاں بیوی اپنے مستقبل کے بارے میں زیادہ بہتر طریقے سے سوچ سکتے ہیں۔“

سلیمہ بہن کے گھر سے بالکل خاموشی سے واپس آ گئی۔ اگلے دو ہفتے وہ بیمار رہی۔ اس کا بخار اترنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ میں جانتا تھا یہ بخار نہیں تھا، یہ بے بسی اور شرمندگی تھی۔ اس کا خیال تھا وہ اولاد کی اچھی تربیت نہیں کر پائی۔

صدیقہ ہماری چھوٹی بیٹی ہے۔ اس کی شادی ہم نے اس کی مرضی سے کی۔ اس کا ایک کلاس فیلو اعظم تھا جو فزکس میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد اٹاک انرجی کمیشن کے ساتھ منسلک ہو گیا۔ مالی طور پر وہ کسی بہت امیر کبیر خاندان سے تعلق نہیں رکھتا تھا مگر اچھا لڑکا تھا اور

پھر صدیقہ کو پسند تھا۔ دونوں بہت اچھی زندگی گزار رہے تھے۔

بڑی بیٹی عالیہ بھی کچھ عرصہ باہر رہی پھر عبداللہ کے ساتھ شادی کے بعد واپس پاکستان آ گئی۔

چھوٹے بیٹے نعمان نے بھی اپنی پسند سے شادی کی۔ اس کی بیوی کرن شروع سے اس کے ساتھ اسکول میں پڑھتی رہی۔ دونوں خاندان بہت اچھی طرح ایک دوسرے سے واقف تھے۔

ایف ایس سی کے بعد نعمان آری میں چلا گیا اور پھر جب وہ اکیڈمی سے پاس آؤٹ ہوا تو ہم نے ان کی شادی کر دی۔ آری میں جانا نعمان کی اپنی خواہش تھی۔ باقی بچوں کی طرح ہم نے اسے بھی اپنی مرضی کا پروفیشن چننے کا اختیار دیا اور ہاں میں نے اسے آری جوائن کرتے ہوئے مٹی کی وہ پوٹلی بھی دی تھی۔

وہ فوج میں میجر کے طور پر کام کر رہا تھا جب کارگل کی جنگ شروع ہوئی اور وہ ان آفیسرز میں شامل تھا جنہوں نے کارگل آپریشن کے لیے خود کو رضا کارانہ پیش کیا تھا۔ وہ ان فوجیوں میں شامل تھا جو کارگل کی جنگ شروع ہونے سے بہت پہلے سردیوں کے موسم میں ان پہاڑوں پر قبضہ کرنے گئے تھے جنہیں برف باری شروع ہونے سے پہلے ہر سال انڈین فوج چھوڑ کر چلی جاتی تھی۔

”ہم کشمیر کو ہائی لائٹ کرنے کے علاوہ اور کچھ کرنا نہیں چاہتے۔ ان چوٹیوں پر ہم قبضہ کر سکتے ہیں۔ مگر ہم جب تک وہاں رہیں گے دنیا اس علاقے کو دیکھتی رہے گی۔ اس کے بارے میں بات کرے گی۔ ان لوگوں نے اس علاقے میں کئی بار بارڈر کراس کیا ہے کہ اب یہ خود کو سورا بجھنے لگے ہیں۔ جب ان کا دل چاہے گا، یہ منہ اٹھا کر ادھر گشت کرنے نکل پڑیں گے۔ ایک بار ہم ان کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اب اگلی دفعہ یہ کوشش ان کو کتنی مہنگی پڑے گی۔ میں چاہتا ہوں آپ مجھے دعادیں کہ میں شہید ہو جاؤں۔“

جانے سے ایک رات پہلے نعمان نے مجھے یہ سب کچھ کہا تھا۔

”آپ امی اور کرن کو کچھ مت بتائیں، میں کرن سے صرف یہ کہہ کر جا رہا ہوں کہ ایکسرسائز پر جا رہا ہوں۔ چند ماہ لگ جائیں گے مگر ہو سکتا ہے میں دوبارہ کبھی نہ آسکوں۔ کرن میرے فون کا انتظار کرے گی، مگر آپ کسی نہ کسی بہانے سے اسے ٹالتے رہیے گا۔ کبھی کبھار یہ کہہ دیں کہ آپ نے مجھ سے فون پر بات کی تھی یا اگر وہ گھر سے باہر ہو تو آپ کہہ دیں کہ میں نے فون کیا تھا۔“

عادت تھی، مگر کرن اور اس کے بچوں کے صبر نے ہمیں حیران کیا۔ نعمان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے، جانے سے پہلے وہ انہیں ہمارے پاس ہی چھوڑ کر گیا۔

اسی سال جولائی میں پاکستان کے وزیر اعظم امریکہ جا کر وہ معاہدہ کر آئے جس نے میرے جیسے بہت سے لوگوں کے ذہنوں پر نمک چھڑک دیا۔ کیا ہمارے بیٹوں نے جانیں دیں کہ ان جیسے سیاستدان اپنی کرسیاں بچانے کے لیے اس طرح کے سودے کرتے پھریں۔ میں کئی دن بھی سوچ کر روتا رہا، مگر کیا اس سب کے بعد پاکستان چھوڑ کر چلا جاتا۔ میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید یہی کرتا۔ میں نے یہ نہیں کیا، کرن اپنی دونوں بیٹیوں اور بیٹے کے ساتھ ہمارے ساتھ رہ رہی ہے۔ وہ اب ایک اسکول میں پڑھاتی ہے۔ اس کا بڑا بیٹا حیدر آٹھ سال کا ہے، ایک بیٹی چھ سال کی اور ایک چار سال کی۔ حیدر ہر وقت مجھے ہدایات دیتا رہتا ہے، کبھی کبھار وہ صبح میرے ساتھ واک پر آتا ہے اور اس وقت اسے میری چال پر اعتراض رہتا ہے۔

”تیز چلتے ہوئے جب تک پسینہ نہ آئے آپ سمجھیں چلنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہوا بلکہ یہ سمجھیں کہ آپ نے واک کی ہی نہیں۔ دادو تیز چلیں..... میری طرح کو نیک..... اسی لیے تو آپ فٹ نہیں رہتے..... دادو کو نیک.....“

وہ میرے آگے آگے چلا بولتا رہتا ہے، میں اس کے ساتھ قدم ملانے کی پوری کوشش کرتا ہوں مگر تھک جاتا ہوں۔ دانستہ..... وہ میرا مستقبل ہے، میرے پاکستان کا مستقبل..... اپنے مستقبل کو کون ہرانا چاہے گا۔

چند دن پہلے وہ میرے پاس ایک پیکٹ لے کر آیا۔ ”آپ کو ایک چیز دکھاؤں دادو؟“ اس نے آ کر کہا۔ میں نے اخبار تہہ کر دیا۔

”ہاں دکھاؤ.....“ برق رفتاری سے اس نے پیکٹ کھولا اور اس کے اندر موجود چیز میرے سامنے کر دی۔ میرا سانس رک گیا۔ وہ پوٹلی نسلوں کا سفر کتنی آسانی سے طے کر رہی تھی۔ میں نے ہونٹ بھیجنے ہوئے اسے ہاتھ میں اٹھالیا۔

”یہ تمہیں کہاں سے ملی؟“ میں نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”پاپا نے دی تھی جب وہ کارگل جا رہے تھے، انہوں نے کہا تھا یہ گنٹ ہے.....“

اپنے دادا سے پوچھنا یہ کیا ہے؟ دادو یہ کیا ہے؟.....“

میں نے حیدر کو گود میں لے لیا۔

میں نے گھڑی دیکھی اور واپس مڑ گیا۔ اب مجھے واپسی کا فاصلہ طے کرنا تھا اسی

میں اسے شہادت کی دعا نہیں دے سکا۔ میں اتنا بہادر باپ نہیں تھا مگر میں نے اسے کامیابی کی عداوی..... بعد میں مجھے احساس ہوا شہادت ہی اس کی کامیابی تھی۔

اگلے کئی ماہ گھر سے اس کا رابطہ منقطع رہا اور میں اسی طرح کرن کو بہلاتا رہا۔ سردیاں ختم ہونے کے بعد انڈین آرمی نے دوبارہ ان مورچوں کی طرف جانے کی کوشش کی جن کو وہ سردیوں میں خالی کر آئے تھے اور تب انہیں احساس ہوا کہ وہ مورچے خالی نہیں تھے وہاں پر کچھ لوگ موجود تھے۔ ان کے الزامات ٹھیک تھے، یہ مجاہدین نہیں ہو سکتے تھے۔ ہزاروں فٹ اونچی برف کی بخر چوٹیوں کو اسلحے سمیت سردیوں میں سر کرنے والے غیر تربیت یافتہ مجاہدین کیسے ہو سکتے تھے۔ ہندوستان کی چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ ٹی وی چینلوں اور اخبارات نے طوفان اٹھا دیا اور پھر ایک دن میری بہو کرن نے مجھ سے پوچھا۔

”ابو! نعمان کارگل میں ہے نا؟“ میں بول نہیں سکا۔

اس نے دوبارہ کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ اٹھ کر چلی گئی۔ فوجیوں کی بیویاں سوالات کرنے کی عادی نہیں ہوتیں یا کم از کم اس طرح کے سوالات۔

”اگر ہندوستان 71ء میں کئی ماہی کے روپ میں اپنی فوج کے ٹرینڈ گوریلے مشرقی پاکستان بھیج سکتا ہے، اگر وہ 80ء کے عشرے میں سری لنکا میں لبریشن ٹائیگرز آف تامل ایلام کے لوگوں کے ساتھ لڑنے کے لیے اپنی فوج کا اسلحہ اور فوجی بھیج سکتا ہے تو پھر پاکستان بھی مجاہدین کے روپ میں اپنے فوجیوں کو بھیج سکتا ہے۔ کینے اور مکار دشمن سے کمیونگی اور مکاری کے ساتھ ہی پنپا جا سکتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ نعمان وہاں لڑ رہا ہے اور جن لوگوں کے لیے لڑ رہا ہے وہ میرے ملک کا ایک حصہ ہیں۔ لندن میں بیٹھ کر پاؤنڈرز سے اکاؤنٹ بھرنے والے تمہارے اور تمہارے شوہر جیسے مادہ پرست اس چیز سے واقف ہو ہی نہیں سکتے۔“

کارگل کی جنگ باقاعدہ شروع ہوتے ہی شاہد اور اس کی بیوی فائقہ نے بھی لندن سے ہمیں فون کیا تھا۔ انہیں نعمان کے بارے میں پتا چل چکا تھا۔ فائقہ نے بات کرتے ہوئے پاکستانی حکومت اور آرمی پر تنقید کی کہ وہ جان بوجھ کر اپنے ریگولرز کو ایک غلط کام کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور میں..... میں..... اپنا غصہ ضبط نہیں کر سکا۔ وہ میری باتیں سن کر خاموش ہو گئی۔

جون کے مہینے میں کارگل کے پہاڑوں سے نعمان کی شہادت کی خبر مل گئی۔ صرف خبر، لاش نہیں.....! پہاڑ لاشیں واپس نہیں کیا کرتے۔ وہ وہیں کہیں برف میں دفن ہے یا پھر شاید کسی کھائی میں.....! میں نے اور سلیمہ نے صبر کیا۔ ہمارے لیے یہ کام آسان تھا، ہمیں

سڑک پر۔

آج کل شاہد اور فائقہ اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ میرے پاس آئے ہوئے ہیں۔ کل چودہ اگست کو سارا دن ٹی وی آن رہا، رات کو شاہد مجھ سے کہنے لگا۔

”میں سوچتا ہوں اب! بڑھا پا پاکستان میں ہی گزاروں۔ ساٹھ ستر سال عمر میں یہاں آ جاؤں گا۔ انسان کو فن اپنی مٹی میں ہی ہونا چاہئے۔ ہے نا.....؟“

وہ مجھ سے اپنی ”حب الوطنی“ کی داد چاہ رہا تھا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا اور کہا۔

”پاکستان کو تمہاری قبروں اور تابوتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ پاکستان کو تمہاری جوانی اور وہ گرم خون چاہئے جو تمہاری رگوں میں خواب اور آئیڈیلزم بن کر دوڑتا ہے۔ اگر

پاکستان کو اپنی جوانی نہیں دے سکتے تو اپنا بڑھا پا بھی مت دو..... جس ملک میں تم جینا نہیں چاہتے وہاں مرنا کیوں چاہتے ہو..... باہر کی مٹی کی گھنڈک مرنے سے بعد برداشت نہیں ہوگی

تب اپنی مٹی کی گرمی چاہئے؟ نہیں شاہد جمال آپ وہیں رہیں جہاں آپ رہ رہے ہیں۔ ہر شخص کے مقدر میں باطن ہونا نہیں لکھا ہوتا۔ بعض کے مقدر میں جلا وطنی ہوتی ہے، اپنی خوشی سے اختیار کی جانے والی جلا وطنی۔“ وہ میری بات پر خاموش ہو گیا تھا۔

شاید اس نے سوچا ہو گا میں پچھلی صدی کا آئیڈیلزم کا شکار ایک بوڑھا شخص، اس جدید ترقی یافتہ دور اور ملک کے نشے سے کیسے واقف ہو سکتا ہوں جہاں وہ رہتا ہے۔ تیس سال

گزرنے کے بعد جب وہ میری طرح اس ملک میں رہنے کے لیے آئے گا تو اسے احساس ہو گا، زندگی میں بعض دفعہ جان بوجھ کر آہستہ چلنے میں مزہ آتا ہے۔ بعض دفعہ ریس میں حصہ نہ

لے کر بھی آپ اسی کا حصہ رہتے ہیں۔ پھر میری طرح اس سڑک پر واک کرتے ہوئے وہ لوگوں کے چہرے اور چیزیں دیکھے گا مگر اس کے پاس سوچنے کے لیے مٹی کی وہ پوٹی نہیں ہوگی

نہ اس سے وابستہ یادیں۔ اس کے پاس پاؤنڈز اور ڈالرز کے وہ لمبے چوڑے اکاؤنٹ ہوں گے..... صرف اکاؤنٹ.....!

میں اب سڑک پر تیز رفتاری کے ساتھ واپس جا رہا ہوں، واپسی کا سفر میں ہمیشہ تیزی سے کرتا ہوں۔ واپسی کا سفر ہر ایک ہی تیزی سے کرتا ہے۔ بعض دفعہ یہ سڑک مجھے

پاکستان لگتی ہے اور ہر روز صبح ایک گھنٹہ کی یہ واک اپنی زندگی کے اڑھنٹھ سال، پچھلے 54 سال میں نے اس ملک میں گزارے ہیں۔ میرے حصے میں یہاں سب کچھ آیا، اس مٹی نے مجھے

خواب دیکھنا سکھایا..... پھر اس کی تعبیر دی۔ میں نے اس مٹی کو ہر بار وہ دیا جو اس نے مجھ سے مانگا۔ روپے کی دفعہ روپیہ، وقت کی دفعہ وقت، اور خون کی دفعہ خون..... اور مجھے یہ ملک کبھی

خالی نہیں لگا۔

مجھے کبھی اس چھوٹے، ترقی پذیر، گندے، ٹوٹی سڑکوں والے ملک کا شہری ہونے پر شرمندگی نہیں ہوئی۔ شاید اس وجہ سے کیونکہ میں نے کبھی اس کے مسائل میں اضافہ نہیں کیا۔ میں

نے ہمیشہ اسے اپنے پاس موجود سب سے بہترین شے دی۔ آپ میں سے کوئی بھی اس چیز کو نہیں سمجھ سکتا۔ آج آپ سے آپ کا گھر چھین لیا جائے اور پھر آپ لڑتے جھگڑتے میری طرح خون

دے کر اس گھر کو واپس لیں تو پھر آپ کو وہ ٹوٹا پھوٹا، گندا گھر جنت سے کم نہیں لگے گا۔ تب آپ کسی کو اس کی دیوار پر ہاتھ تک نہیں رکھنے دیں گے، کہاں یہ کہ کسی کو اندر آنے دیں۔

میں نے اپنے ڈرائنگ روم میں وہ میڈل رکھا ہوا ہے جو نعمان کی شہادت کے بعد دیا گیا تھا۔ شاید یہ میرے وطن کی طرف سے میری ان خدمات کا اعتراف ہے جو میں نے.....

ہر سال پندرہ اگست میں اسی طرح اپنے ماضی کے بارے میں سوچتا ہوں۔ اسی سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کی وہی باتیں سنتے ہوئے۔

”اس ملک میں کچھ نہیں ہے..... ہم نے کینیڈا کی امیگریشن کے لیے اپلائی کیا ہوا ہے۔“

”Across the borders we are one“

مجھے اس سب کے باوجود یہیں رہنا ہے۔ یہیں جینا ہے..... یہیں مرنا ہے۔

”کیا آپ میری طرح قربانی دے کر یہاں جینا اور مرنا سیکھ سکتے ہیں۔“



اے مخاطب کو دیکھا تھا جو اب اس کے پاس آ گیا تھا۔ ناگواری کی ایک لہری اس کے اندر تھی مگر اس کے قدموں کی رفتار اب کافی آہستہ ہو گئی تھی۔ وہ لڑکی اب بغیر کسی مشکل کے اس کے برابر چل رہی تھی۔

”یہ فارم کتنے کا آتا ہے؟“ یہ پوچھا جانے والا پہلے سوال تھا۔

”پتا نہیں۔“ اس نے اسے بغیر دیکھے جواب دیا۔

”یہ فارم ملتا کہاں سے ہے؟“ ایک اور سوال پوچھا گیا تھا۔

جواب اب بھی اسی بے نیازی سے دیا گیا تھا۔ ”آفس سے“

تیسرا سوال بھی بڑے فرائٹ سے کیا گیا تھا۔ ”آفس کہاں ہے؟“

”ہم وہیں جا رہے ہیں۔“ اس نے اب بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر جواب

دیا تھا۔ پھر سوالوں کی ایک بوجھاؤ شروع ہو گئی تھی۔

”آفس کیا زیادہ دور ہے؟“

”پتا نہیں، میں نے کبھی فاصلہ ناپا نہیں۔“

”کہیں اور سے فارم نہیں ملتا؟“

”ملتا ہوگا۔“

”تو وہاں سے کیوں نہ لے لیں؟“

”اگر آپ کو ایسی جگہ کا علم ہے تو ضرور لے لیں۔“ اس بار اس کے لہجے میں خشکی نمایاں

تھی مگر سوال پوچھنے والی ذرا متاثر نہیں ہوئی۔ سوالوں کا یہ سلسلہ پھر وہیں سے جوڑ دیا گیا تھا۔

”آفس سے فارم مل جائے گا نا؟“

”اگر ہوگا تو ضرور مل جائے گا۔“

”اور اگر نہ ملتا تو؟“

”تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”اگر فارم نہ ملتا تو میں ایڈمیشن کے لئے کیسے اپلائی کروں گی؟“ اب لہجے میں

تشویش شامل ہو چکی تھی۔

”مجھے نہیں پتا۔“ وہ اس کے سوالوں سے عاجز آ چکا تھا۔

”جن لوگوں کو فارم نہیں ملتا، وہ کیا کرتے ہیں؟“

”صبر۔“ اس مختصر جواب نے کچھ لحوں کے لئے اس پر خاموشی طاری کر دی تھی۔

”آپ یہاں پڑھتے ہیں؟“ کچھ دیر کے بعد سوالات دوبارہ شروع ہو گئے تھے۔

تیری یاد خارِ گلاب ہے

”سنیں!“ وہ گاڑی لاک کر رہا تھا جب ایک آواز نے اچانک اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ سفید چادر میں ملبوس ایک حواس باختہ سی لڑکی اس کے پاس کھڑی تھی۔

”مجھے ایک فارم لادیں۔“ اس کے مڑتے ہی اس نے التجائیہ انداز میں کہا تھا۔

کوئی شناسا چہرہ ہوتا تو اڈل تو وہ کبھی بھی اس سے مدد مانگنے کی حماقت نہ کرتا اور اگر

کرتا بھی تو وہ بڑی رکھائی سے اسے اپنی مدد آپ کی تلقین کرتا۔ وہ مزاجاً کچھ ایسا ہی بے

مروت اور بے لحاظ واقع ہوا تھا۔ ایک تیکسی سی نظر اس نے اس لڑکی کے چہرے پر ڈالی تھی۔

”آپ کے ساتھ کوئی نہیں ہے؟“ بڑے بے تاثر انداز میں اس نے پوچھا تھا۔

”نہیں میں اکیلی آئی ہوں۔“ وہ ہاتھ میں پکڑے رومال سے اپنے ماتھے پر آیا ہوا

پینہ خشک کرتے ہوئے بولی تھی۔

”ایڈمیشن فارم چاہئے آپ کو؟“

”ہاں وہی چاہیے۔“ وہ چند لمحے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کچھ اندازہ لگانے

کی کوشش کرتا رہا۔ پھر بادلِ خواستہ اس نے قدم بڑھا دیئے۔

”آئیں میرے ساتھ۔“ اس لڑکی نے فوراً اس کی بیروی کی تھی مگر اس کے پیچھے

پیچھے چلنے کے بجائے وہ اس کے برابر چلنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر چند منٹوں تک اس کوشش

میں مصروف رہنے کے بعد بھی جب وہ اس کے تیز قدموں کا مقابلہ نہیں کر پائی تو وہ یک دم

رک گئی۔

”پلیز ٹھہر جائیں نا۔ آپ تو بہت تیز چلتے ہیں۔“

اس کی آواز پر اس کے قدم بے اختیار رک گئے تھے۔ بڑی حیرانی سے اس نے

”ہاں۔“

اگلا سوال حماقت سے بھر پور تھا۔ ”آپ کو ایڈمیشن مل گیا تھا؟“

”اگر میں یہاں پڑھتا ہوں تو اس کا سیدھا سیدھا مطلب یہی ہے کہ مجھے ایڈمیشن

مل گیا تھا۔“

”نہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کو ایڈمیشن فارم کے ذریعے ایڈمیشن ملا تھا؟“

”ہاں۔“

اگلا سوال پھر احمقانہ تھا۔ ”آپ کو ایڈمیشن فارم مل گیا تھا؟“

اس نے صبر و ضبط کے ریکارڈ توڑتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“

”کہاں سے ملا تھا؟“

”آفس سے۔“

”جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں سے؟“

”جی وہیں سے۔“

”مجھے بھی مل جائے گا نا؟“ اس بار سوال التجائیہ تھا۔

”دعا کریں۔“

اس نے کہا تھا۔ بہت اچانک اسے احساس ہونا شروع ہو گیا تھا کہ وہ لڑکی احمق

نہیں نروس ہے اور جو وہ پوچھنا چاہ رہی ہے، وہ مناسب طریقے سے پوچھ نہیں پاری۔ اب وہ شاید دعا میں مصروف ہو چکی تھی کیونکہ باقی راستہ وہ خاموش رہی تھی۔

”وہ آفس ہے اور وہ دنڈو ہے۔ اس لائن میں کھڑی ہو جائیں جن میں پہلے کچھ

لڑکیاں کھڑی ہیں۔ وہاں سے آپ کو فارم مل جائے گا۔“

آفس نظر آتے ہی اس نے رکتے ہوئے اس لڑکی کو ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا

تھا مگر وہ یک دم بک گئی تھی۔

”میں کیسے لے آؤں۔ اتنے لوگ ہیں وہاں۔ آپ لا کر دیں۔“

وہ اس کی فرمائش نما مطالبے پر حیران رہ گیا تھا۔ ایک نظر اس نے اپنی رسٹ و ایج

پروڈرانی کلاس شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا۔

”ٹھیک ہے، آپ یہاں رکھیں، میں آپ کو فارم لا کر دیتا ہوں۔“

وہ اسے وہیں رکنے کا کہہ کر آفس کی طرف بڑھ گیا اب وہ جلد از جلد اس مفت کی

خدمت سے نجات حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ کھڑکی پر لگی ہوئی نظاروں میں کھڑا ہونے کی بجائے

وہ آفس کے اندر گیا تھا اور اپنے ایک شناسا کلرک سے فارم لے کر چند منٹوں میں باہر آ گیا

تھا۔ وہ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا فارم دیکھ کر بے تحاشا خوش ہو گئی تھی۔

”یہ لیس فارم۔“ اس نے بڑی عقیدت سے فارم لیا تھا۔

”یہ کتنے روپے کا ہے؟“ اس لڑکی نے پرس کھولتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”نیو ما سٹڈ۔“ وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ وہ اس کے پیچھے آئی تھی۔

”پلیز بتائیں ناں۔ کتنے کا ہے؟“

”یہ فارم فری ملتا ہے۔“ اس نے جھوٹ بولا تھا۔

وہ چند روپے اس سے نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔ پھر

فارم کو فائل میں رکھنے لگی۔ اس نے دوبارہ چلنا شروع کر دیا وہ لڑکی پھر اس کے پیچھے آئی تھی۔

اس بار وہ جھنجھلا کر رکا تھا۔

”بس اب میں جا رہی ہوں۔“ وہ اس بار پہلی دفعہ اس کے تیوروں سے گڑ بڑائی تھی۔

”یہ فارم فل کر کے آفس میں جمع کروائیں۔“ اسے اس کی حماقت پر اب افسوس

ہونے لگا تھا۔

”ابھی جمع کروادوں؟“ وہ بے تحاشا حیران ہوئی تھی۔

”جی ابھی جمع کروائیں۔ کل آخری تاریخ ہے اور بہت رش ہوگا۔ ڈاکومنٹس ہیں

ناں آپ کے پاس۔“

اس نے پہلی بار بڑے تحمل سے اس سے پوچھا تھا اور یہ پوچھنا اسے مہنگا پڑا۔ اس

لڑکی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی فائل سے کچھ پیپر نکال کر اسے تھما دیئے۔

”ہاں ڈاکومنٹس تو میرے پاس ہیں۔“

”لیکن میں انہیں کیا کروں؟“

اس نے ہکا بکا ہو کر اس سے پوچھا تھا۔ اس دفعہ فارم بھی اسے تھما دیا گیا تھا۔

”آپ اسے فل کر دیں میں نے کبھی فارم فل نہیں کیا۔ بابا کرتے ہیں ہمیشہ۔ مجھ

سے بہت غلطیاں ہوتی ہیں۔“

پہلی بار اس نے اپنے بنائے ہوئے اصول توڑتے ہوئے کسی کی مدد کرنے کی

کوشش کی تھی اور پہلی دفعہ ہی یہ مدد اس کے گلے میں کانٹے کی طرح انگ گئی تھی۔ وہ لڑکی بلا

کی کام چور لگ رہی تھی اس وقت اسے ہونٹ بھیج کر وہ ڈاکومنٹس اور فارم لے کر برآمدے

میں بیٹھ گیا اور بے حد سنجیدگی کے ساتھ اسے قل کرنے لگا۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ وہ کسی دوسرے کا فارم اس طرح قل کر رہا تھا اور وہ بھی ایک لڑکی کا۔ باری باری ڈاکومنٹس سے کوائف اتارے ہوئے وہ ایک ایک ڈاکومنٹ اس کی طرف بڑھاتا گیا بے حد مختصر وقت میں اس نے فارم قل کیا تھا۔ پھر فارم اسے دینے کے بجائے وہ آفس کی طرف خود چلا گیا تھا۔ جو کام اسے بعد میں بھی خود ہی کرنا تھا۔ وہ پہلے ہی کیوں نہ خود کر دیتا۔ آفس سے باہر آتے ہی اس نے اس لڑکی کو منتظر پایا تھا۔

”اب آپ جائیں، میں کو آ کر لسٹ میں اپنا نام دیکھ لیجئے گا۔“

اس بار وہ رکائیں۔ بے حد تیز قدموں کے ساتھ وہ اپنے ڈاکومنٹ کی طرف آ گیا تھا۔ اس واقعہ کو ایک ہفتہ گزرا تھا جب اس روز وہ موہد کے ساتھ کسی کام کے لئے آفس کی طرف گیا تھا۔ وہ آفس سے ابھی کافی دور تھا جب اس نے اسی لڑکی کو آفس سے کچھ فاصلے پر ایک ستون کے پاس کھڑی دیکھا تھا۔ ایک ہی نظر میں وہ اسے پہچان گیا تھا اور اس پہچان کے ساتھ ہی اسے اس دن کی روداد یاد آ گئی تھی۔ وقتاً فوقتاً اس پر نظر دوڑاتے وہ اپنے دوست کے ساتھ باتیں کرتا آفس کی طرف بڑھتا گیا۔ آفس کے ارد گرد اس وقت کافی رش تھا ایڈمشن پانے والے فیس جمع کروانے کے لئے قطاروں میں کھڑے تھے۔ اسی وقت اس لڑکی کی نظر اس پر پڑی تھی اور وہ بہت تیزی سے اس کی طرف آئی تھی۔ اس نے اسے اپنی جانب آتے دیکھ لیا تھا۔

”Oh not again“ (وہ اب پھر نہیں) وہ بے اختیار بڑبڑایا تھا۔

”یہ لیس۔ میری فیس، جمع کروادیں۔“

کمال بے تکلفی سے اس نے پاس آتے ہی اس کی طرف فارم اور روپے بڑھا دیئے تھے۔ موہد اور اس کے درمیان بڑی سنجیدگی سے نظروں کا تبادلہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ موہد انکار کرتا اسے حیرت کا ایک شدید جھکا لگا تھا جب اس نے کومیل کو بڑی خاموشی سے اس لڑکی سے روپے پکڑتے دیکھا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ کومیل کے ساتھ آگے بڑھ آیا تھا۔

”تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟“ چند قدم چلنے کے بعد موہد نے اس سے پوچھا تھا۔

”No“ (نہیں) جواب بالکل مختصر تھا۔

”محترمہ خاصی اجتناب ہے۔“ موہد نے تبصرہ کیا تھا۔

”اس میں کیا شبہ ہے۔“ اس نے خاصی لاپرواہی سے کہا تھا۔

”بغیر واقفیت کے ہمیں فیس جمع کروانے کا فریضہ سونپ دیا ہے اور اگر ہم ان

روپوں کے ساتھ فرار ہو جائیں یا فیس جمع کروائیں ہیں ناں تو؟“ موہد نے ایک لمحہ کے لئے پیچھے مڑ کر گہری نظروں سے اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

کومیل اس بار خاموش رہا تھا۔ آفس میں فیس جمع کروانے کے بعد جب وہ اس جگہ آئے تھے جہاں اس لڑکی نے روپے انہیں تھمائے تھے تو وہ لڑکی وہاں سے غائب تھی۔ وہ کچھ دیر تک وہاں کھڑے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھتے رہے مگر وہ کہیں نظر نہیں آئی۔

”So what next“ موہد نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔

”اب اس رول نمبر سلپ کو کیا کرنا ہے اور وہ محترمہ تو شاید جا چکی ہیں۔ یہ سوچتے ہوئے کہ ان کا کام ختم ہوا اور میں حیران ہوں کہ اس رول نمبر سلپ کے بغیر یہ کلاس میں اپنا نام اور رول نمبر کیسے رجسٹر کروائیں گی۔ اتنا تو پتا ہونا چاہئے انہیں کہ فیس کی رسید لینی ہے یا رول نمبر سلپ لینی ہے اور یہ محترمہ کرنا چاہ رہی ہیں ایم اے انگلش۔“

موہد نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے تاگواری سے ایک طویل تبصرہ کیا تھا۔

کومیل اب بھی بغیر کچھ کہے بڑے تحمل سے ادھر ادھر نظر دوڑا رہا تھا۔ آدھ گھنٹہ تک وہ وہیں اس کے انتظار میں کھڑے رہے۔ پھر وہ وہاں سے آگئے تھے۔

وہ کافی خوشی اور جوش کے عالم میں اندر داخل ہوئی تھی۔ ”کیوں ثانیہ جمع کروا آئی ہو فیس؟“ خالہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا تھا۔

”ہاں خالہ! جمع کروا آئی ہوں۔“ اس نے اپنی چادر اتارتے ہوئے جواب دیا تھا۔

عالیہ اس کے پاس چلی آئی۔ ”یونیورسٹی جانا کب سے شروع کریں گی آپنی؟“ اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

”تین تاریخ سے۔“ ثانیہ نے مسکراتے ہوئے بڑے فخریہ انداز میں اپنی کزن کو بتایا تھا۔

”آپ کو ڈرنہیں لگے اتنے لڑکوں کے ساتھ پڑھتے؟“ عالیہ اب اس کے پاس بیٹھ پر بیٹھ گئی تھی۔

”ڈرنے والی کون سی بات ہے آخر اور لڑکیاں بھی تو پڑھتی ہیں۔“ ثانیہ نے اس سے زیادہ جیسے خود کو تسلی دی تھی۔

”ہاں، آپ تو ویسے بھی بہت بہادر ہیں اسی لئے تو خالو نے اکیلے لاہور پڑھنے کے لئے بھیج دیا۔“

اس کی کزن پر اس کی ”جو اس مردی“ کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور اس میں ثانیہ کا

کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ بات ایسے ہی کرتی تھی جیسے وہ بہت دلیر اور نڈر تھی لیکن یہ گفتگو دوسروں کے لئے کم اور اپنے لئے زیادہ ہوتی تھی۔ وہ لاشعوری طور پر خود کو ایسی باتوں سے بہلایا کرتی تھی۔ ورنہ وہ جس قدر احمق، کمزور اور حواس باختہ ہو جاتی تھی وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ اس میں غلطی اس کی بھی نہیں تھی۔ ساری عمر سرگودھا شہر میں رسوم و رواجوں کی بھاری زنجیروں میں گزارنے کے بعد اب ایک دم وہ لاہور گیا آگئی تھی اسے یوں لگنے لگا تھا جیسے وہ نیو یارک پہنچ گئی تھی۔

مراد علی کی پانچ بیٹیاں تھیں اور ثانیہ سب سے بڑی تھی۔ ان کے لئے وہ بچی بھی تھی اور بیٹا بھی۔ تعلیم کا انہیں خود بھی بہت شوق رہا تھا مگر باپ کے جلد انتقال کی وجہ سے انہیں بہت جلد اپنی زمینوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا، وہ کوئی بہت بڑے زمیندار نہیں تھے کہ جو سارا انتظام نوکروں کے سر پر چھوڑ کر خود تعلیم سے تعلیم حاصل کرتے رہتے۔ وہ تو بہت چھوٹے زمیندار تھے جنہیں سارے انتظامات خود ہی سنبھالنے اور کرنے پڑتے تھے۔ اس لئے بھاری دل سے انہوں نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ ماں باپ کے اگوتے بیٹے تھے اور باپ کے مرنے کے بعد سر پر تین بہنوں کا بوجھ بھی آن پڑا تھا۔ سو جب تک وہ لہن کی ذمہ داری سے عہدہ برا ہوئے تب تک وہ کافی عمر کے ہو چکے تھے اور ان کی مالی حالت بھی پہلے جیسی نہیں رہی تھی، سو انہوں نے اپنی اولاد کو تعلیم دلوانے کے خواب دیکھنا شروع کر دیئے۔

قسمت یہاں بھی ان پر زیادہ مہربان نہیں رہی۔ بیٹے کی خواہش میں یکے بعد دیگرے پانچ بیٹیاں انکے آنگن میں آگئیں تو انہوں نے اللہ کی رضا پر تسلیم خم کر دیا۔

”کوئی بات نہیں بیٹیاں ہیں تو کیا ہے میں انہیں ہی پڑھاؤں گا۔“

وہ کئی بار اپنی بیوی سے کہتے۔ ایک ایسا خاندان جہاں لڑکیاں سات پردوں میں رہا کرتی تھیں۔ وہاں مراد علی کے عزائم سب کو احمقانہ نظر آئے مگر وہ اپنے ارادے پر ڈٹے رہے۔ پردے میں رکھتے ہوئے انہوں نے بیٹیوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے کالج بھیجنا شروع کر دیا تھا اور پھر یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا جب ثانیہ نے گریجویشن کر لی تو مراد علی نے اسے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ دلوانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ لاہور میں ثانیہ کی خالہ کا گھر تھا۔ اس لئے انہیں وہاں اس کی رہائش اس کوئی مسئلہ نظر نہیں آیا۔ مگر جن دنوں پنجاب یونیورسٹی میں ایڈمیشن شروع ہوئے تھے، ان ہی دنوں انہیں کچھ ضروری معاملات کے سلسلے میں راولپنڈی جانا پڑا۔ وہ ثانیہ کو اس کی خالہ کے گھر چھوڑ گئے۔

ثانیہ کی خالہ شہدہ میں ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھیں، ان کی دو بیٹیاں اور

ایک بیٹا تھا، جو سب سے بڑا تھا اور اب باپ کے ساتھ میڈیکل اسٹور سنبھالتا تھا۔ بڑی بیٹی فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی اور چھوٹی میٹرک میں، ثانیہ کی آمد سے سب ہی بہت خوش تھے پھر وہ مرحوب بھی تھے کیونکہ وہ خاندان کی پہلی لڑکی تھی جو اس طرح ایم اے کرنے کے لئے دوسرے شہر میں آئی تھی۔ خالہ نے یونیورسٹی کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا مگر ثانیہ نے یوں ظاہر کیا تھا جیسے وہ پہلی بار نہیں بار بار یونیورسٹی آئی جاتی رہی تھی۔ یہ ظاہر کرنا اس کی مجبوری تھی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی کسی جھجک اور گھبراہٹ کو دیکھ کر وہ یونیورسٹی کو کوئی معیوب جگہ سمجھیں یا اسے تعلیم سے متنفر کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ بہر حال اسے اب دو سال کے لئے انہیں کے ساتھ رہنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایڈمیشن کے لئے اپلائی کرنے کے لئے جانے کے لئے اس نے نہ تو اپنی کسی کزن کو ساتھ لیا تھا اور نہ ہی احمد سے کوئی مدد مانگی تھی جو اسے صبح اپنے موٹر سائیکل پر یونیورسٹی چھوڑ گیا تھا۔ ثانیہ کو احمد سے زیادہ مدد مانگی بھی نہیں مل سکتی تھی کیونکہ وہ خود بھی پہلی بار ہی یونیورسٹی کی طرف آیا تھا۔ وہ ایف اے کے بعد ہی تعلیم کو خیر باد کہہ چکا تھا۔

سو اس نے سوچا تھا کہ ایک بار یونیورسٹی پہنچنے کے بعد وہ خود ہی آفس ڈھونڈ کر اپنا کام کر لے گی۔ مگر یونیورسٹی کوئی چھوٹا اسکول یا کالج نہیں تھا۔ وہ وہاں داخل ہوتے ہی جگہ جگہ لڑکوں کے گروپ کھڑے دیکھ کر بے تماشاً گھبرا گئی تھی۔ اسے دور دور تک کسی آفس کا نام و نشان نظر نہیں آیا تھا اور وہ آگے جانے کے بجائے ایک جگہ کھڑی ہو گئی تھی۔ اتنی ہمت اس میں بہر حال نہیں تھی کہ وہ لڑکوں کے کسی گروپ کے پاس جا کر مدد مانگے اور پھر اچانک اسے کومیل نظر آیا تھا، جب وہ بے چینی کے عالم میں پارکنگ کی طرف آئی تھی۔ اسے شکل سے وہ شریف لگا اور اسے یہ بہت بڑی خوش فہمی رہتی تھی کہ وہ بہت اچھی چہرہ شناس ہے۔ سو اسے اس اکیلے لڑکے سے مدد مانگنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوا اور پھر کومیل کے طور طریقے ایسے تھے کہ اسے اس کی شرافت پر اور بھی یقین آتا گیا۔

وہ دوسرے لڑکوں کی طرح اسے دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس نے اس پر صرف ایک دو نظریں ڈالی تھیں۔ وہ بھی تب جب وہ اس سے مدد مانگ رہی تھی۔ اس کے بعد جتنی دیر وہ اس کے ساتھ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھے بغیر ہی اس کی باتوں کا جواب دیتا رہا ثانیہ کو اس کے قریب رہ کر بہت تحفظ کا احساس ہوتا رہا تھا۔

چند لمحوں پہلے تک لڑکوں کی موجودگی اور نظروں سے پیدا ہونے والا خوف اب اس کے لئے اتنا جان لیوا نہیں تھا۔ گھر آ کر اس نے یوں ظاہر کیا تھا جیسے اس نے کسی کی مدد کے

بغیر ہی آفس ڈھونڈ لیا تھا۔ وہ یہ بتانا قطعاً فوراً نہیں کر سکتی تھی کہ اس نے کسی لڑکے سے مدد لی تھی۔ پھر جس دن لٹینس لگی تھیں۔ اس دن وہ خود نہیں گئی تھی بلکہ اس نے احمد سے کہا تھا کہ وہ اس کا نام دیکھ آئے، اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنا نام دیکھنے جاتی۔ نام نظر آتا یا نہ آتا، دونوں صورتوں میں اس نے وہاں رونا شروع ہو جانا تھا۔ یہ داخلہ اس کے لئے ایسا ہی نازک اور حساس معاملہ تھا۔

وہ بے تحاشا دعائیں مانگتی رہی تھی اور پھر احمد نے جب گھر آ کر اسے داخلے کے بارے میں بتایا تو وہ فوراً نفل پڑھنے بیٹھ گئی تھی۔

احمد اس کے لئے یونیورسٹی سے فیس فارم بھی لے آیا تھا۔ اب وہ ایک بار پھر یونیورسٹی میں اکیلی فیس جمع کروانے چل پڑی تھی مگر وہاں اس قدر رش تھا کہ اس کی ساری ہمت ہی ٹوٹ گئی تھی۔ لمبی قطاروں میں کھڑے ہونے کے بجائے وہ ایک طرف کھڑی ہو کر تشویش کے عالم میں اسے مجھے کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ جب رش کچھ کم ہو جائے گا تو وہ بھی کسی قطار میں کھڑی ہو جائے گی مگر یہ بات اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی کہ وقتاً فوقتاً جو لوگ وہاں آ کر قطار میں شامل ہو رہے ہیں وہ قطار کی لمبائی کو مقررہ وقت تک تو کبھی بھی کم نہیں ہونے دیں گے۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسی وقت اس نے کوئیل کو دیکھ لیا تھا۔ ایک ہی نظر میں وہ اسے پہچان گئی تھی اور بے تحاشا جوش میں وہ تیر کی طرح اس کی طرف گئی تھی۔

بڑے اطمینان سے اسے فارم اور فیس پکڑانے کے بعد وہ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد آرام سے واپس گھر آ گئی تھی اس نے یہ سوچنے کی قطعاً زحمت نہیں کی کہ اسے رول نمبر سلسلے یا فیس کی رسید لینا چاہئے۔ اس نے سوچا تھا کہ جیسے پہلی دفعہ اس نے بس فارم جمع کروایا تھا اور پھر اسے جانے کے لئے کہہ دیا تھا۔ آج بھی وہ فارم اور فیس جمع کروا کر رہی کہے گا۔ سو اس نے سوچا کہ فیس تو اب جمع ہو ہی جائے گی، اس لئے اسے وقت ضائع کرنے کے بجائے گھر چلے جانا چاہئے اور بڑے اطمینان سے وہ گھر آ گئی تھی۔

اس دن یونیورسٹی میں کلاسز کا آغاز ہوا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے یونیورسٹی گئی تھی مگر اس کا یہ اطمینان اس وقت غائب ہو گیا تھا۔ جب پہلی ہی کلاس میں پروفیسر صاحب نے رجسٹر کھول کر رول نمبر پکارنے کی بجائے کلاس سے درخواست کی تھی کہ وہ باری باری اپنی رول نمبر سلسلے کے ساتھ ان کے پاس آئیں اور اپنے رول نمبر اور نام لکھوادیں۔ اس کی ارد گرد بیٹھی ہوئی لڑکیوں نے اپنی رول نمبر سلسلے نکال لی تھیں۔ وہ چند لمحے حیرت سے اب اسے ساتھ بیٹھی

ہوئی لڑکی کے ہاتھ میں پلائی ہوئی سلسلے دیکھتی رہی اور پھر اس نے پوچھا تھا۔
 ”آپ نے یہ رول نمبر سلسلے کہاں سے لی ہے؟“ اس لڑکی نے اس سوال پر کچھ تعجب سے اسے دیکھا تھا۔

”یہ آفس سے ملی ہے فیس جمع کروانے کے بعد۔“ کچھ توقف کے بعد اس لڑکی نے کہا تھا۔

”مگر مجھے تو یہ نہیں ملی۔“

”کیوں آپ نے یہ آفس سے کیوں نہیں لی؟“

”اصل میں، میں نے خود فیس جمع نہیں کروائی تھی۔ ایک لڑکے نے کروائی تھی۔“
 ثانیہ نے وضاحت کی تھی۔

”ہاں تو آپ کی سلسلے اس لڑکے کے پاس ہوگی۔ آپ اس سے لے لیں۔“ اس لڑکی نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے لاپرواہی سے کہا تھا۔
 ”مگر مجھے تو نہیں پتا، وہ لڑکا اس وقت کہاں ہوگا۔“ وہ منمنائی تھی۔
 اس بار لڑکی نے غور سے اسے دیکھا تھا۔

”کیوں، آپ اس لڑکے کو جانتی نہیں ہیں؟“ ثانیہ نے بمشکل نفی میں گردن ہلائی تھی۔
 ”واٹ! تو آپ نے فیس اسے جمع کروانے کے لئے کیسے دے دی؟“ وہ لڑکی حیرانی سے بولی تھی ثانیہ نے بے چارگی سے اسے دیکھا۔

”وہ انگلش ڈیپارٹمنٹ کا ہے؟“ اس لڑکی نے پوچھا تھا۔

”ہاں نہیں۔“ ثانیہ کے حلق سے اب بمشکل آواز نکل رہی تھی۔

”نام پتا ہے آپ کو اس کا؟“

”وہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔“ اب اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی دوسری لڑکیاں بھی متوجہ ہو چکی تھیں۔

”آپ کو اس کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں اور پھر بھی آپ نے اسے فیس جمع کروانے کے لئے دے دی۔ پتا نہیں اس نے فیس جمع کروائی بھی ہے یا نہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ اس نے فیس جمع نہیں کروائی ہوگی۔ بہر حال اب آپ کلاس ختم ہونے کے بعد اسے ڈھونڈنے کی کوشش کریں کیونکہ جب تک آپ کے پاس رول نمبر سلسلے نہیں ہوگی آپ کا نام کوئی بھی پروفیسر رجسٹر نہیں کرے گا۔ اب تو ویسے بھی فیس جمع کروانے کی آخری تاریخ بھی گزر چکی ہے اگر اس لڑکے نے فیس جمع نہیں کروائی تو اب آپ کا ایڈمیشن بھی نہیں ہوگا۔“

ثانیہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کی باتوں پر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ اس کا جی راہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سا جائے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی نظریں اسے بری طرح چھہ رہی تھیں۔

وہ آنکھوں میں نمی لئے سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔ کلاس ختم ہونے کے بعد وہ اپنا بیگ اٹھائے باہر آگئی تھی۔ اپنے ذہن میں اس لڑکے کا چہرہ یاد کرتے ہوئے وہ اسے ڈھونڈنے لگی۔ اسے ڈھونڈتے ہوئے ایک بار پارکنگ میں بھی گئی تھی کہ شاید وہیں وہ اسے مل جاوے مگر وہ تو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھا۔ ایک گھنٹہ تک ہر جگہ خوار ہونے کے بعد اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ اپنے ڈپارٹمنٹ کی طرف آنے کے بعد اندر کلاس میں جانے کے بجائے وہ لان کے ایک کونے میں آ کر بیٹھ گئی تھی اور اپنے سر کو بازوؤں میں چھپا کر بے آواز رونے لگی تھی۔

جی بھر کر رونے کے بعد جب وہ پرسکون ہوئی تو اس نے بیگ سے رومال نکال کر اپنی آنکھیں اور چہرہ خشک کرنا شروع کیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ کے پاس جا کر یہ مسئلہ بتائے گی مگر وہ جانتی تھی کہ وہ بھی اس معاملہ میں اس کی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے واقعی بڑی حماقت کی تھی۔ بوجھل قدموں کے ساتھ سر جھکائے ڈپارٹمنٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں اور اچانک سر اٹھانے پر اس کے پیر جیسے پتھر کے ہو گئے تھے۔ سامنے برآمدے کے ستون کے ساتھ ٹیک لگائے وہی کھڑا تھا۔ وہ اپنے کچھ دوستوں سے باتوں میں کافی مصروف لگ رہا تھا۔ ثانیہ کے قدموں تلے جیسے زمین آگئی تھی وہ تقریباً بھاگتے ہوئے اس کے پاس گئی تھی۔

”آپ نے مجھے رول نمبر سلب کیوں نہیں دی؟ آپ کو پتا ہے، اس کے بغیر میرا نام کہیں بھی رجسٹرڈ نہیں ہوگا۔ میں اتنی دیر سے آپ کو ڈھونڈ رہی تھی مگر آپ مجھے کہیں بھی نظر نہیں آئے۔ میری رول نمبر سلب کہاں ہے؟“

وہ بے قراری سے بولتی گئی تھی۔ اس کی آمد سے وہاں سکوت چھا گیا تھا۔

”آپ اس دن رول نمبر سلب لینے کے لئے رکی کہاں تھیں۔ میں نے کافی دیر تک آپ کا انتظار کیا تھا۔ بہر حال اب میں نے وہ سلب ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ کو دے دی ہے آپ ان سے جا کر لے سکتی ہیں۔“

اس کے خاموش ہوتے ہی کومیل نے کافی بے رخی سے اسے جواب دیا تھا۔

”آپ میرے ساتھ چلیں۔ مجھے نہیں پتا، وہ اس وقت کہاں ہوں گے۔“ وہ اب

اس کے گم ہو جانے کا رسک کہاں مول لے سکتی تھی۔

”وہ اس وقت آپ لوگوں کی ہی کلاس لے رہے ہیں۔“ اس بار کومیل کے بجائے ولید نے کہا تھا مگر وہ وہاں سے ہلے کو تیار نہیں تھی۔

”نہیں۔ آپ خود میرے ساتھ چل کر مجھے سلب لے کر دیں۔ میں اکیلے نہیں جاؤں گی۔“ اس نے سرفنی میں ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

”ویسے بھی مجھے کیا پتا آپ نے سر کورول نمبر سلب دی بھی ہے یا نہیں۔ میں یہاں سے جا کر واپس آؤں اور آپ مجھے نہ ملے تو میں آپ کو کہاں سے ڈھونڈوں گی۔“

اس نے احسان فراموشی کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے تھے۔ کومیل کے دوست اس تبصرے پر حیران ہوئے تھے مگر اس کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔

”جاؤ یارا! خود ہی جا کر انہیں سلب لا دو۔“

ولید نے کافی ناگواری سے اس سے کہا تھا۔

وہ ہونٹ سمیچتا ہوا وہاں سے چل پڑا تھا۔ پہلی بار اسے اس طرح کی سبکی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ثانیہ بھی اس کے ساتھ ہی چل پڑی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ وہ کہیں پھر غائب نہ ہو جائے۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ ثانیہ نے ساتھ چلتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

کومیل کا دل چاہا تھا کہ وہ اسے جھڑک کر منہ بند رکھنے کے لئے کہے مگر اس نے کمال تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا نام بتا دیا تھا۔ مگر ثانیہ بے یقینی کی آخری سیڑھی پر براجمان تھی۔ اپنی طرف سے وہ انتہائی ذہانت کا مظاہرہ کر رہی تھی اسی لئے اس نے کہا۔

”مگر مجھے کیا پتا، یہ آپ کا اصلی نام ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے، آپ صحیح نام بتانہ رہے ہوں۔“

کومیل کے قدم رک گئے تھے۔ سرخ چہرے کے ساتھ اس نے جنز کی پاٹ سے والٹ نکال کر کھولا تھا اور اپنا I.D کارڈ اس کے سامنے کر دیا تھا۔

”آپ دیکھ سکتی ہیں کہ میرا نام سید کومیل حیدر ہی ہے اور اپنے ذہن سے یہ خدشات نکال دیں کہ میں کہیں بھاگنے کی تیاری میں ہوں۔ نہ ہی یہ سوچیں کہ میں نے آپ کی فیس جمع نہیں کروائی۔ آپ نے مجھے کوئی دس لاکھ روپیہ نہیں دیا تھا جو میں لے کر فرار ہو جاتا۔

اس لئے اب آپ اپنا منہ برائے مہربانی بند کر لیں۔“

اس نے اپنا والٹ جیب میں رکھتے ہوئے اسے بری طرح جھڑکا تھا۔ وہ قدرے

شرمساری دوبارہ اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔

”مے آئی کم ان سرا“ کوئیل نے دروازے میں کھڑے ہو کر سرنیم سے اندر آنے کی اجازت لی تھی۔ وہ اجازت ملنے پر اس کے پیچھے پیچھے اپنی کلاس میں داخل ہو گئی۔

”سرا! وہ فیس کی رسیدیں اور سلف ان کی ہی تھی۔“ کوئیل نے سرنیم کے پاس پہنچ کر کہا تھا۔

”میں نے آپ کا رول نمبر لکھ لیا ہے، یہ آپ لے لیں۔“

سرنیم نے اس سے یوں کہا تھا جیسے یہ ایک عام سی بات تھی۔

وہ سلف اور رسیدیں لے کر اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ کوئیل واپس دروازے کی طرف جانے لگا تھا۔ جب سرنیم نے اسے بلا لیا تھا۔ کچھ دیر تک ان دونوں کے درمیان سرگوشیوں میں گفتگو ہوتی رہی پھر وہ باہر چلا گیا تھا۔ ثانیہ شرمندگی کے عالم میں اپنی سیٹ پر بیٹھی رہی۔

”یہ آپ کے کیا کلتے ہیں؟“ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی نے عجیب سے اشتیاق

کا اظہار کیا تھا۔

”کچھ بھی نہیں۔ انہوں نے میری فیس جمع کروائی تھی۔“ اس نے مدہم آواز میں

جھکے ہوئے سر کے ساتھ جواب دیا تھا۔ دل پر ابھی بھی ملال کی وہی کیفیت تھی۔

”ان کا نام کوئیل حیدر ہے۔ یہ فائل ایئر کے سب سے قابل اسٹوڈنٹ ہیں۔“

اس لڑکی نے سرگوشی میں اس کا تعارف کر دیا تھا۔ وہ خاموشی سے سر ہلا کر رہ گئی۔

اپنی غلطی اب اسے گناہ کبیرہ لگنے لگی تھی۔ بڑی بے دلی سے اس نے باقی کلاسز لی تھیں۔ ذہن

اس کا ابھی بھی اس کے ساتھ ہونے والی اپنی گفتگو پر اٹکا ہوا تھا۔

”کتی مدد کی تھی اس نے۔ کیا تھا اگر میں اتنی بے اعتباری کا مظاہرہ نہ کرتی۔ وہ مل

تو گیا تھا پھر کہاں بھاگ جاتا۔ میں نے خواہواہ میں ہی ایسی بات کر کے اسے ناراض کر دیا۔

وہ بھی مجھے کیا سمجھتا ہوگا۔ سوچتا ہوگا کہ نیکی گلے پڑ گئی ہے۔“

سوچوں کا ایک سیلاب تھا جو اٹھا چلا آ رہا تھا۔ آخری کلاس لینے کے بعد وہ باہر

آ گئی تھی۔ برآمدے میں کافی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ وہ ڈپارٹمنٹ سے نکلنے والی تھی جب

اس نے میزٹیوں پر کوئیل کے گروپ کو بیٹھے دیکھا تھا۔ اس کے دوست میزٹیوں پر بیٹھے ہوئے

تھے جبکہ وہ آخری میزٹی پر بیٹھ کر رکھے ہوئے ان سے گفتگو میں مصروف تھا۔ اسی نے سب سے

پہلے اسے دیکھا تھا۔ بہت اچھٹی سی نظر ڈالی تھی اس نے۔ لیکن یقیناً اس کے چہرے پر کوئی ایسا

تاثر آیا تھا جو اس کے دوستوں سے پوشیدہ نہیں رہ پایا۔ انہوں نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا تھا اور پھر اسی برق رفتاری سے گردنیں واپس مڑ گئی تھیں مگر ان کے چہرے پر ابھرنے والی ناگواری وہ دیکھ چکی تھی۔

”مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ وہ پھر بھی ان کے قریب چلی گئی تھی۔

”جی فرمائیے، اب کیا بات کرنی ہے آپ کو؟“ کوئیل کے تیز خاصے بگڑے

ہوئے تھے۔

”مجھے آپ سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔“

”آپ مجھے میں اکیلا ہوں اور جو کہنا ہے یہیں کہیں۔“ کوئیل کسی صورت بھی اب

اس کے ساتھ جانے کو تیار نہیں تھا۔

وہ چند لمحوں کے دوستوں کی طرف دیکھتی رہی جو بڑی بے نیازی سے وہیں

براجمان تھے۔

”مجھے آپ سے ایک سکوپوز کرنی تھی۔ مجھے آپ سے اس طرح بات نہیں کرنا چاہئے

تھی مگر میں.....“

کوئیل نے اسے بات مکمل کرنے نہیں دی۔ دیکھیں بی بی! مجھے کوئی دلچسپی نہیں

ہے آپ کی اس معذرت سے۔ آپ نے جو کہا۔ اس سے میری انسٹلٹ ہوئی ہے۔ میں آپ

کی مدد کے لئے آپ کے پاس نہیں گیا تھا۔ آپ آئی تھیں اور یہ آپ کی غلطی تھی کہ آپ رول

نمبر سلف لیے بغیر چلی گئیں اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا اور آپ نے مجھے کوئی اتنا بڑا خزانہ

نہیں تھما دیا تھا جو میں لے کر غائب ہو جاتا اور ساری زندگی اس پر عیش کرتا اور آپ کو میں کیا

شکل سے فراڈ لگتا ہوں جو آپ ایسے کہہ رہی تھیں کہ میرے ساتھ چلو۔ میں کہاں سے

ڈھونڈوں گی اگر آپ غائب ہو گئے، وغیرہ وغیرہ۔“

آپ کے لئے وہ رقم خزانہ نہیں تھی میرے لئے تھی۔ میں گھبرا گئی تھی کیونکہ میرے

پاس بس فیس کے لئے وہی روپے تھے۔ اگر دوبارہ فیس جمع کرانا پڑتی تو میں کہاں سے

کر داتی۔ اس لئے میں نے اس طرح Behave کیا۔“

بات ختم کرتے کرتے آنسوؤں کی رفتار میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ کوئیل اور اس کے

دوستوں کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے صورت حال کم از کم ان کے لئے کافی سنگین تھی ارد گرد سے

گزرنے والے اسٹوڈنٹس اب کافی غور سے ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے اور شاید چند لمحوں میں وہ

وہاں کھڑے ہونا بھی شروع کر دیتے۔ موہنے سب سے پہلے ہوش مند کی کا مظاہرہ کیا تھا۔

کے بعد انہوں نے گورنمنٹ کالج سے گریجویشن کی تھی اور اب یونیورسٹی میں تھے۔ اشعر، موبد اور کومیل کے خاندان کا تعلق بزنس سے تھا اور وہ ویسے بھی آپس میں جان پہچان رکھتے تھے جبکہ ولید کے والد رسول سردسز میں تھے۔

شروع سے کواہجیکیشن میں پڑھنے کے باوجود ان کے گروپ میں کسی لڑکی کی شمولیت نہیں ہوئی تھی، کومیل کے علاوہ باقی تینوں کی کچھ لڑکیوں سے اچھی دوستی تھی مگر ان کا گروپ پھر بھی چار لوگوں تک ہی محدود تھا۔ پڑھائی میں چاروں اچھے تھے۔ اس لئے ہمیشہ ایک مقابلہ سا رہتا تھا ان میں۔ اور اسی مقابلے نے گورنمنٹ کالج اور اب یونیورسٹی میں انہیں کافی ریزرو کر دیا تھا۔ صنف نازک کو تو وہ ویسے ہی لفٹ نہیں کرواتے تھے جبکہ لڑکوں سے بھی ان کی بس سلام دعا ہی ہوتی تھی اور یہ ان کے گروپ کا خاموش معاہدہ تھا کہ وہ کسی دوسرے کی مدد کے لئے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ اگر کبھی کسی کو مدد کی ضرورت ہوتی تو باقی تینوں تو پھر مردانا کسی کا کام کر بھی دیتے تھے مگر کومیل اس معاملے میں بالکل بے لحاظ تھا۔

I keep myself to myself and want others to do the same thing.

(میں اپنے معاملات خود تک محدود رکھتا ہوں اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتا ہوں)

کسی اور کو اس اصول پر اعتراض ہو یا نہ ہو بہر حال اس کے دوستوں کو نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے کی Moral Values (اخلاقی قدریں) بدلنے کی کوشش نہیں کرتے تھے نہ ان میں دخل اندازی کرتے تھے اور شاید اسی وجہ سے کومیل کی ان کے ساتھ اچھی نہی تھی۔ مگر اب پہلی دفعہ اس نے اپنے اصولوں کو توڑتے ہوئے کسی لڑکی کی مدد کی تھی۔ ردو کا نتیجہ تو خیر جو ہوا سو ہوا مگر وہ لڑکی کومیل کے دل میں نرم گوشہ بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

”سنیں، آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟“ اس شناسا آواز پر وہ ایک گہری سانس لے کر پلٹا تھا۔ وہ پھر اس کے سامنے کھڑی تھی مگر اس بار کومیل کو اس پر غصہ آیا نہ الجھن ہوئی۔

”نہیں ثانیہ! میں بالکل بھی ناراض نہیں ہوں۔ کل مجھے غصہ آیا تھا اور کل ہی ختم ہو گیا۔ اس لئے آپ کو اس بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر دوبارہ بھی کبھی آپ کو میری مدد کی ضرورت ہو تو Just come straight to me (تو آپ سیدھی میرے پاس آئیں) مجھے اچھا لگے گا آپ کی مدد کر کے۔“

زندگی میں پہلی بار اس نے کسی کو خود مدد کی آفر کی تھی۔ اگر اس کے کلاس فیلوزن

”ٹھیک ہے جو ہو گیا اب اسے بھول جائیں۔ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہوئی جو آپ یوں رونے لگیں۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ اب بس معاملہ کلیئر ہو گیا ہے۔ آپ پلیز یہ روٹا بند کر دیں۔“

ثانیہ نے ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھنا شروع کر دیئے پھر یک دم اس نے ہاتھ روک کر کومیل سے پوچھا۔

”آپ نے بھی مجھے معاف کر دیا؟“

”Just forget it“ (بھول جائیں اسے) معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ کومیل نے اپنے حواس بحال کرتے ہوئے بمشکل کہا تھا۔

”تھینک یو۔“ اب اس کے گرتے آنسو ختم گئے تھے۔ بائیں ہاتھ سے انہیں خشک کرتے ہوئے وہ وہاں سے چلی گئی۔

ولید نے اس کے جاتے ہی سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنا اٹکا ہوا سانس بحال کیا تھا۔

”آج تو رسوا ہوتے ہوتے بچ گئے۔“ اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔

”یہ کیا چیز ہے یار؟“ موبد نے اچھے ہوئے لہجے میں کومیل سے پوچھا۔

”بہر حال کومیل حیدر صاحب! آپ آئندہ اس سوشل ورک پر قابو رکھیں گا۔ یہ خواہ مخواہ کی مصیبتیں اکثر گلے ہی نہیں پڑتیں، رسوا بھی کر دیتی ہیں۔“ اشعر نے کومیل کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اسے پھٹکاڑا تھا۔ کومیل خاموش رہا تھا۔ اس کی خاموشی نے انہیں کچھ حیران کیا تھا مگر پھر موضوع بدل گیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ ان سب کے ذہنوں سے ثانیہ نکل گئی تھی مگر کومیل کے ذہن سے نہیں۔ پہلی بار کوئی لڑکی اس طرح اس کے سامنے روئی تھی۔ گھر جا کر بھی بار بار اس کے ذہن میں وہی آتی رہی۔ بہت عجیب سی فیلنگز محسوس کی تھیں اس نے۔ وہ کوئی بہت حسین و جمیل نہیں تھی مگر پھر بھی خوبصورت تھی۔ سفید رنگت کی مالک تھی اور ناک نقشہ بھی اچھا تھا لیکن اس کی آنکھیں غضب کی تھیں۔ بچوں کی طرح شفاف، موٹی موٹی سیاہ آنکھیں جو اس کے باقی چہرے کی طرح کسی سنگھار کے بغیر تھیں مگر بے حد دل فریب تھیں۔ لیکن کومیل اس کی خوبصورتی سے نہیں اس کی سادگی سے متاثر ہوا تھا جو غصہ اسے اس پر آیا تھا۔ وہ یونیورسٹی میں اس کے رونے پر ختم ہو گیا تھا بلکہ اسے شرمندگی ہوتی رہی کہ نہ وہ اس سے اس طرح بات کرتا نہ وہ اس طرح روئی۔

کومیل کا گروپ ڈپارٹمنٹ کی کریم سمجھا جاتا تھا اس کے گروپ میں اس سمیت چار لوگ تھے اور وہ چاروں شروع سے ہی اکٹھے تھے۔ لیکن ہاؤس سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے

لیتے تو انہیں اپنے کانوں پر یقین نہ آتا کہ یہ کوئیل حیدر ہی ہے۔

ثانیہ کے چہرے پر تشکر آمیز مسکراہٹ لہرائی تھی۔ اس کے سر سے جیسے ایک پہاڑ اتر گیا تھا۔ وہ وہاں سے جا چکا تھا اور ثانیہ بے پناہ خوش تھی۔

پہلے دن صرف دو بجیکٹس کی تعارفی کلاسز ہوئی تھیں۔ باقی تین پیریڈز میں کوئی نہیں آیا تھا۔ دوسرے دن ڈرامہ کی کلاس لینے کے لئے جو پروفیسر صاحب آئے تھے، انہوں نے اپنے ظاہری حیلے سے انہیں کافی چونکایا تھا۔ وہ عمر سے کسی طرح بھی پروفیسروں جیسے تجربہ کار نہیں لگ رہے تھے۔ پوری کلاس پوری طرح چونکنا تھی کیونکہ وہ کسی طرح بھی فائل ایئر کے ہاتھوں فول بننا نہیں چاہ رہے تھے۔ گاؤں پہنچے ہوئے عینک کے ساتھ وہ حضرت بے حد سنجیدہ لگ رہے تھے لیکن کلاس کو یقین ہو چکا تھا کہ یہ فائل ایئر کا کوئی لڑکا ہے پھر ان کے چہرے پر اتنی سنجیدگی تھی کہ کافی اسٹوڈنٹس کچھ شش و پنج میں پڑ گئے تھے۔ وہ صاحب سیدھا روسٹرم کی طرف گئے اور اپنی فائل اس پر رکھ دی پھر بڑی گھمبیر آواز میں اپنا تعارف کروانا شروع کیا۔

”میرا نام علی اکبر رضوی ہے اور میں آپ لوگوں کو ڈرامہ پڑھاؤں گا۔“

اسٹوڈنٹس نے ان دو جملوں کے بعد ایک دوسرے کے چہروں پر نظر دوڑائی تھی پھر

ایک لڑکا کھڑا ہو گیا تھا۔

”لیکن پراسپیکٹس میں تو انگلش ڈپارٹمنٹ میں ایسے کوئی پروفیسر نہیں ہیں نہ ہی آپ

اتنی زیادہ عمر کے لگتے ہیں۔“

وہ لڑکا کافی ذہین لگتا تھا مگر روسٹرم کے پیچھے موجود صاحب کے چہرے پر کوئی گجراہٹ نمودار ہوئی تھی نہ ہی پریشانی جھلکی تھی بلکہ ایک مسکراہٹ ان کے چہرے پر آگئی تھی۔

”مجھے یونیورسٹی جو ان کئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ دراصل میں کلاسیکل پوسٹری میں ڈاکٹریٹ کے لئے انگلینڈ گیا ہوا تھا اسکالرشپ پر۔ صرف ایک ہفتہ پہلے ہی میں نے دوبارہ یونیورسٹی جو ان کی ہے اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں زیادہ عمر کا نہیں لگتا تو میں تو اسے تعریف سمجھوں گا۔ بہر حال میں تقریباً پینتیس سال کا ہوں۔ اسٹڈیز میں اچھا تھا اس لئے تعلیم

مکمل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں جانتا ہوں شاید آپ لوگوں کو یہ شبہ ہوگا کہ میں فائل ایئر سے ہوں اور آپ کو فول بنانے آیا ہوں۔ اس کا حل ایک ہی ہے کہ آپ میں سے کوئی ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ کے پاس جا کر میرے بارے میں پوچھ لے بلکہ ایسا کرتے ہیں کہ ابھی

آپ لوگ میرے بارے میں تصدیق کر لیں۔“

انہوں نے بہت شائستگی سے ان کے شبہات دور کئے تھے۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہوتا اور ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ کے پاس جاتا مگر پھر وہی لڑکا جس نے پہلے اعتراض کیا تھا اٹھ کھڑا ہوا۔

”سر پلیز آپ مائنڈ مت کیجئے گا لیکن بہتر ہے کہ میں پوچھ آؤں۔“

اس نے اس بار کافی مؤدب انداز میں کہا تھا۔ ڈاکٹر علی رضوی کے چہرے پر موجود مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”بالکل آپ ضرور پوچھ کر آئیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

وہ لڑکا کلاس سے باہر گیا تھا لیکن پوری کلاس کو یقین ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر علی اکبر رضوی کوئی فراڈ نہیں ہیں۔

”میرا خیال ہے جتنی دیر میں واپس آئیں، میں آپ لوگوں کا نام اور رول نمبر رجسٹر کر لیتا ہوں۔“

انہوں نے اطمینان سے رجسٹر کھولتے ہوئے کہا تھا۔ پھر انہوں نے باری باری سب کے رول نمبر رجسٹر کر لئے۔ اسی دوران وہ لڑکا واپس آ گیا تھا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

”جی اب آپ کو یقین آ گیا کہ ڈرامہ آپ کو میں ہی پڑھاؤں گا اور میں اسٹنٹ پروفیسر ہی ہوں؟“

اس لڑکے کے کلاس میں داخل ہونے پر ڈاکٹر علی اکبر رضوی نے کہا۔ وہ لڑکا کچھ جھینپتے ہوئے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ رول نمبر اور نام رجسٹر کرنے کا کام تیزی سے ختم کرتے ہوئے ڈاکٹر علی اکبر رضوی نے رجسٹر بند کر دیا اور کہنا شروع کیا۔

”آپ میں سے بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جنہیں ایم اے انگلش کرنا بہت مشکل لگتا ہوگا، خاص طور پر ڈرامہ کے بارے میں آپ نے بہت سے تمبرے سنے ہوں گے کہ یہ مشکل ہے، سمجھ میں نہیں آتا۔ دلچسپ نہیں۔ خاص طور پر شیکسپیر ہو سکتا ہے کسی نے آپ سے یہ بھی کہا ہو کہ ڈرامہ میں صرف اللہ ہی پاس کر داسکتا ہے۔“ وہ بڑے دوستانہ انداز میں اپنے سبکیٹ کا تعارف کر دیا ہے تھے۔

”جب میں نے ایم اے میں داخلہ لیا تھا تو مجھے بھی ایسے ہی تمبرے سننے پڑے تھے۔ ڈرامہ میرے لئے ایک ہوا بن گیا تھا۔ بہر حال میں نے خود ہی اس کو سمجھنے کی کوشش کی اور پھر ڈرامہ میرے لئے ایک اتنی آسان چیز بن گیا کہ میں نے پی ایچ ڈی اس میں کرنے

کے بجائے ایک دوسرے سبکیٹ میں کی جو مجھے قدرے مشکل لگتا تھا۔“
کلاس بڑی دلچسپی سے ان کی بات سن رہی تھی۔

”میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں ابھی کچھ دن پہلے ہی انگلینڈ سے پی ایچ ڈی کر کے لوٹا ہوں اور واپس آنے کے بعد میں نے ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ سے یہ کہا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں کسی سبکیٹ کو اچھے اور منفرد طریقے سے پڑھاؤں تو پھر آپ مجھے ڈرامہ پڑھانے کے لئے دیں کلاسیکل پوسٹری نہیں۔ انہوں نے میری درخواست مان لی اور مجھے ڈرامہ کی کلاس دی۔ لندن میں اسٹڈیز کے دوران میں ہمیشہ یہ سوچتا رہا تھا کہ کسی سبکیٹ کو کسی طرح آسان بنا کر اسٹوڈنٹس کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے اور ایسا کیوں ہے کہ ہمارے اسٹوڈنٹس ڈرامہ جیسے سبکیٹ میں اچھے نمبر نہیں لے پاتے۔ جو بنیادی وجہ میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ٹیچرز آپ لوگوں کو ٹھیک طرح سے گائیڈ نہیں کرتے اگر پراپر گائیڈنس (رہنمائی) ہو تو میرا دعویٰ ہے کہ ڈرامہ آپ کے لئے سب سے آسان سبکیٹ بن جائے گا اور میں آپ کو کچھ مختلف طریقے سے سبکیٹ پڑھاؤں گا۔ اس روایتی اور گھسے پٹے طریقے سے نہیں جواب تک چلتا آ رہا ہے۔“

ثانیہ سمیت پوری کلاس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کی شخصیت بھی ان کے حلیے کی طرح الگ اور منفرد نظر آ رہی تھی۔

”آپ لوگوں کے پاس وہی گھسے پٹے نوٹس اور کی بکس ہوتی ہیں جو کئی سالوں سے لوگ استعمال کرتے آ رہے ہیں اور جن کا استعمال اب آپ کو چھوڑ دینا چاہئے۔ کم از کم لٹریچر پڑھتے ہوئے آپ کو رٹے سے ہاتھ دھو لینے چاہئیں۔ میں آج کا کام کل پر چھوڑنے کا قائل نہیں ہوں آپ کو میرے پڑھانے کے طریقے سے پتا چل جائے گا کہ میں کس قدر Organized ہوں۔ میں آپ کو ہر ٹاپک پر لیکچر دوں گا اور آپ کو کچھ نوٹس بھی دیا کروں گا مگر وہ نوٹس رٹے لگانے کے لئے نہیں ہوں گے بلکہ ان سے آپ کو صرف بنیادی گائیڈنس ملے گی، بعد میں آپ کو خود اسائنمنٹس تیار کرنی ہوں گی۔ چونکہ آج پہلی بار میں نے آپ کی کلاس لی ہے اس لئے میں آپ کو آج ڈرامہ کے بارے میں کچھ تعارفی نوٹس دوں گا کیونکہ زیادہ وقت نہیں ہے اور آپ بہت زیادہ لکھ بھی نہیں سکیں گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ ان نوٹس کی فوٹو کاپی کروالیں یہ نوٹس میں نے باہر انگلینڈ میں کچھ بہت اچھی کتابوں سے تیار کئے ہیں۔ اس لئے میرے لئے یہ بہت قیمتی ہیں میں آپ سب کو یہ باری باری فوٹو اسٹیٹ کروانے کے لئے نہیں دے سکتا۔ آپ میں سے کوئی ایک لڑکا یہ نوٹس مجھ سے لے لے اور

صفحات گن کر سب سے اتنے روپے لے لے اور اکٹھی فوٹو کا پیز کروا کے آج ہی سب میں تقسیم کر دے۔ کل جب میں کلاس میں آؤں تو سب کے پاس یہ نوٹس ہونے چاہئیں اور آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان نوٹس کے مین پوائنٹ کیا ہیں۔“
ان کی بات کے اختتام پر اگلی رو میں بیٹھے ہوئے دولڑکے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ان میں سے ایک نے کہا تھا۔

”سر ہم فوٹو اسٹیٹ کروا لیتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ تم سب سے آج ہی روپے جمع کر لو اور ایک صفحے پر ان کے نام بھی لکھ لو اور نوٹس ہر صورت میں آج ہی فوٹو اسٹیٹ کروا کر سب میں تقسیم کر دینا۔ اب ذرا دیکھ لو کہ یہ کتنے صفحات ہیں اور کتنے روپے لگیں گے۔“

انہوں نے نوٹس اس لڑکے کی طرف بڑھا دیئے تھے۔

”سر سو صفحات ہیں یعنی پچاس روپے لگیں گے۔“

اس لڑکے نے صفحات گننے کے بعد کہا تھا۔ کلاس میں موجود لوگوں نے باری باری اپنے بیگز اور والٹ کھولنے شروع کر دیئے تھے۔

”ٹھیک ہے آپ لوگ یہ کام کر لیجئے گا۔ اب کل ملاقات ہوگی۔“

ڈاکٹر علی اکبر رضوی اپنی فائل اٹھا کر باہر نکل گئے تھے۔

”I really like him yaar“ (مجھے یہ بہت اچھے لگے ہیں) ثانیہ کے

ساتھ بیٹھی ہوئی ایک لڑکی نے دوسری سے کہا تھا۔

”بالکل اگر اس طرح ٹیچر محنت کروائیں اور گائیڈ کریں تو پھر تعلیم کا معیار کیوں بلند نہیں ہوگا۔“ دوسری لڑکی نے بیک سے روپے نکالتے ہوئے کہا تھا۔

ثانیہ نے بھی اپنے بیک کو ٹٹولنا شروع کیا وہ جانتی تھی کہ بیک میں صرف پچاس ہی روپے تھے اور اگر وہ یہ روپے دے دیتی تو پھر وہ گھر کیسے جاتی۔ کچھ دیر تک بیک کے اندر ہاتھ ڈالے پچاس روپے مٹی میں لئے وہ شش و پنج میں ان دولڑکوں کو دیکھتی رہی جو ایک صفحے پر لڑکے اور لڑکیوں کے نام لکھنے کے بعد ان سے روپے لے رہے تھے پھر کچھ مردہ دلی سے اس نے پچاس کا نوٹ بیک سے نکال ہی لیا تھا۔ شاہدہ تک پیدل جانے کے خیال سے اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اس نے بھی لڑکوں کو روپے دیئے اور اپنا نام لکھوا دیا۔

تقریباً پوری ہی کلاس نے روپے جمع کروا دیئے۔ روپے جمع کرنے کے بعد وہ دونوں لڑکے کلاس سے چلے گئے تھے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد سر جاوید کی کلاس شروع ہو گئی

تھی۔ ثانیہ ان کے پورے لیکچر کے دوران پریشانی کے عالم میں رہی۔ وہ روز و نین پر شاہدہ سے آتی تھی اور وین پر شاہدہ آنے پر بھی آدھ گھنٹہ سے زیادہ لگ جاتا تھا اور پھر اس کو راستے کا بھی ٹھیک سے پتا نہیں تھا کیونکہ اس نے ابھی سڑکوں اور موڑوں پر زیادہ غور کرنا شروع نہیں کیا تھا۔ پورے پیریڈ کے دوران وہ متشکر انداز میں ذہن میں رستے کا خیالی نقشہ بناتی رہی اور ہر نقشہ اسے گھر تک پہنچانے میں ناکام رہا تھا۔

سر جاوید کی کلاس آخری کلاس تھی اور جب تیل ہونے پر سر جاوید کلاس سے نکلے تو آہستہ آہستہ سب لوگ اپنی کتابیں بیک اور فائلیں اٹھا کر باہر آنا شروع ہو گئے۔ وہ بھی اپنا بیک اٹھا کر کلاس سے باہر نکل آئی۔

باہر نکلتے ہی سامنے لان میں ایک ہنگامہ اس کا منتظر تھا۔ پوری فائل ایئر وہاں جمع تھی اور ڈاکٹر علی رضوی اوپنر سے کوک کی بوتلز کھول کھول کر فائل ایئر کے اسٹوڈنٹس کو تھما رہے تھے۔ بانلز کے کرش کے ساتھ لان میں لٹج باکسز کا ڈھیر بھی نظر آ رہا تھا۔ قہقہوں اور ہنسی کا ایک طوفان تھا جو وہاں آیا ہوا تھا۔ پریولیس کے لڑکے لڑکیاں بے حد سراپیسگی اور کچھ صدے کے عالم میں برآمدے میں کھڑے تھے۔ وہ چند لڑکیوں کے پاس چلی گئی۔

”یہ فائل ایئر کوئی پارٹی کر رہی ہے؟“ اس نے ان سے پوچھا تھا۔

بے حد ملامت انگیز نظروں سے اسے گھورا گیا تھا۔

”یہ پارٹی نہیں کر رہے۔ ہمیں فول بنایا ہے انہوں نے۔ ہمارے پیسے اڑا رہے ہیں یہ خمیٹ۔ آپ دیکھ نہیں رہیں۔ اس فراڈیے ڈاکٹر علی اکبر رضوی کو۔“

اس لڑکی نے دانت پیستے ہوئے کہا تھا ثانیہ کا دل ڈوب گیا تھا۔ ”تو جو روپے انہوں نے نوٹس کے لئے لیے تھے۔ یہ ان سے یہ سب کھا رہے ہیں۔“ اس کی آواز کسی کھائی سے نکلی تھی۔

”اور کیا کر رہے ہیں؟“

ثانیہ شدید صدے کے عالم میں لان میں موجود اس مجمع اور ہنگامے کو دیکھتی رہ گئی۔ مگر وہ سر نہیں نے بھی تو کہا تھا کہ ڈاکٹر علی اکبر رضوی..... اس نے پتا نہیں کس آس میں پوچھا تھا۔

”بھئی پتا نہیں آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آ رہا۔ وہ لڑکا جو پوچھے گیا تھا اور وہ جو روپے اکٹھے کر رہے تھے۔ وہ بھی فائل ایئر کے ہی ہیں۔ وہ دیکھیں سامنے لان کے کونے میں۔ انہوں نے باقاعدہ پلان کر کے سارا کام کیا ہے۔“

اس لڑکی نے ہاتھ کے اشارے سے لان کی طرف اسے متوجہ کیا تھا۔ شاہدہ تک کا فاصلہ اسے دو گنا لگنے لگا تھا۔ پریولیس کا کوئی اسٹوڈنٹ ایک دوسرے نظر میں ملا رہا تھا اور اتفاقاً نظر ملنے پر کھیانی سی ہنسی ہنسنے لگتے تھا۔ وہ کوریڈور کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر ہونٹ کھینچتے ہوئے آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی لیے سامنے لان کو دیکھنے لگی جہاں قہقہے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ پریولیس کے اسٹوڈنٹس نے آہستہ آہستہ وہاں سے جانا شروع کر دیا تھا۔ مگر وہ وہیں دیوار کے ساتھ ہی رہی۔

پھر پتا نہیں اس کے ذہن میں کیا آیا تھا۔ وہ یک دم لان کی طرف آئی اور فائل ایئر کی ایک لڑکی سے پوچھا۔

”ایکسیکو زمی۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں اس وقت کو میل حیدر کہاں ہیں؟“ وہ لڑکی کوک کاسپ لیتے ہوئے رک گئی۔

”لابریری میں دیکھ لیں، وہ وہیں ہوگا۔“ اس لڑکی نے کہا تھا۔

وہ تیزی سے لابریری کی طرف آ گئی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے ایک کونے میں کو میل کو دیکھ لیا تھا، اس کے دوست آج بھی اس کے ساتھ ہی تھے۔ وہ کچھ نوٹس بنانے میں مصروف تھے۔ وہ بڑی تیزی سے اس کے پاس آئی تھی۔

”ایکسیکو زمی کو میل! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ وہ اس کی آواز پر چونک اٹھا تھا۔ ولید اور موہب نے بھی سراٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

”آپ بیٹھیں۔“ کو میل نے اسے کرسی آفر کی تھی۔

”نہیں، مجھے بیٹھنا نہیں۔ آپ پلیز میرے ساتھ چلیں۔“ اس نے تیزی سے کہا تھا۔

”کہاں جانا ہے؟“ کو میل نے حیرانی سے سوال کیا تھا۔

”میں آپ کو بتا دوں گی۔ آپ پلیز آئیں تو سہی۔“

وہ التجائیہ انداز میں بولی تھی۔ کو میل نے موہب اور ولید کی طرف دیکھا۔ جن کی نظریں ان دونوں پر مرکوز تھیں پھر بادل خواستہ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں ایک منٹ میں آتا ہوں۔“ اس نے کچھ جھینپتے ہوئے ان سے کہا تھا۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ بڑے بے تاثر انداز میں دوبارہ کتابوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”آئیں۔“ اس نے ثانیہ سے کہا تھا۔ وہ اس کے آگے چلنے لگی۔ لابریری سے باہر آتے ہی اس نے بولنا شروع کر دیا تھا۔

”آپ کی کلاس نے ہمارے ساتھ فراڈ کیا ہے۔“ وہ آہستہ آہستہ اسے تفصیل

سنائی دی تھی۔

”ایکسکوز می کو میل! کیا آپ میرا ایک کام کر سکتے ہیں؟“ وہ پیچھے مڑا اور کچھ جتانے والے انداز میں اس نے کہا۔ ”السلام علیکم!“

وہ کچھ جھینپ گئی تھی۔ ”مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔“ وہ منمنائی۔

”السلام علیکم!“ کو میل نے ایک بار پھر اسی انداز میں سلام دہرایا۔

”وعلیکم السلام!“ اس نے اس بار کچھ شرمندگی سے جواب دیا تھا۔

”ہو جائے گا کام۔ کیا کام ہے؟“ اس بار کو میل نے پوچھا تھا۔

”مجھے ہاسٹل میں کمرہ نہیں مل رہا۔“

”کمرہ کیوں چاہئے آپ کو۔ آپ تو کسی کے پاس رہتی ہیں ناں؟“

ہاں رہتی ہوں لیکن شاہدہ سے روز آنے جانے میں بہت وقت لگ جاتا ہے۔ پھر بعض دفعہ وہ لیکن ہی نہیں ملتی۔ بہت دیر انتظار کرنا پڑتا ہے۔ پھر خالہ کا گھر بھی چھوٹا ہے تو اب مجھے اچھا نہیں لگ رہا وہاں رہتے ہوئے۔ میں نے بابا سے بھی بات کی ہے، وہ بھی کہتے ہیں کہ ہاسٹل ہی صحیح رہے گا مگر ہاسٹل میں سفارش کے بغیر کسی کو جگہ نہیں مل رہی۔“ وہ بے تکلفی سے اسے بتاتی گئی تھی۔

”کمرہ مل جائے گا آپ کل ہاسٹل چلی جائیے گا۔“ کو میل نے یہ کہہ کر قدم آگے بڑھائے تھے مگر وہ تیزی سے سامنے آگئی تھی۔

”آپ سچ کہہ رہے ہیں کہ کمرہ مل جائے گا؟“ اس کی آواز میں بے یقینی تھی۔

”آپ کمرہ کیسے لے کر دیں گے؟“

اس نے سوال کیا تھا۔ وہ بے اختیار مسکرایا۔ پہلے دن کی روداد اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی تھی۔

”جب میں نے کہا ہے کہ لے دوں گا تو بس مان لو کہ لے دوں گا۔ کیوں اور کیسے اس کو چھوڑیں۔“

وہ یہ کہہ کر چلا گیا تھا۔ ثانیہ کو امید نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے کمرہ دلوانے کی ہامی بھر لے گا۔ اتنے تو بس ایک موہوم سی امید پر ہر طرف سے مایوس ہو کر اس سے بات کی تھی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اس معاملے میں اس کی مدد کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اگلے دن وہ ہاسٹل گئی تھی اور واقعی اسے ہاسٹل میں جگہ مل گئی تھی۔ اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی۔

”کو میل! مجھے تو واقعی ہاسٹل میں جگہ مل گئی۔“ دوسرے دن وہ موہب کے ساتھ

بتانے لگی تھی۔

”پلیز آپ ان سے میرے روپے لے دیں۔ مجھے یہاں سے شاہدہ جانا ہے اور میرے پاس بس وہی روپے تھے۔ میں پیدل کیسے جاؤں گی۔ مجھے تو راستہ بھی صحیح پتہ نہیں۔ پلیز اگر سارے نہیں تو ان سے بیس روپے ہی لے دیں۔“

اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی سے کو میل کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ ”پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کو جتنے روپے چاہئیں، آپ مجھ سے لے لیں۔“

اس نے اپنا والٹ نکال لیا تھا۔ وہ جیسے کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی تھی۔

”نہیں۔ مجھے آپ سے روپے نہیں چاہئیں۔ میں اس لئے نہیں آئی تھی آپ مجھے ان سے روپے لے کر دیں۔“

وہ والٹ کھولتے کھولتے رک گیا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے کہا۔

”اوکے پھر آپ یہیں ٹھہریں۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ ثانیہ کے چہرے پر رونق آگئی تھی۔ وہ وہاں سے چلا گیا تھا تقریباً دس منٹ بعد وہ واپس آیا تھا۔

”یہ لیں اور آئندہ کچھ سوچ کر کسی کو روپے دیا کریں۔“

اس نے پچاس کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ ثانیہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر لہرائی تھی۔

”اس نے اتنی جلدی واپس کر دیئے۔“ اس نے کو میل کے ہاتھ سے روپے لیتے ہوئے بڑے جوش کے عالم میں کہا تھا۔

”ہاں مگر اب کسی اور کو مت کہنا یہ سب کیونکہ وہ سب کے روپے تو نہیں لوٹائے گا۔“ کو میل جاتے جاتے اسے تاکید کرنے لگا تھا۔

”نہیں میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے چلا گیا تھا۔ وہ بھی تیز تیز قدموں سے پوائنٹ کی طرف آگئی۔

کو میل نے اسے روپے اپنے پاس سے ہی دیئے تھے کیونکہ وہ پچاس روپے واپس لینے کے لئے اسد کے پاس تو نہیں جاسکتا تھا۔ اب اسے خیال آیا تھا کہ اسے پہلے ہی ثانیہ کو اس پلان کے بارے میں بتا دینا چاہئے تھا جو فائل ایئر نے بنایا تھا۔ اگرچہ وہ اس پلان میں شامل نہیں تھا لیکن اس کو اس پورے پلان کا اچھی طرح پتا تھا۔

اس دن وہ صبح ڈپارٹمنٹ کی طرف جا رہا تھا کہ وہ شناسا آواز اسے ایک بار پھر

ڈپارٹمنٹ کی سیڑھیوں میں بیٹھا ہوا تھا جب وہ اس کے سر پر آن کھڑی ہوئی۔ کوئیل نے کن اکیوں سے موہد کو دیکھا جو بڑی سرد مہری سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔

”ہاسٹل میں کمرہ لینا کوئی بہت مشکل کام بھی نہیں ہے۔“ اس نے موہد سے نظریں چراتے ہوئے ثانیہ سے کہا۔

”میرے لئے تو بہت مشکل تھا۔ میری تو کوئی بات ہی نہیں سنتا تھا وہاں۔“ وہ بے حد تشکر آمیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

”چلیں خیر۔ آپ کا کام تو ہو گیا۔“

”ہاں اور میں آپ کا بہت شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ آپ.....“

کوئیل نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اس آل رائٹ۔ شکریہ کی ضرورت نہیں۔“ وہ مسکراہٹ چہرے پر لئے وہاں سے چلی گئی تھی۔

”میرا خیال ہے اب کلاس میں چلنا چاہئے تیل ہونے والی ہے۔“ کوئیل نے گھڑی دیکھتے ہوئے موہد سے کہا تھا۔

”تم نے اسے ہاسٹل میں کمرہ لے کر دیا ہے؟“ موہد نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے بڑے تیکھے انداز میں سوال کیا تھا۔

”ہاں۔“

”کیوں؟“ موہد کا لہجہ اس بار بھی کھردرا تھا۔

”کیوں کیا یارا! وہ پریشان تھی۔ اسے ہاسٹل میں جگہ نہیں مل پارہی تھی۔ تمہیں پتا ہے، وہاں سفارش کے بغیر جگہ نہیں ملتی اور وہ میں نے کروا دی۔ ظاہر ہے، وہ بے چاری سرگودھا سے آئی ہے۔ یہاں کون ہے جو اس کی مدد کرے۔“

کوئیل نے کافی لاپرواہی سے وضاحت کی تھی۔ اس کا خیال تھا موہد دوبارہ سوال نہیں کرے گا مگر موہد نے کچھ دیر تک بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھنے کے بعد کہا تھا۔

Komail aren't you getting too philanthropic now a days?

(کوئیل! تم آج کل کچھ زیادہ ہی ہمدرد نہیں ہوتے جا رہے ہو؟)

وہ موہد کے سوال پر ساکت ہو گیا تھا۔

“What made your think that?”

(اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟)

اس نے کچھ تیز آواز میں اسے کہا تھا۔

“Aren't you getting too far to help her? I mean its not your style.”

(تم اس کی کچھ زیادہ ہی مدد نہیں کر رہے ہو، میرا مطلب ہے کہ یہ تمہارا اسٹائل نہیں ہے۔)

”میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا اور نہ تمہیں ایسی بات کہنے کا کوئی

حق ہے۔“ وہ اکھڑے لہجے میں کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”دیکھو کوئیل.....“ موہد نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر کوئیل نے بڑی درشتی سے اس

کی بات کاٹی تھی۔ ”میں کچھ دیکھنا نہیں چاہتا۔“

You just keep your mouth shut.

(تمہیں اپنی زبان بند رکھنا چاہئے)

موہد حیرانی سے اسے جاتے دیکھتا رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اتنی معمولی سی بات پر

یوں ہتھے سے اکھڑ گیا تھا۔ وہ کافی دیر تک ہونٹ پیچھے وہیں کھڑا رہا پھر وہ بھی کلاس میں چلا گیا۔

دونوں کے درمیان کون سا رابطہ تھا۔ یہ شاید وہ اور ثانیہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔

بس یہ تھا کہ ثانیہ کو جب بھی کسی معاملے میں کوئی مشکل پیش آتی وہ کسی رو بوٹ کی طرح اس

کے پاس چلی آتی اور کوئیل حیدر جو کبھی کسی کی مدد نہیں کرتا تھا وہ کسی معمول کی طرح وہی کرتا جو

وہ چاہتی۔

موہد نے اس واقعہ کے بعد دوبارہ کوئیل سے ثانیہ کے سلسلے میں بات نہیں کی تھی۔

مگر اسے اب بھی یہ ”فلاح عامہ“ کا کام بے حد ناپسند تھا اور نہ صرف موہد بلکہ اشعر اور ولید کو

بھی حیرت ہوتی تھی کہ کوئیل کیوں اس طرح اس لڑکی مدد کر رہا ہے اور سب سے زیادہ حیرت

انہیں تب ہوتی تھی جب ایک دن ثانیہ نے اس کے سامنے کوئیل سے پر پولیس کے اس کے تیار

کردہ نوٹس مانگے تھے اور کوئیل نے نہ صرف نوٹس دینے کی فوراً ہامی بھری تھی بلکہ دوسرے دن

ہی وہ اپنی پوری فائل فوٹو اسٹیٹ کروا کے لیے آیا تھا۔

”تم دیکھ لینا کوئیل! کچھ دنوں بعد تمہارے یہ نوٹس پارٹ ون کے ہر دوسرے

اسٹوڈنٹ کے پاس ہوں گے کیونکہ جن محترمہ کو تم یہ نوٹس دیتے جا رہے ہو، وہ صرف بے

وقوف نہیں بلکہ عقل سے بالکل پیدل ہیں۔“

موہد نے اسے سمجھانے کی پہلی اور آخری کوشش کی تھی مگر اس پر اثر نہیں ہوا تھا۔

”نہیں۔ میں اسے سمجھا دوں گا وہ کسی اور کو نہیں دے گی۔“

کوئیل نے اس کی نصیحت کو سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا تھا۔ موہد کی پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی تھی۔ چند دنوں کے اندر ہی تقریباً پوری کلاس کے پاس وہ نوٹس تھے۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ کوئیل حیدر کے نوٹس یوں سر عام آئے تھے۔

”مبارک ہو بھئی، بڑے مقبول ہو رہے ہیں تمہارے نوٹس، پارٹ دن کے اسٹوڈنٹس میں۔“

وہ اس دن موہد کے طنز پر خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔ موڈ اس کا پہلے ہی سے خراب تھا۔ کیونکہ اس نے خود بھی اس دن ایک دو لڑکوں کے ہاتھ میں اپنے نوٹس کی فوٹو کاپیز دیکھی تھیں۔

”تم سے میں نے کہا تھا کہ یہ نوٹس کسی اور کو مت دینا اور تم نے پورے ڈپارٹمنٹ میں انہیں رڈی کی طرح پھیلا دیا ہے۔“

اس دن وہ ثانیہ کو دیکھتے ہی اس پر برس پڑا تھا۔

”میں نے سب لوگوں کو نہیں دیئے۔ میں نے صرف اپنی روم میٹ کو دیئے تھے۔ باقی لوگوں تک نوٹس کیسے پہنچے مجھے معلوم نہیں۔“ وہ خود خاصی شرمندہ تھی۔

”روم میٹ کو بھی کیوں دیئے تھے۔ میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ کسی کو بھی مت دینا۔“ اس کا غصہ اور بڑھ گیا تھا۔

”اس نے خود مجھ سے مانگے تھے پھر میں انکار کیسے کرتی۔“ ثانیہ نے بے بسی سے کہا تھا۔

”ایک بات تو طے ہے کہ میں نے پہلی اور آخری دفعہ تمہیں نوٹس دیئے ہیں، اب دوبارہ تم مجھ سے اس سلسلے میں کسی قسم کی مدد کی امید نہ رکھنا۔“ اسے ثانیہ کی شکل اور جھکا ہوا سر دیکھ کر زحرید غصہ آ رہا تھا۔

”میں وعدہ کرتی ہوں، میں آئندہ کبھی کسی کو بھی نہیں دوں گی۔“ اس نے ملتجیانہ انداز میں کہا تھا۔

”آئندہ میں نوٹس دوں گا، تب ہی کسی کو دوں گی نا۔“ وہ رکھائی سے کہہ کر چلا گیا تھا۔ لیکن کوئیل کا یہ فیصلہ ریت کی لکیر کی طرح ثابت ہوا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد ثانیہ کو پھر کچھ نوٹس کی ضرورت آن پڑی تھی اور حسب عادت پھر اسی کے پاس آئی تھی اور کوئیل اپنے حتیٰ فیصلے کے باوجود پھر اسے نوٹس دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔

اس بار ثانیہ نے کچھ احتیاط کی تھی اور ان نوٹس کو چھپا کر ہی رکھا تھا۔

”کوئیل میرے بابا آئے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آئیں، میں آپ کو ان سے ملواؤں۔“

اس دن وہ پھر اپنے دوستوں کے کیفے ٹیریا میں بیٹھا ہوا تھا جب وہ بہت پر جوش سی اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں آئی تھی۔ کوئیل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ صورت حال اس کے لئے کافی آکورد تھی۔ لیکن پھر وہ دوستوں کی جھکی اور چھتی ہوئی نظروں کی پردا کے بغیر اس کے ساتھ چلا گیا تھا۔

”لو بھئی، اب ابا جی بھی پہنچ گئے ہیں۔ بس ان ہی کی انٹری رہ گئی تھی۔“ اشعر نے اس کے جاتے ہی کہا تھا۔

”کوئیل ایسا تو نہیں تھا یا! اسے ہو کیا گیا ہے۔ تمہیں یاد ہے، وہ کس طرح شروع سے لڑکیوں سے بدکتا رہا ہے اور اب تم ذرا اس کا حال دیکھو۔ ثانیہ کو دیکھتے ہی کیسے اس کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔“ ولید کوچھ معنوں میں اس کی فکر ہونے لگی تھی۔

”بس یا! اب صورت حال قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہے، ہمیں اسے سمجھانا چاہئے، بات کرنی چاہئے اس سے، وہ جو کچھ کر رہا ہے ٹھیک نہیں کر رہا۔“

اشعر نے ان دونوں سے کہا تھا۔

”تمہیں اگر انسلٹ کر دانے کا شوق ہے تو ضرور اس سے بات کرو مگر مجھے ایسا کوئی شوق نہیں۔ وہ کوئی بلبل کا بچہ نہیں ہے کہ جو کچھ کر رہا ہے، اس کے نتیجے سے واقف ہی نہ ہو لیکن اگر وہ پھر بھی یوں بے پرواہ ہے تو ٹھیک ہے ہمیں اس کے ذاتی معاملات سے کیا۔“

موہد نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ اشعر اور ولید نے ایک دوسرے کو دیکھا اور خاموش ہو گئے۔

”بابا! یہ کوئیل ہیں۔“ وہ اسے بڑے جوش کے عالم میں ایک ادھیڑ عمر شخص کے پاس لے کر آئی تھی۔ کوئیل نے جھینپتے ہوئے اس آدمی سے ہاتھ ملایا۔

”میں آپ کا شکر یہ ادا کرنے آیا ہوں۔ ثانیہ مجھے بتایا تھا کہ آپ اس کی بہت مدد کرتے رہتے ہیں۔“ اس شخص نے انکساری سے کہا۔ کوئیل کچھ اور جھینپ گیا۔

”نہیں۔ میں نے ایسی بھی کوئی خاص مدد نہیں کی۔ یہ تو بہت معمولی سے کام تھے، کوئی بھی کر دیتا۔“

”پھر بھی بیٹا! میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ نے.....“

کوئیل نے ثانیہ کے باپ کی بات کاٹ دی۔ ”پلیز آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا آپ کا یہ سب کہنا۔“

کوئیل نے یہ بات کہہ کر موضوع بدل دیا کچھ دیر وہ ان سے باتیں کرتا رہا، اور پھر اجازت لے کر واپس کیفے میرا آ گیا۔

اس دن وہ یونیورسٹی کے لان میں بیٹھی کچھ نوٹس دیکھنے میں مصروف تھی جب ہیلوکی آواز پر اس نے سر اٹھایا تھا۔ لائٹ بلو جینز میں لمبوس ایک لڑکی چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ لئے اس کے پاس کھڑی تھی۔

”میرا نام رودابہ ہے۔ میں فائل ایئر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ ہاسٹل میں رہتی ہوں۔“

اس لڑکی نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ ثانیہ نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔

”میرا نام ثانیہ ہے میں پریویس کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ میں بھی ہاسٹل میں رہتی ہوں۔“ اس نے کچھ جھجھکتے ہوئے اپنا تعارف کر دیا تھا۔

”میں جانتی ہوں۔ میں نے کئی بار ہاسٹل میں تمہیں دیکھا ہے۔“

رودابہ یہ کہتے ہوئے بے تکلفی سے اس کے پاس گھاس پر بیٹھ گئی۔ ثانیہ کچھ نروس سی ہو گئی۔ اس کی نظر میں رودابہ کے چہرے پر جچی ہوئی تھیں۔ سفید شرٹ اور بلو جینز میں لمبوس اسٹپس میں کئے ہوئے کھلے بالوں کے ساتھ وہ ایک قیامت لگ رہی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ رودابہ کا چہرہ ثانیہ کے لئے نیا تھا وہ پورے ڈپارٹمنٹ میں اپنی خوبصورتی اور دولت کی وجہ سے مشہور تھی اور اس وقت جہاں ثانیہ نروس ہو رہی تھی، وہاں اس کو عجیب قسم کے تفاخر کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ رودابہ کچھ دیر تک اس سے اس کے بارے میں پوچھتی رہی اور ساتھ ساتھ اپنے بارے میں بتاتی رہی پھر یک دم اس نے پوچھا۔

”ثانیہ! کوئیل سے تمہاری کوئی رشتہ داری ہے؟“

ثانیہ نے بے ساختگی سے جواب دیا۔ ”نہیں تو۔“

”تو پھر کیا دوستی ہے؟“ رودابہ نے فوراً ہی دوسرا سوال کیا تھا۔

”جانتی نہیں۔ اسے دوستی کہتے ہیں یا نہیں۔ بس یہ ہے کہ مجھے کبھی کوئی مشکل پیش آتی ہے تو میں کوئیل سے کہہ دیتی ہوں اور وہ میرا کام کر دیتے ہیں۔“ ثانیہ نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

رودابہ نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”یار! دوستی اور کس کو کہتے ہیں۔ ویسے ایک بات ہے۔ اس نے کبھی کسی کا کام کیا نہیں۔ اس معاملے میں بلکہ ہر معاملے میں وہ خاصا بے مروت

ہے۔“ رودابہ نے کچھ عجیب سے انداز میں کہا تھا۔

”نہیں تو، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں تو جب بھی ان کے پاس جاتی ہوں وہ میرا کام فوراً کر دیتے ہیں۔ اگر آپ بھی جائیں تو آپ کا بھی کر دیں گے۔ وہ تو بہت ناکس ہیں۔“

ثانیہ نے فوراً اس کی صفائی پیش کی۔

”اچھا چلو۔ کبھی آزمائیں گے تمہاری بات کو۔“

اس کے چہرے پر نظر جمائے رودابہ نے ٹھہر ٹھہر کر کہا تھا کچھ دیر اس کے پاس رکنے کے بعد وہ چلی گئی تھی وہ رودابہ کے ساتھ اس کی پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ رودابہ اس کے بعد بھی اس کے ساتھ ملتی رہی تھی اور ان کی بے تکلفی بڑھتی گئی تھی کہ رودابہ نے اسے ہاسٹل میں اپنے کمرے میں شفٹ ہونے کی پیش کش کی جو ثانیہ نے اعزاز سمجھ کر قبول کر لی۔

رودابہ کا گھر لاہور ہی میں تھا اور وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے والد مرچنٹ نیوی سے وابستہ تھے اور اس وجہ سے زیادہ تر ملک سے باہر ہی ہوتے تھے، امی سوشل ورک میں اتنی مصروف رہتی تھیں کہ بہت کم گھر پر ہوتی تھیں۔ رودابہ نے اسی تنہائی سے گھبرا کر ہوسٹل میں کمرہ لے لیا تھا اور ثانیہ کو اس کی تنہائی کا جان کر اس سے اور بھی ہمدردی ہو گئی تھی۔

رودابہ سے اس کی بڑھتی ہوئی دوستی کوئیل سے پیشیدہ نہ رہ سکی۔

”ثانیہ! تم آج کل رودابہ کے ساتھ اتنا کیوں رہنے لگی ہو؟“ اس دن لائبریری کی طرف جاتے ہوئے کوئیل نے اسے روک کر پوچھ لیا تھا۔

”میری اور رودابہ کی دوستی ہو گئی ہے اور میں ہاسٹل میں بھی اس کے کمرے میں شفٹ ہو گئی ہوں۔“ ثانیہ نے فخریہ انداز میں بتایا تھا لیکن کوئیل کا رد عمل کوئی زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔

”کیوں؟“

”رودابہ نے خود مجھے اپنے کمرے میں شفٹ ہو۔ نہ کے لئے کہا ہے۔“

وہ کچھ اٹھے ہوئے انداز میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

”دیکھو ثانیہ! تمہارا اور رودابہ کا کوئی بیچ نہیں ہے۔ تم دونوں کے درمیان کچھ بھی کامن نہیں ہے، رودابہ جیسی لڑکیاں بغیر کسی مقصد کے ایسے ہی دوستی نہیں کرتی ہیں۔ بہتر ہے کہ تم اس سے دور رہو۔“

چند لمحوں بعد کوئیل نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن ثانیہ کو اس کی بات بری لگی۔

”وہ میری بیسٹ فرینڈ ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔“ اس نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ اس کا مشورہ قبول نہیں کرے گی۔

کوئیل کچھ دیر خشکی سے اسے دیکھتا رہا اور پھر اسی موڈ میں وہاں سے چلا گیا۔ ثانیہ کو اس کی ناراضگی یا خشکی کی قطعاً پروا نہ تھی بلکہ وہ خود بھی اس سے کھنچ گئی۔ اب جہاں بھی کوئیل سے اس کا سامنا ہوتا، وہ پہلے کی طرح اس سے سلام دعا کرنے کے بجائے نظریں جھکائے اس کے پاس سے گزر جاتی۔ کچھ تک کوئیل بھی اسے نظر انداز کرتا رہا لیکن پھر وہ رہ نہیں سکا۔

”ہم ابھی تک ناراض ہو مجھ سے؟“ ایک ہفتے کے بعد اس دن گزرتے گزرتے کوئیل نے اس سے پوچھ لیا تھا۔
 ثانیہ نے کچھ ندامت محسوس کی۔ ”نہیں۔ میں ناراض تو نہیں ہوں۔“ اس کی ناراضگی فوراً ختم ہو گئی۔

کوئیل نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”بہر حال میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں آئندہ تمہیں کوئی مشورہ نہیں دوں گا۔“

”میں نے یہ کب کہا ہے کہ مجھے مشورہ نہ دیں۔ بس رودابہ کے بارے میں کچھ نہ کہیں وہ میری بیسٹ فرینڈ بن چکی ہے۔“ ثانیہ نے کچھ بے چین ہو کر کہا تھا۔ اسے بے اختیار اس کی نوازشات یاد آ گئی تھیں۔

”میں دعا کروں گا کہ تمہاری بہترین دوست تمہاری بدترین دوست ثابت نہ ہو۔ خیر اسٹڈیز کیسی جارہی ہیں؟“

کوئیل نے موضوع بدل دیا، اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اب رودابہ کے بارے میں اس سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ مگر اس کا یہ فیصلہ پانی پر لکیر ثابت ہوا۔ تیسرے دن ہی اس نے ثانیہ کو رودابہ کے ساتھ کلاس چھوڑ کر یونیورسٹی سے جاتے دیکھ لیا تھا اور پھر ایسا ایک دن نہیں ہوا تھا۔ ثانیہ، رودابہ اور اس کی دوسری فرینڈز کے ساتھ اکثر کلاسز سس کرنے لگی تھی۔ کچھ دن تو وہ بڑے تحمل سے یہ سب برداشت کرتا رہا لیکن پھر یہ سب اس کی برداشت سے باہر ہو گیا۔

اس دن اس نے ثانیہ کو رودابہ کے ساتھ ڈپارٹمنٹ کی سیزرھیاں اترتے دیکھا تو اس نے ثانیہ کو روک لیا۔

”ثانیہ! تمہاری ڈرامہ کی کلاس ہونے والی ہے تم کہاں جارہی ہو؟“

اس نے بغیر کسی لحاظ کے اس سے کہہ دیا تھا۔ ثانیہ کچھ گڑبڑا گئی۔

”وہ میں..... میں..... میں کام سے جارہی ہوں۔“ اس نے بہانا تراشا تھا۔

”کیا کام ہے؟“ کوئیل نے سرد لہجے میں کہا تھا۔ ثانیہ کا باقی ماندہ رنگ بھی فنی ہو گیا۔ اس نے بے بسی سے رودابہ کو دیکھا جو عجیب سے انداز میں کوئیل پر نظریں مرکوز کیے کھڑی تھی۔

”جہمیں جو کام بھی ہے۔ وہ واپس جانے کے بعد بھی کیا جاسکتا ہے لیکن اس طرح کلاس چھوڑ کر جانا اور پھر بار بار ایسا کرنا کوئی مناسب بات نہیں ہے۔ ویسے بھی تم کوئی اتنی ذہین ہو بھی نہیں کہ کلاس اینڈ کیے بغیر بھی پڑھ سکو اس لئے واپس کلاس میں جاؤ۔“

ثانیہ نے سر جھکائے ہوئے بغیر کسی مداخلت کے اس کی بات سنی تھی۔

”مجھے ایک ضروری کام ہے، اس لئے مجھے اس طرح جانا پڑ رہا ہے۔“ اس بار رودابہ بول اٹھی تھی۔

”تو آپ جائیں۔ میں نے آپ کو تو نہیں روکا۔“ کوئیل نے کمال درجے کی بے نیازی سے کہا تھا۔

”ثانیہ میرے ساتھ جارہی ہے۔“ رودابہ کے چہرے کا رنگ کچھ بدل گیا تھا۔

”نہیں۔ ثانیہ آپ کے ساتھ نہیں جارہی۔ وہ کلاس میں جائے گی۔ ثانیہ! تم کلاس میں جاؤ۔“

کوئیل نے ثانیہ سے کچھ سختی سے کہا تھا۔

وہ کچھ خجالت آمیز نظروں سے رودابہ کو دیکھنے لگی جو اس کو گھور رہی تھی۔ اسی وقت نیل ہونے لگی تھی۔ کوئیل نے کچھ کہے بغیر ہاتھ کے اشارے سے ثانیہ کو دانا جانے کو کہا تھا اور وہ بے چارگی سے رودابہ سے نظریں چراتے ہوئے واپس برآمدے کی سیزرھیاں چڑھنے لگی تھی۔ کوئیل بھی اس کے پیچھے چلا گیا تھا۔ رودابہ وہیں کھڑی سرخ چہرے کے ساتھ اس کی پشت کو گھورتی رہی۔

کوئیل نے اسے صرف وہیں نہیں روکا تھا بلکہ بعد میں بھی خاصی ڈانٹ ڈپٹ کی تھی۔ ثانیہ نے اس سے جھوٹ بولنے کی کوشش کی مگر اس کے پاس پوری معلومات تھیں کہ وہ پچھلے ہفتے میں کس کس دن کون سی کلاسز چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ثانیہ اس سے کچھ خائف ہو گئی۔

اسے یہ بھی پتا تھا کہ وہ اسے جس بات سے منع کر رہا ہے وہ واقعی غلط ہے اور اس طرح اس کی اسٹڈیز کا بھی حرج ہو رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ آئندہ کلاس چھوڑ کر

نہیں جائے گی۔ اس دن ہاسٹل واپسی پر اسے توقع تھی کہ رودابہ کا موڈ خراب ہوگا اور وہ اس سے ناراض ہوگی مگر خلاف توقع وہ خوشگوار موڈ میں تھی اور اس نے اس بات کا ذکر نہیں کیا ثانیہ نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

”ثانیہ! کل شام مجھے کنسرٹ پر جانا ہے۔ تم چلو گی؟“ چند دن گزر جانے کے بعد ایک دن دوابہ نے اس سے کہا تھا۔

ثانیہ بے تابئی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”ہاں ضرور چلوں گی لیکن وارڈن شام کو باہر جانے کی اجازت دیں گی؟“

”وہ میرا مسئلہ ہے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ ساتھ چلو گی یا نہیں؟“ رودابہ نے بالوں میں برش کرتے ہوئے لاپرواہی سے کہا تھا۔

”ہاں بھئی، جاؤں گی۔ ضرور جاؤں گی۔ اس میں پوچھنے والی کون سی بات ہے۔“ اس نے پر جوش انداز میں کہا تھا۔ رودابہ نے دوسرے دن واقعی بڑی آسانی سے وارڈن سے اجازت لے لی تھی۔

”تم اس قدر خوبصورت ہو ثانیہ! کہ اگر اچھی طرح میک اپ کیے رکھو تو پتا نہیں کتنوں کے دل گھائل کر دیں گے۔“

وہ کپڑے بدل کر آئی تو رودابہ اس کا میک اپ کرنے لگی۔ اس نے میک اپ کرنے کے بعد ثانیہ کو آئینے کے سامنے کر دیا۔ پہلی نظر میں ثانیہ خود کو پہچان ہی نہیں سکی۔

”رودابہ! میں تو واقعی بہت اچھی لگ رہی ہوں۔“ وہ خود کو سراہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ ”اچھی نہیں، کہو، میں پری لگ رہی ہوں پری۔“ رودابہ نے اسے پیار سے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

ثانیہ کچھ جھینپ گئی۔ اس نے تیار ہونے کے بعد حسب معمول اوڑھنے کے لئے چادر اٹھائی مگر رودابہ چیل کی طرح اس پر چھٹی۔

”خدا کا خوف کرو ثانیہ! یہ برقع نما چادر پہن کر تم کنسرٹ دیکھنے جاؤ گی۔ تم اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی تماشا بناؤ گی۔ میں نے جینز پہنی ہوئی ہے اور تم یہ دس گز لمبا تھان لپیٹ رہی ہو۔“ رودابہ نے چادر اس سے چھین کر اپنی الماری میں ٹھونس دی۔

”تو پھر میں کیا اوڑھوں؟“ وہ کچھ جھینپ گئی تھی۔ ”دوپٹہ کافی ہے گلے میں۔ اب ان لمبی لمبی چادروں سے جان چھڑالو۔ اب تم

لاہور میں ہو۔ کسی گاؤں میں نہیں اور نہ ہی تم کہیں تو امی سننے جا رہی ہو۔“

رودابہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا اور پھر ثانیہ نے دیباہی کیا تھا جیسا رودابہ چاہتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ یوں دوپٹے سینے پر پھیلائے اتنا ڈارک میک اپ کر کے کہیں گئی تھی اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ہر شخص اسی پر نظریں گاڑے بیٹھا ہو۔

کنسرٹ گیارہ بجے ختم ہوا تھا اور وہ رودابہ کے ساتھ اوپن ایئر تھیٹر سے باہر نکل تھی تب ہی رودابہ کو کوئی نظر آیا۔

”ثانیہ! تم ایک منٹ یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ اسے وہیں کھڑا کر کے غائب ہو گئی۔

ثانیہ پریشان ہو گئی تھی۔ لوگ بڑی تعداد میں اوپن ایئر تھیٹر سے نکل رہے تھے اور لڑکے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے بیٹھیاں بجا کر گھنٹیاں بجاتے رہے تھے اور رودابہ گدھے کے سر سے سینک کی طرح غائب تھی۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے۔

”ثانیہ! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ بہت حیرت سے کسی نے اسے دیکھ کر کہا تھا۔ وہ اس شہنشاہ آواز پر بے اختیار مڑی تھی۔ وہ کوئیل تھا۔ اسے لگا، کسی نے اسے ڈوبتے ڈوبتے بچا لیا ہو۔

”میں رودابہ کے ساتھ آئی تھی۔ وہ پتا نہیں کہاں چلی گئی ہے؟“ اس نے کہا تھا۔ ”تمہیں اجازت کیسے دے دی ہے وارڈن نے اتنی دیر باہر رہنے کی۔“

ثانیہ کو اس کے چہرے کے تاثرات بے حد عجیب لگ رہے تھے۔ وہ کچھ بول نہیں سکی۔ ”تمہاری چادر کہاں ہے؟“ وہ اس سوال پر زمین میں گڑ گئی تھی۔

”اور اتنا ڈارک میک اپ کیوں کیا ہے تم نے؟ تمہیں پتا ہے یہاں کس طرح کے لڑکے آئے ہوئے ہیں۔“

”ثانیہ کی آنکھیں دھندلا گئیں وہ وہاں سے چل پڑا تھا۔ ثانیہ وہیں کھڑی رہی۔ کوئیل نے چند قدم چلنے کے بعد مڑ کر دیکھا اور پھر واپس آیا۔

”اب تم یہاں فریڈ کیوں ہو چلو میرے ساتھ۔“ اس کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔ ”رودابہ کا انتظار.....“

کوئیل نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اس کا نام بھی مت لو میرے سامنے۔ میرے ساتھ چلو۔“ وہ یہ کہہ کر پھر چل پڑا تھا۔ ثانیہ نے جھردی کی۔ وہ سیدھا

کار پارکنگ میں آیا تھا لیکن گاڑی میں بیٹھنے کے بجائے وہ گاڑی کے پاس کھڑا ہو گیا۔

”تم دوپٹہ لوسر پر۔“ اس نے ترشی سے اس سے کہا تھا۔ اس نے دوپٹہ سر پر اڑھ لیا تھا۔

”میں موہد کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ اپنی بہن اور بھابھی کے ساتھ آیا ہوا ہے۔ میں تمہیں ان کے ساتھ بھجواؤں گا کیونکہ یہ تمہارے لئے مناسب نہیں ہوگا کہ تمہیں اکیلا ہاسٹل چھوڑنے جاؤں۔“ اس نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

”لیکن ثانیہ! آئندہ اس طرح کبھی بھی کنسرٹ دیکھنے مت آنا۔ تمہیں میوزک کا شوق ہے تو کیسٹ پلیئر پر سنو۔ اتنا کافی ہے تمہارے لئے۔“ اس بار اس کا لہجہ پہلے جتنا سخت نہیں تھا۔

”میرے پاس کیسٹ پلیئر نہیں ہے اور پھر کنسرٹ پر جانے سے کیا ہوتا ہے۔ آپ بھی تو یہاں آئے.....“ ثانیہ نے کچھ ہمت کر کے اس سے کہنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی تھی۔

”تم میرے یہاں آنے کی بات نہ کرو۔ میں جہاں چاہے جا سکتا ہوں۔ میں مرد ہوں، لیکن تم اس طرح رات کو باہر نکلنے کی حماقت دوبارہ مت کرنا۔“ اس کا لہجہ ایک بار پھر ترش ہو گیا تھا۔

”مگر رودابہ بھی تو جاتی ہے۔“ وہ پھر منمنائی تھی۔

”رودابہ جائے بھاڑ میں۔ تم رودابہ ہو، نہ رودابہ بننے کی کوشش کرو۔ وہ اس طرح پھرنا انورڈ کر سکتی ہے۔ تم نہیں کر سکتیں۔ ذرا تصور کرو، میری جگہ اگر تمہارے فادر تمہیں یہاں دیکھتے تو..... ثانیہ! تم یہاں پڑھنے کے لئے آئی ہو صرف وہی کام کرو۔ اس طرح پھرنا تمہارے لئے مناسب نہیں ہے۔“

وہ سختی سے بات کرتے کرتے اچانک نرم ہو گیا تھا۔ وہ کچھ شرمندگی سے اس کی باتیں سنتی رہی، چند منٹوں بعد موہد آ گیا تھا۔ اس نے کچھ حیرانی سے ثانیہ کو دیکھا تھا۔ مگر کونسل نے عام سے انداز میں اسے ثانیہ کو ہاسٹل ڈراپ کرنے کے لئے کہا تھا۔

”بھابھی! آپ پلیئر ثانیہ کو ہاسٹل کے اندر چھوڑ کر آئیے گا۔ ہو سکتا ہے، وارڈن کچھ ناراض ہو کیونکہ کافی دیر ہو گئی ہے۔“

اس نے موہد کی بھابھی سے درخواست کی تھی جو انہوں نے بعد خوشی مان لی تھی۔ وارڈن واقعی ناراض تھی کیونکہ وہ رودابہ کے ساتھ گئی تھی اور رودابہ اس کے آنے سے کچھ دیر پہلے واپس آ چکی تھی۔ موہد کی بھابھی نے وارڈن سے بہانا بنا دیا تھا کہ انہوں نے

زبردستی اسے اپنے پاس بٹھالیا تھا اور اسی وجہ سے اسے واپس آنے میں دیر ہو گئی۔

”کمال ہے یار! تم کہاں گم ہو گئی تھیں۔ تمہیں پتا ہی نہیں، میں پاگلوں کی طرح تمہیں ڈھونڈتی رہی ہوں۔“

ثانیہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی رودابہ نے بلند آواز سے کہا۔ وہ بستر پر بڑے آرام سے نیم دراز تھی۔

ثانیہ نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا مگر کچھ بولی نہیں بلکہ اپنے کپڑے اٹھا کر ہاتھ روم میں چھینچ کرنے کے لئے چلی گئی۔ مگر اس کی ناراضگی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی تھی۔

رودابہ نے ایسے عذر پیش کیے تھے کہ اس کی خشکی دور ہو گئی تھی۔ اسے ویسے بھی لمبی چوڑی ناراضگیاں پالنے کی عادت نہیں تھی۔ یہ کام اسے بہت مشکل لگتا تھا اور پھر رودابہ سے تو اس کو دیے بھی بہت محبت تھی۔

اگلے دن وہ پھر صبح رودابہ کے ساتھ ہی یونیورسٹی گئی تھی۔ خلاف توقع دوسرے پیریڈ کے بعد جب وہ رودابہ کے ساتھ بیٹھنے کے لئے لان میں آئی تھی تو وہاں رودابہ کے ساتھ کونسل بھی موجود تھا اور ان دونوں کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہے۔ کونسل کا چہرہ سرخ تھا اور رودابہ کے ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے۔ اسے آتا دیکھ کر کونسل خاموش ہو گیا اور اس کے قریب آنے سے پہلے ہی چلا گیا۔

وہ کچھ تشویش سے رودابہ کے پاس آئی تھی اتنا اندازہ تو اسے ہو ہی گیا تھا کہ موضوع گفتگو یقیناً وہ ہی ہوگی مگر اس کے قریب آنے پر رودابہ کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے وہ ثانیہ کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔ ثانیہ کو کچھ حوصلہ ہوا۔

”کیا کوئی جھگڑا ہو گیا ہے کونسل سے؟“ اس نے رودابہ کے قریب بیٹھتے ہوئے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

”کیسا جھگڑا؟ ایسے فالٹو کاموں کے لئے میرے پاس وقت نہیں۔ وہ تو ویسے ہی بس..... خیر چھوڑو۔ کوئی اور بات کرو۔“ اس نے کچھ عجیب سے انداز میں بات کا موضوع بدلا تھا۔ دو بجے وہ رودابہ کے ساتھ ہی ہاسٹل میں واپس آئی تھی اور وہاں ایک سر پرانز اس کا منتظر تھا۔

”یہ جی صبح کوئی دس بجے کے قریب ایک صاحب دے گئے تھے آپ کے لئے۔“

کونسل حیدر نام تھا ان کا۔

اس کے اور رودابہ کے ہاسٹل آنے کے دس پندرہ منٹ بعد ہاسٹل کی ملازماؤں میں

ہے۔“ وہ اس کی بات پر غور کیے بغیر بولی تھی۔

”میں ہر سال اسٹیر یو بدل لیتا ہوں۔ اس لئے میرا پرانا اسٹیر یو بھی نیا ہی لگتا ہے اور وہ اتنا قیمتی نہیں ہے جتنا تم سوچ رہی ہو۔ رودابہ کو چھوڑو اسے عادت ہے ہر چیز کی قیمت بڑھانے کی۔“ وہ اب بھی بڑی بے نیازی سے بات کر رہا تھا۔

”لیکن میں پھر بھی.....“

کوئیل نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”بس اب اسٹیر یو کے بارے میں کچھ مت کہنا۔ تم ایسا کرو کہ مجھے قسطوں میں اس کے روپے لوٹا دینا یا جب دو سال بعد ہاسٹل سے جاؤ تو مجھے واپس دے جانا لیکن ابھی اسے اپنے پاس ہی رکھو۔“ کوئیل اس کی مزید کوئی بات سننے بغیر چلا گیا تھا۔

”مجھے بتاؤ رودابہ! میں کیا کروں۔ وہ تو اسٹیر یو واپس لینے پر تیار نہیں۔“

ہاسٹل واپسی پر وہ ایک بار پھر رودابہ کو کوئیل کے ساتھ ہونے والی گفتگو بتا رہی تھی۔

”میں کیا کہہ سکتی ہوں یہ تمہارا اور اس کا مسئلہ ہے؟“ رودابہ نے کچھ سرد مہری سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تھا۔

”لیکن تم میری دوست ہو۔ مجھے مشورہ تو دے سکتی ہو۔“ وہ اس کے انداز پر کچھ حیران ہوئی تھی۔

”ہاں مشورہ دے سکتی ہوں مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں خیر تم یہ اسٹیر یو رکھ لو اگر وہ اتنے ہی اصرار سے دے رہا ہے تو ٹھیک ہے پھر لینے میں کیا حرج ہے۔“

”لیکن رودابہ! یہ سب ٹھیک نہیں اور پھر میں.....“

رودابہ نے اس کی بات کاٹی تھی۔ ”دیکھو میں نے تمہیں مشورہ دیا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں، تم اس پر عمل کر سکتی ہو یا نہیں، یہ تمہیں طے کرنا ہے۔ مجھے جو مناسب لگا میں نے تم سے کہ دیا کیونکہ بقول اس کے اس نے تمہیں یہ اسٹیر یو گفٹ کے طور پر دیا ہے اور گفٹ واپس کرنا کوئی اچھی نہیں۔ آگے تمہاری مرضی۔“

رودابہ نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی مگر ثانیہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ کافی دیر تک اس مسئلے پر سوچتے رہنے کے بعد اس نے بھی یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ اسٹیر یو رکھ لے گی مگر یہ فیصلہ اسے کچھ زیادہ مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

”موہبا! آپ کو پتا ہے، کوئیل یونیورسٹی کیوں نہیں آ رہے ہیں؟“

وہ چند دنوں سے یونیورسٹی نہیں آ رہا تھا اور ثانیہ کو کچھ تشویش ہوئی تھی تو اس نے

سے ایک بڑا سا اسٹیر یو اٹھائے ثانیہ کے کمرے میں آئی تھی۔

ثانیہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس نے کچھ بے یقینی سے رودابہ کو دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ بے حد سہاٹ تھا لیکن وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔

”میرے لئے دے کے گئے ہیں؟“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ملازمہ کے پاس آ گئی۔

”ہاں جی۔ آپ کے لئے ہی دے کر گئے ہیں۔ چٹ پر آپ کا پورا نام لکھ کر دیا تھا انہوں نے وارڈن کو۔“ ملازمہ نے اسٹیر یو فرسٹ پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے رودابہ؟ اس نے اسٹیر یو کس لئے بھیجا ہے اس کو کہا کس نے ہے؟“ ثانیہ نے ملازمہ کے باہر جاتے ہی رودابہ سے کہا۔

”کچھ نہیں ہو رہا، بس اس نے تمہارے لئے گفٹ بھیجا ہے۔ کیوں بھیجا ہے یہ کل اس سے یونیورسٹی میں پوچھ لینا۔“

رودابہ کے لہجے میں کچھ خاص بات تھی جس نے اسے چونکا دیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے رودابہ اسٹیر یو کے بارے میں بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اس شام رودابہ واقعی چپ چاپ رہی۔ ثانیہ خود بھی خاصی نادم تھی۔ اس لئے اس نے رودابہ کو مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اگلے دن یونیورسٹی جاتے ہی اس نے کوئیل کو پکڑ لیا تھا۔

”آپ نے میرے لئے ہاسٹل میں اسٹیر یو کیوں بھجوایا ہے؟“ وہ واقعی ناراض تھی۔

”صرف اس لئے تاکہ تم رودابہ کے ساتھ کنسرٹس اینڈ نہ کرو۔“ بڑی لاپرواہی سے

کہا گیا تھا۔

”مجھے اسٹیر یو کی ضرورت نہیں ہے آپ اسے واپس لے جائیں۔“

”واپس تو خیر میں اس کو قطعاً نہیں لوں گا تم اسے ایک تحفہ سمجھ کر رکھ لو۔“

”لیکن مجھے اسٹیر یو کی ضرورت ہی نہیں ہے اگر مجھے میوزک سننا ہو تو میں رودابہ

کے اسٹیر یو پرسن لوں گی۔“

”دیکھو میں نے تمہیں، وہ اسٹیر یو اس لئے دیا ہے کیونکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ میں نیا اسٹیر یو لے رہا ہوں اور پھر پرانا والا میرے لئے بے کار ہو جاتا۔ اس لئے میں

نے وہ تمہیں دے دیا تمہیں نہ دیتا تو بھی کوئی اور دوست لے جاتا اور تم تو میری.....“ وہ بڑی روئی سے کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔

”وہ پرانا اسٹیر یو نہیں ہے، نیا اسٹیر یو ہے اور رودابہ کہہ رہی تھی کہ وہ خاصا مہنگا

موہد سے پوچھ لیا وہ کہنے ٹیر یا میں بیٹھا ہوا تھا۔

”اس کے کزن کی شادی ہے۔ وہ اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟ کیا پھر کوئی کام آن پڑا ہے یا کسی قسم کی مدد چاہئے؟“ ثانیہ کو اس کی بات سے تو ہین کا احساس ہوا تھا۔

”آپ کو ایسا کیوں لگا کہ مجھے کوئی کام ہے یا مدد کی ضرورت ہے۔ کیا اس کے بغیر میں اس کے بارے میں نہیں پوچھ سکتی؟“ اس نے کچھ خشکی سے موہد سے پوچھا تھا۔

”بالکل پوچھ سکتی ہیں لیکن پوچھتی نہیں، اس سے ملنے آپ جب بھی آتی ہیں کسی کام سے ہی آتی ہیں۔ بہر حال وہ تو ابھی چند دن اور اسلام آباد میں ہی رکے گا۔ آپ کو کوئی کام ہے تو مجھ سے کہیں، میں بھی کچھ صاحب حیثیت ہوں۔ اس قدر معمولی بندہ نہیں ہوں جتنا آپ نے کومیل کے مقابلے میں مجھے اور میرے دوستوں کو سمجھ لیا ہے۔

اس نے ایک شریسرکراہٹ کے ساتھ ثانیہ سے کہا تھا۔ اشعر اور ولید کے چہرے پر بھی مسکراہٹ لہرا گئی ثانیہ کو بے حد ذلت کا احساس ہوا۔ وہ مکمل خاموشی کے ساتھ وہاں سے چلی آئی۔

مگر وہ موہد کی بات کو بھولی نہیں تھی۔ تین دن بعد کومیل واپس پونہرشی آ گیا تھا اور اس کی واپسی والے دن ہی ثانیہ نے روتے ہوئے اسے پورا واقعہ سنا دیا تھا۔ شاید وہ رونہ پڑتی تو وہ اتنا مشتعل نہ ہوتا جتنا اس کے آنسوؤں سے ہو گیا تھا۔ اسے تسلی اور دلاسا دینے کے بعد وہ سیدھا اپنے گروپ کے پاس ہی گیا تھا۔

”تم نے ثانیہ سے کیا کہا تھا؟“ اس نے جاتے ہی موہد سے پوچھا تھا۔

موہد قدرے حیران ہوا۔ ”ثانیہ سے؟“ اسے فوری طور پر یاد نہیں آیا۔

”ہاں چند دن پہلے جب میں یہاں نہیں تھا تب؟“ کومیل نے اسی سرد لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔ موہد کو یک دم ثانیہ کے ساتھ ہونے والی وہ گفتگو یاد آ گئی۔ اس نے ایک ہلکا سا تہقہ لگایا۔

”کمال ہے یار! کیا اسپڈ ہے اس کی۔ اس نے تمہیں آتے ہی بتا دیا۔“

اس نے بڑا منظور ہوتے ہوئے کہا تھا لیکن اس کے تہقہ نے کومیل کو اور مشتعل کیا تھا۔

”میں نے تمہیں ہنسنے کو نہیں کہا۔ یہ پوچھا ہے کہ تم نے اس سے کیا کہا ہے؟“

”اس نے تمہیں کیا بتایا ہے؟“ موہد ابھی بھی اس کے غصے کو انجوائے کر رہا تھا۔

”تم ہوتے کون ہو اس سے اس طرح کی بیہودہ باتیں کرنے والے؟“

یک دم کومیل اپنے لہجے پر قابو نہیں رکھ پایا تھا اور اس نے بلند آواز میں کہا تھا۔ موہد کی مسکراہٹ کو بریک لگ گئے اور اس نے کچھ حیرانی سے ولید اور اشعر کو دیکھا جو خود بھی کومیل کے اس جملے پر حیرت زدہ نظر آ رہے تھے۔

”بے ہودہ باتیں؟ میں نے اس سے کوئی بے ہودہ بات نہیں کی تھی۔“

”تمہیں کیا تکلیف ہے کہ وہ میرے پاس کس لئے آتی ہے؟ تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟“

”کومیل! میں نے اسے صرف مذاق میں ایک بات کہہ دی تھی اور تم.....“ موہد نے کچھ سنبھل کر صورت حال کی وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی۔

”تم نے اس سے مذاق میں بھی بات کیوں کی تھی؟ اس سے تمہارا رشتہ کیا ہے جو تم مذاق میں ایسی گھنٹیا باتیں کرنے لگے۔“ کومیل کا پارہ اور ہائی ہو گیا تھا۔

موہد کچھ لاجواب سا ہو گیا۔

”کومیل تم خواجواہ اتنے سیریس ہو رہے ہو جو کچھ ہوا ہمارے سامنے ہوا اور موہد نے واقعی مذاق کیا تھا۔“ اشعر نے صلح صفائی کا آغاز کیا تھا۔

”مجھے تم سے کوئی وضاحت نہیں چاہئے۔ میں جس سے بات کر رہا ہوں، مجھے اسی سے جواب چاہئے۔“ کومیل نے اشعر کو جھڑک دیا۔

”میرے خیال میں یہاں بات کرنا مناسب نہیں ہے۔ تم سب میرے گھر چلو۔ وہاں چل کر یہ مسئلہ طے کر لیتے ہیں۔“

ولید کو اچانک احساس ہوا تھا کہ ان کی بلند آوازیں پاس سے گزرنے والوں کو متوجہ کر رہی ہیں۔ کومیل نے اس کی بات پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ مگر اس کے دل میں موہد کے خلاف جو ہال آ گیا تھا وہ ولید کے گھر پہنچ کر بھی دور نہیں ہوا تھا۔ اشعر اور ولید نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور موہد نے بار بار اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوششوں میں ناکامی کے بعد اس سے معذرت بھی کر لی لیکن اس کا غصہ ختم نہیں ہوا تھا۔ موہد کے معذرت کرنے پر اس نے کہا تھا۔

”میں تمہاری ایکسکوز صرف اسی وقت قبول کروں گا جب تم ثانیہ سے بھی ایکسکوز کرو۔“ موہد اس کی بات پر بھڑک اٹھا تھا۔

”ثانیہ سے کس لئے ایکسکوز کروں جب میں نے اسے کچھ کہا ہی نہیں۔“

”ٹھیک ہے پھر میرے سامنے یہ ڈرامے کرنے کی ضرورت نہیں۔“ کومیل نے تسلی

سے کہا تھا۔

”تم نے ایک معمولی سی بات کو اتنا بڑا ایٹو بنا دیا ہے۔ تمہارے نزدیک وہ لڑکی مجھ سے زیادہ اہم ہو گئی ہے۔ تمہیں اس کی بات پر اعتبار ہے، میری بات پر نہیں؟“

موہب کو بھی اب اس پر غصہ آنے لگا تھا۔

”میں یہاں تمہاری ٹیو اس سننے نہیں آیا ہوں۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر تم نے ثانیہ سے ایکسکیوز نہ کیا تو آج تمہاری اور میری دوستی کا آخری دن ہوگا۔ میں اس کے بعد تم سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔“ اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

”میں کسی بھی قیمت پر ثانیہ سے ایکسکیوز نہیں کروں گا، چاہے تم یہ دوستی ختم کر دیا کچھ اور کرو لیکن میں اس سے ایکسکیوز نہیں کروں گا۔“

موہب پر بھی اب ضد سوار ہو گئی تھی۔ کوئیل نے مزید کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر چلا آیا تھا اور وہ واقعی اپنے قول کا پکا ثابت ہوا تھا۔ اس نے موہب کے ساتھ کچھلی پندرہ سالہ دوستی کو بے حد آسانی سے ختم کر دیا تھا ولید اور اشعری کی کوششیں اور منتیں بھی بے اثر ثابت ہوئیں تھی۔

یونیورسٹی میں بھی جلد ہی سب کو یہ پتہ چل گیا تھا کہ کوئیل نے موہب کے ساتھ دوستی ختم کر دی ہے۔ اب موہب، اشعری اور ولید کے ساتھ ہوتا اور کوئیل اکیلا ہی رہتا۔

اور پھر جلد ہی ڈپارٹمنٹ میں یہ خبر پھیل گئی کہ ان دونوں کی دوستی ثانیہ کی وجہ سے ختم ہوئی ہے۔ ثانیہ ان چہ میگوئیوں سے کافی پریشان ہوئی تھی کیونکہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بات سب کو کیسے پتا چلی ہے کہ کوئیل اور موہب کے درمیان جھگڑا ہوا ہے اور وہ بھی اس کی وجہ سے۔

اسے موہب پر شک تھا کہ شاید وہی یہ ساری خبریں دینے والا ہے اور نہ صرف اسے بلکہ کوئیل کو بھی موہب پر شک تھا اور اس شک نے اس کی ناراضگی کو اور بڑھا دیا تھا۔

وہ اب پہلے کی طرح ثانیہ سے بات نہ کرتا بلکہ کچھ کھنچا کھنچا رہنے لگا۔ اگر کبھی ثانیہ سے اس کی ملاقات ہوتی بھی تو پہلے کی طرح تفصیلی طور پر بات کرنے کے بجائے وہ صرف سرسری انداز میں اس کا حال چال پوچھ کر چلا جاتا۔

موہب کی بیپ سنائی دی تھی، اس نے گہری نیند میں فون کا ریسیور اٹھالیا۔ دو تین بار ہیلو کہنے کے بعد اسے اچانک احساس ہوا تھا کہ اسے فون پر نہیں بلکہ موہب پر کسی نے کال کیا ہے بیپ ابھی بھی سنائی دے رہی تھی اس نے ریسیور رکھ کر موہب کو اٹھالیا۔ آنکھیں بند کئے ہوئے اس نے بٹن پر پریس کیا تھا اور ہیلو کہا تھا۔

”ہیلو کوئیل.....!“ دو لفظ کہنے کے بعد اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس آواز کو پہچان گیا تھا۔ وہ ثانیہ تھی۔ اس کے جسم میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا تھا ساری نیند بھک سے اڑ گئی تھی۔

”ہیلو ثانیہ! ہیلو کیا ہوا ہے؟ تم کیوں رو رہی ہو؟“ اس نے بے تابی سے پوچھنا شروع کیا تھا مگر وہ روئے جا رہی تھی۔ اس کی بے چینی میں اور اضافہ ہو گیا وہ موہب کے ہاتھ میں لیے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے سائینڈ ٹیبل سے رسٹ واپس اٹھائی تھی ریڈیم ڈائل مٹا رہا تھا کہ رات کا ایک بج چکا ہے اس کے اضطراب میں ایک بیک اور اضافہ ہو گیا۔

”ثانیہ! دیکھو۔ اس طرح مت روؤ۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے پلیز مجھے بتاؤ تم کیوں رو رہی ہو۔“ اس نے بچوں کی طرح اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

”کوئیل! کوئیل! مجھے ہاسٹل کا چوکیدار اندر نہیں جانے دے رہا۔“

ثانیہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا تھا اور کوئیل کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔

”تم کہاں سے بول رہی ہو اور وہ کیوں اندر جانے نہیں دے رہا؟ تم باہر کس لئے آئی تھیں؟“ اس نے پے در پے سوال کئے تھے۔

”میں رودابہ کے ساتھ کنسرٹ پر گئی تھی۔“ اس نے سسکیوں میں اسے بتایا تھا۔

”تمہیں منع کیا تھا میں نے۔“ وہ ایک دم دھاڑا تھا۔ ثانیہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کوئیل کو اپنا خون کھولتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”اب رودابہ کہاں ہے؟“ اس نے خود پر کنٹرول کرتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔

”وہ مجھے یہاں چھوڑ کر اپنے گھر چلی گئی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ وارڈن سے اجازت لے کر مجھے ساتھ لے کر جا رہی ہے مگر چوکیدار کہہ رہا تھا کہ وارڈن نے میرے باہر جانے کے بارے میں رودابہ سے کوئی بات نہیں کی۔ رودابہ نے ان سے صرف اپنے گھر رہنے کی اجازت لی تھی کیونکہ ویک اینڈ تھا۔ اب میں کیا کروں؟“ وہ ایک بار پھر رونے لگی۔

”رودابہ کے گھر کا فون نمبر یا ایڈریس معلوم ہے؟“

”نہیں۔“

”تم اس وقت کہاں سے بات کر رہی ہو؟“

”ہاسٹل سے کچھ فاصلے پر ایک میڈیکل اسٹور ہے وہاں سے، کوئیل! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ اب میں کیا کروں گی۔“

”ٹانیہ! بات سنو، اپنا رونا بند کرو۔ دیکھو، میں دس پندرہ منٹ میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔ تم پریشان نہ ہونا اور نہ ہی اب اس شاپ سے کہیں اور جانا ہمیں رہنا اور اس شاپ کیپر سے میری بات کراؤ۔“

اس نے ٹانیہ کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ ٹانیہ نے ریسیور شاپ کیپر کو تھما دیا۔ کوئیل کچھ دیر اس سے بات کرتا رہا اور اسے ٹانیہ کی حفاظت کے بارے میں تاکید کرتا رہا دکان کا نام پوچھنے کے بعد اس نے فون دوبارہ ٹانیہ کو دینے کو کہا تھا۔

”دیکھو تم آرام سے اسی دکان پر بیٹھ جاؤ گھبرانے والی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا میں بس تھوڑی دیر میں آ جاؤں گا۔“

اس نے ٹانیہ کو تسلی دے کر موبائل بند کر دیا تھا پھر اس نے اپنے ایک دوست کو فون کیا تھا جس کے والد منٹری میں تھے۔

”کوئی بات نہیں۔ میں ڈیڑی کو جگا کر بات کرتا ہوں۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔“

اس کے دوست نے اس کا مسئلہ سن کر کہا تھا موبائل بند کر کے اس نے بیڈ سے اٹھ کر جلدی سے ٹائٹ شرٹ پہنی تھی اور کار کی چابی اور موبائل اٹھا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

باہر آنے کے بعد وہ سیدھا اپنے بڑے بھائی کے کمرے کی طرف گیا اور اس نے اپنی بھابھی اور بھائی کو جگایا تھا اور سارا قصہ سنا کر بھابھی کو ساتھ چلنے کے لئے کہا تھا۔ بھابھی اور بھائی کی نظروں میں لہراتا ہوا شک بھی اس وقت اسے ناگوار نہیں لگ رہا تھا۔

چند لمحوں کی روداد کے بعد اس کی بھابھی اس کے ساتھ چلنے پر تیار ہو گئی تھیں مگر وہ زیادہ خوش نظر نہیں آ رہی تھیں۔ مگر اسے اس وقت کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ تیز رفتاری سے گاڑی دوڑاتا ہوا وہ ٹھیک دس منٹ بعد اس میڈیکل اسٹور کے سامنے تھا۔ گاڑی سے نکل کر اس نے چند لمحوں کی جدوجہد کے بعد وہ دکان تلاش کر لی تھی جہاں وہ موجود تھی۔ اسے دیکھ کر اس کے بچے آنسوؤں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ کوئیل کو اس پر بے تماشائے آ رہا تھا لیکن وہ خود پر ضبط کر رہا تھا۔

”اب میں کیا کروں گی کوئیل! اب کیا ہوگا؟“ اسے دیکھتے ہی اس نے کہا تھا۔

”کچھ نہیں ہوگا۔ میں اپنی بھابھی کو لے کر آیا ہوں۔ تم ان کے ساتھ ہاسٹل چلی جانا اب تک رارڈن کو میرے دوست کے قافروں کر چکے ہوں گے وہ تمہیں اب اندر آنے سے نہیں روکے گی لیکن تمہیں اب میں نے رودادہ کے ساتھ دیکھا تو میں تمہیں اور اسے دونوں کو شوٹ کر دوں گا۔ وارڈن سے کہہ کر اپنا کمرہ چھینچ کر لینا کل تک۔“

اس کے ساتھ گاڑی کی طرف آتے ہوئے وہ اسے ہدایات دیتا آیا۔ گاڑی کے پاس پہنچ کر اس نے اپنی بھابھی سے اس کا تعارف کروایا تھا اور پھر گاڑی میں بٹھا کر ہاسٹل کی طرف لے آیا تھا۔ اس کی بھابھی ٹانیہ کو لے کر اندر چلی گئی تھیں۔ لیکن انہیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

چوکیدار نے بڑے آرام سے گیٹ کھول دیا تھا اور وارڈن نے ٹانیہ سے معذرت کی تھی وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھیں۔ ٹانیہ کو وہاں چھوڑ کر کوئیل کی بھابھی واپس چلی گئی تھیں۔ ہاسٹل کے اندر پہنچ کر ٹانیہ کی جان میں جان آئی تھی اس وقت اسے رودادہ سے بے تماشائے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ کوئیل نے کس کس طرح اسے رودادہ سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے ہر بار اس کی وارننگ سنی ان سنی کر دی تھی۔

”رودادہ تم نے میرے ساتھ فراڈ کیا۔ مجھے دھوکا دیا۔ آخر تم یہ حقیقت مان کیوں نہیں لیتیں؟“

رودادہ دو دن بعد ہوسٹل واپس آئی تھی۔ ٹانیہ تب تک واپس اپنے پرانے کمرے میں جا چکی تھی۔ وہ صبح آئی تھی۔ تب ٹانیہ سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی لیکن یونیورسٹی میں اس نے ٹانیہ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ٹانیہ کے چہرے کے تاثرات نے اسے چونکا دیا تھا، وہ اس کی بات سننے پر تیار نہیں تھی پھر واپس ہاسٹل آنے کے بعد ٹانیہ خود اس کے کمرے میں گئی تھی اور اس نے اسے اس کے دھوکے کے بارے میں بتایا تھا لیکن رودادہ بہت عجیب سے انداز میں کہہ رہی تھی کہ وہ وارڈن سے بات کرنا بھول گئی تھی۔

ٹانیہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کا گلا دبا دیتی۔ اس وقت اس رودادہ کا خوبصورت چہرہ بہت بھیا تک لگ رہا تھا۔

”رودادہ! میں بے وقوف نہیں ہوں۔ سب کچھ سمجھ سکتی ہوں بلکہ سب کچھ سمجھ چکی ہوں۔ تم مجھے ذلیل کرنا چاہتی ہو، مجھے رسوا کرنا چاہتی ہو۔ یہ تو میں جان چکی ہوں۔ ہاں بس یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ تم ایسا کیوں کرنا چاہ رہی ہو؟ میں نے تو تمہارے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا پھر تم کیوں میرے ساتھ اس طرح کر رہی ہو؟ اسٹیروئیڈ والی بات بھی تم ہی نے پوری کلاس کو بتا دی تھی اور میں حیران تھی کہ تمہارے، میرے اور کوئیل کے علاوہ یہ بات کسی کے علم میں نہیں ہے پھر ڈپارٹمنٹ کو اس کے بارے میں کیسے پتہ چل گیا اور میرا خیال ہے کہ موبہ اور کوئیل کے درمیان ہونے والے جھگڑے کے بارے میں بھی تم ہی خبریں دیتی رہی ہو۔ آخر تم یہ سب کر کے کیا حاصل کرنا چاہتی ہو؟ میری رسوائی

سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟“

”کوئیل کے ساتھ اگر میں نے تمہیں بدنام کیا تو تمہیں کیا نقصان ہوا۔ تمہیں تو فائدہ ہی ہواناں پھر تمہیں کیا پریشانی ہے؟“

ثانیہ نے حیران ہو کر اس کا چہرہ دیکھا تھا جس پر بے حد عجب سے تاثرات تھے۔
”کیا مطلب ہے تمہارا؟ مجھے کیا فائدہ ہوا؟“ اس نے پوچھا تھا۔
”بس بس۔ اب زیادہ مصحوم نہ بنو۔ تم جانتی ہو تمہیں کیا فائدہ ہوا۔ اب میرے منہ سے کیا سننا چاہتی ہو؟“

رودادہ کا لہجہ زہریلا تھا۔ اس کے لئے یہ انداز بالکل نیا تھا۔ وہ کچھ سن سی اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

”نہیں تم بتاؤ۔ کیا فائدہ ہوا، اب اپنی بات تو مکمل کرو۔“

”کوئیل نے کل تمہاری وجہ سے اپنی منگنی توڑ دی ہے؟“

وہ رودادہ کے جملہ پر ہکا بکا رہ گئی تھی۔ وہ قطعاً بے خبر تھی کہ کوئیل کی منگنی ہو چکی ہے اور اب یہ اطلاع بھی اس کے لئے بالکل نئی تھی کہ اس نے منگنی توڑ دی ہے۔

”میری وجہ سے؟ تم نے کہا میری وجہ سے؟“ اس نے کھوکھلی آواز میں اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

”ہاں تمہاری وجہ سے ثانیہ مراد! تمہاری وجہ سے اب بہت جلد وہ تمہیں پر پوز کرے گا۔ آئے گا اور کہے گا مس ثانیہ مراد! کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟ کیا آپ میری خزاں جیسی زندگی میں بہار بن کر آنا پسند کریں گی؟“ رودادہ نے تسخراً آمیز انداز میں کہا تھا۔

ثانیہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ”رودادہ! ایسی باتیں مت کرو۔ اس طرح مت کرو۔“ اس نے بے بسی سے کہا تھا۔

”بلکہ ہو سکتا ہے وہ بہت پہلے ہی تمہیں پر پوز کر چکا ہو اور آج کل تم دونوں شادی کی پلاننگ کر رہے ہو۔ ہو سکتا ہے نا؟“ رودادہ نے اپنی بات جاری رکھی وہ چلا اٹھی۔

”تم غلط سوچ رہی ہو۔ ہم دونوں کے درمیان ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے ایسا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”تو پھر آپ بتانا پسند کریں گی کہ آپ دونوں کے درمیان کیا تعلق ہے؟ کیا رشتہ ہے؟“ اسے رودادہ کی آنکھوں سے خوف آنے لگا تھا۔

”کوئی رشتہ نہیں ہے۔“ اسے اپنی آواز کسی کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

”کوئی رشتہ نہیں ہے پھر بھی وہ تمہیں براٹھ نواستیر پواٹھا کر دے دیتا ہے۔ کوئی رشتہ نہیں ہے پھر بھی وہ تمہیں اس ہاسٹل میں کرہ لے کر دیتا ہے۔ وہ جو کسی کو اپنی کتاب کو ہاتھ

ٹیک لگانے نہیں دیتا۔ تمہیں اپنے پورے لوٹس خود ہی فوٹو اسٹیٹ کر دے دیتا ہے۔ کوئی رشتہ نہیں ہے پھر بھی تمہاری وجہ سے وہ اپنے بچپن کے دوستوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ کوئی رشتہ نہیں

ہے پھر بھی وہ تمہاری وجہ سے مجھ سے بھگڑتا ہے۔ اس پوری یونیورسٹی میں وہ اگر کسی لڑکی سے بات کرتا ہے تو وہ تم ہو اگر کسی کی بات سنتا ہے تو وہ تم ہو۔ اگر کسی کا کام کرتا ہے تو وہ تم ہو۔ کوئی

رشتہ نہیں ہے اور وہ تمہارے لئے اپنی منگنی توڑ دیتا ہے۔ تم جانتی ہو ثانیہ مراد! جب وہ تمہیں دیکھتا ہے تو اس کی آنکھیں کس طرح چمک اٹھتی ہیں تم نہیں جانتیں مگر میں جانتی ہوں۔ میں

نے دیکھا ہے اور یہ چمک مجھے اندھا کر دیتی ہے۔ میں پچھلے چھ سال سے اس ایک شخص کے پیچھے کس طرح خوار ہو رہی ہوں یہ کوئی نہیں جانتا۔ آج تمہیں بتا رہی ہوں۔“

”رودادہ!“ سب کچھ جیسے کسی بھنور میں آ گیا تھا۔ وہ رودادہ کا چہرہ دیکھ رہی تھی جس پر آنسوؤں کی نمی نظر آ رہی تھی۔ اس نے پہلی بار اسے روتے ہوئے دیکھا تھا۔

”کون سا ایسا مرد ہے جس کی توجہ میں حاصل کرنا چاہوں اور نہ کر پاؤں، جس سے میں بات کروں اور وہ چپ رہے، جسے میں دیکھوں اور وہ نظر پھیر لے، جس کے راستے میں

میں کھڑی رہوں اور وہ پھر بھی گزر جائے، اور وہ کوئیل حیدر بھی کرتا ہے۔ اسے میں نظر ہی نہیں آتی۔ مجھے اس کے قرب کی خواہش نہیں ہے۔ میں اس سے شادی بھی نہیں کرنا چاہتی۔

مجھے اس کی محبت بھی نہیں چاہئے۔ میں تو صرف وہ نظر چاہتی ہوں جس سے وہ تمہیں دیکھتا ہے۔ صرف ایک بار۔ اس کے لہجے میں وہ نرمی چاہتی ہوں جو تم سے بات کرتے ہوئے ہمیشہ

اس کی آواز میں ہوتی ہے۔“ وہ بلک رہی تھی۔ ثانیہ کسی پتھر کے بت کی طرح دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اسے دیکھ رہی تھی۔

”صرف ایک بار۔ وہ میری فرمائش پر اپنی کوئی چیز اس طرح دے دے جس طرح وہ تمہیں دیتا ہے، صرف ایک دفعہ میری بات اس طرح سن لے جس طرح وہ تمہیں ہمیشہ سنتا

ہے، صرف ایک بار مجھے اس طرح کسی بات پر روکے جس طرح وہ تمہیں روکتا ہے۔ ثانیہ! وہ اگر مجھے خنجر دے اور کہے کہ اس سے اپنی گرون کاٹ لو تو میں ایک لمحے کی دیر نہ کروں۔“

وہ اب فرش پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے سر تھامے زار و قطار رو رہی تھی۔ ثانیہ خالی

الذہنی کے عالم میں بلیک جینز اور وائٹ سوئٹر میں ملبوس بیسویں صدی کی اس ”سوئی“ کو دیکھ

رہی تھی۔

”میری خوبصورتی، میرے باپ کی ساری دولت، میری ساری محبت، سارا عشق مجھے ایک شخص صرف ایک شخص کو میل حیدر نہیں دلا سکتے۔ میں نے تم سے دوستی صرف یہ دیکھنے کے لئے کی تھی کہ آخر تم میں وہ کون سی چیز ہے جو مجھ میں نہیں، جو کوئیل کو تمہاری طرف راغب کر رہی ہے مگر تم میں تو مجھے کچھ بھی نہیں آیا۔ تم عام تھیں۔ تم تو بہت ہی عام تھیں۔ میں نے سوچا تمہیں اپنے جیسا کر دوں تو شاید اس کی توجہ تم پر سے ہٹ جائے۔ شاید تم اس کے دل سے اتر جاؤ مگر کوئی فائدہ نہیں، تمہیں پتا ہے، اس کی منگنی میری کرن سے ہوئی تھی۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا مگر تمہاری وجہ سے اس نے ماریہ کو چھوڑ دیا۔ مجھے خوش ہونا چاہئے کہ اس نے ماریہ کو چھوڑ دیا مگر میں خوش نہیں ہوں کیونکہ مجھے لگتا ہے اسے ماریہ سے محبت نہیں تھی۔ وہ صرف پسندیدگی تھی۔ عشق تو اسے تم سے ہے اور میں چاہتی ہوں ثانیہ! تم اسے نہ ملو تا کہ اسے پتا چلے کہ جو محبت کرتے ہیں اور پھر خالی ہاتھ رہتے ہیں۔ ان کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ وہ کس طرح تڑپتے ہیں۔ مجھے تم سے نفرت نہیں ہے مگر پھر بھی ثانیہ! پھر بھی میرا دل چاہتا ہے میں تمہیں مار دوں۔ میں کچھ ایسا کر دوں کہ وہ تم سے نفرت کرنے لگے جیسے وہ مجھ سے کرتا ہے پھر چاہے وہ ماریہ سے شادی کرے چاہے کسی اور سے۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ بس..... بس تم سے شادی نہ کرے۔“

”رودابہ! مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔ مجھے اس سے شادی بھی نہیں کرنی ہے۔ مجھے کچھ پتا نہیں وہ میرے لئے اپنے دل میں کیا سوچتا ہے مگر میں اس کے لئے کچھ نہیں سوچتی ہوں میری منگنی ہو چکی ہے۔ میں نے تو کبھی کوئیل حیدر.....“

وہ اپنی بات مکمل کئے بغیر منہ پر ہاتھ رکھ کر کمرے سے نکل گئی۔ ”ہر مرد باہر سے کتنا ہی کلچرڈ، مہذب نظر کیوں نہ آئے اندر سے بے حد بھیا تک اور کمرہ ہوتا ہے۔ اتنا بھیا تک اور مکروہ کے اس پرتھوکنے کو دل چاہتا ہے۔“ چند دن پہلے ہی تو اس نے کہیں پڑھا تھا اور تب اس نے صفحہ پلٹ دیا تھا یہ کہہ کر۔

”اوہ یہ نی میل شادو زم۔“ اپنے کمرے کی طرف آتے ہوئے اس کا دل چاہ رہا تھا وہ بھی رودابہ کی طرح بلند آواز سے روئے۔ اسے ہمیشہ یہ گمان رہتا تھا کہ وہ لوگوں کو بڑی آسانی سے پرکھ سکتی ہے اور یہ واقعی گمان ثابت ہوا تھا وہ سید کوئیل حیدر کو نہیں جان پاتی تھی۔

”آخر میں نے کیوں نہیں سوچا کہ وہ مجھے اتنی ایکسٹرا آرڈی نری (غیر معمولی) توجہ کیوں دے رہا ہے۔ کیوں اس طرح چیزیں تمہا دیتا ہے۔ کیوں اتنی پروا کرتا ہے جب رودابہ

یہ سب سوچ سکتی تھی تو میں نے کیوں نہیں سوچا کسی رشتہ کے بغیر وہ اس طرح کیوں کرتا رہا۔ میں نے تب بھی نہیں سوچا۔ جب میرے اور اس کے حوالے سے چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ میں اتنی بے وقوف تو کبھی بھی نہیں تھی پھر آخر کیوں میں؟“

اس کا دماغ گذشتہ مہینوں کی فلم چلا رہا تھا۔ دھندلے آئینے صاف ہوتے جا رہے تھے۔

”تم میرے سامنے سے دفع ہو جاؤ۔ چلے جاؤ، میں تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔“

دوسرے دن اس نے فون کر کے کوئیل کو ہاسٹل بلوایا تھا، اسے وزیٹنگ روم میں بٹھا کر وہ اپنے کمرے میں آئی تھی اور وہ ساری چیزیں اٹھا کر لے کر آئی تھی جو وہ وقتاً فوقتاً اسے دیتا رہا تھا۔ اس نے وہ ساری چیزیں لاکر وزیٹنگ روم میں اس کے سامنے پھینک دی تھیں۔ وہ ہکا بکارہ گیا تھا۔

”ثانیہ! کیا ہوا ہے تمہیں؟“

”میری آنکھیں کھل گئیں ہیں۔ تمہاری اصلیت میرے سامنے آگئی ہے اور تم نہیں جانتے، اس وقت تم مجھے کتنے برے لگ رہے ہو۔ اب تم بس یہاں سے چلے جاؤ۔ میں دوبارہ کبھی تم سے ملنا نہیں چاہتی۔“

”میں نے کیا کیا ہے؟ تم کو ہوا کیا ہے؟“

”میرا دماغ خراب تھا، اب ٹھیک ہو گیا ہے۔ تم نہیں جانتے۔ مجھے تمہاری وجہ سے دنیا کتنی بری لگنے لگی ہے۔“

”ثانیہ! تمہیں میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میں.....“

ثانیہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”غلط فہمی تو مجھے ہو گئی تھی۔ اب تو ہر غلط فہمی دور ہو گئی ہے۔ تم میرے ساتھ فلرٹ کرنا چاہتے تھے تم نے مجھے.....“

”ثانیہ! تم پاگل ہو۔“ وہ چلا اٹھا تھا۔ ”تم سے کس نے یہ بکواس کی ہے؟ رودابہ نے؟ ہے نارودابہ؟“

”نہیں ماریہ نے۔ جانتے ہونا اسے؟..... تمہاری منگنی تھی وہ اور تم نے اس سے اپنی منگنی میری وجہ سے توڑ دی۔ تم.....“

کوئیل بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ”ماریہ تمہارے پاس آئی تھی؟“

”ہاں۔“ اس نے بڑی صفائی سے جموٹ بولا۔ کوئیل کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا لیکن وہ بڑی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم مجھے نہیں پہچانتیں، ہم اس سے پہلے بھی ایک دوسرے سے نہیں ملے۔“

وہ عورت اس کی پریشانی بھانپ گئی تھی۔ ثانیہ مزید حیران ہوئی۔

”میں ایئر ہوسٹس سے پوچھ چکی ہوں۔ یہ سیٹ خالی ہے۔ اس نے مجھے یہاں بیٹھنے کی اجازت دے دی ہے۔ پھر بھی میں تم سے پوچھ لیتی ہوں۔ کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔“

ثانیہ اس کی بات پر مزید حیران ہوئی تھی۔ ”جی بالکل ضرور بیٹھیں۔“

”تھینک یو۔ یہ تمہاری بیٹی ہے؟“ اس عورت نے مدیحہ کے گال کو چھوا تھا۔

”ہاں۔“ ثانیہ اب بے چین ہو رہی تھی۔

”آپ کون ہیں اور مجھے کیسے جانتی ہیں؟“ اس نے پوچھ ہی لیا تھا۔

وہ عورت جواب میں اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ یوں جیسے اس نے پہلی بار اسے دیکھا ہوا پھر اس نے کچھ تھکے ہوئے انداز میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔

”تمہیں نہیں جانوں گی تو کسے جانوں گی۔ تمہاری وجہ سے میں نے آٹھ سال پہلے

سب کچھ کھو دیا تھا۔ تمہیں کیسے بھلا سکتی ہوں۔“

وہ آنکھیں بند کئے بڑبڑائی تھی۔ ثانیہ الجھ گوی تھی۔

”میں آپ کی بات نہیں سمجھی۔ آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟“

”میرا نام ماریہ جہانگیر ہے۔ ڈاکٹر ماریہ جہانگیر۔ مگر تم مجھے نہیں جانتیں میں نے

تمہیں بتایا ہے نا، میں تم سے کبھی نہیں ملی۔“ اس نے ایک بار پھر آنکھیں کھول دی تھیں اور

اس کی طرف دیکھے بغیر بولنا شروع کر دیا تھا۔

”پھر آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟“

”تمہاری تصویر دیکھی تھی ایک بار کسی کے پاس۔ تب سے آج تک میرے دماغ پر

تمہارا چہرہ نقش ہے۔ تم آج بھی ویسی ہو جیسی آٹھ سال پہلے تھیں۔ بدلیں نہیں اگر بدل جاتیں

تب بھی میں تمہیں پہچان ضرور لیتی۔ تمہیں ایئر پورٹ پر سامان کی چیکنگ کرواتے ہوئے دیکھا

تھا۔ میں اس وقت تمہارے پاس ہی تھی۔ میری سیٹ ایگزیکٹو کلاس میں تھی۔ مگر میں ایئر

ہوسٹس سے کہہ کر اکاٹومی کلاس میں آ گئی ہوں کیونکہ تم سے باتیں کرنی ہیں مجھے بہت کچھ کہنا

ہے مجھے۔“

ثانیہ کو اس کی باتوں سے الجھن ہو رہی تھی۔ وہ اب اس کے چہرے پر نظریں مرکوز

”میں تمہیں کیا سمجھتی رہی اور تم کیا ہو اور تم نے مجھے کیا سمجھا۔ کس طرح مجھے.....“

”ثانیہ! تم چپ ہو جاؤ جو تم سوچ رہی ہو۔ وہ غلط ہے۔ میں تم سے فطرت کا سوچ

بھی نہیں سکتا۔ میں.....“

ثانیہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ٹھیک ہے میں غلط ہوں تو پھر تم بتاؤ۔

میرے ساتھ تمہارا کیا رشتہ ہے؟ کس لئے یہ ساری عنایات، ساری نوازشات مجھ پر کرتے

ہو۔ کیوں تم نے مجھے.....؟“

وہ بات ادھوری چھوڑ کر رونے لگی۔ کوئیل نے چند لمبے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن

پھر وہ کچھ کہے بغیر تیزی سے وزیٹنگ روم سے نکل گیا۔



ایئر ہوسٹس اسے اس کی سیٹ پر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اس نے اپنا سفری بیگ اوپر

رکھ دیا تھا اور پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ مدیحہ ساتھ والی سیٹ پر براہمان ہو چکی تھی۔

”مئی! ہم پاپا کے پاس کب جائیں گے؟“

گھر سے یہاں تک بیسویں بار مدیحہ نے وہی سوال دہرایا تھا۔

”بیٹا بہت جلد۔“ اس نے بیسویں بار وہی جواب دیا تھا۔

اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اس نے سیٹ بیلت باندھنا شروع کر دی۔ اپنی سیفٹی بیلت

باندھنے کے بعد اس نے مدیحہ کی بیلت باندھی تھی۔ جہاز میں مسافر ادھر سے ادھر اپنی اپنی

سیٹس کی تلاش اور سامان رکھنے میں مصروف تھے۔ وہ بوریت سے ادھر سے ادھر آتے جاتے

اسٹیورڈز اور ایئر ہوسٹس کو دیکھتی رہی۔ جہاز کی اکثر سیٹیں خالی تھیں اس کے ساتھ والی تیسری

سیٹ بھی ابھی تک خالی تھی کچھ دیر بعد ایئر ہوسٹس اسپیکرز کے ذریعے سب کو سیفٹی بیلتس

باندھنے کے لئے ہدایات دینے لگی، چند منٹوں بعد جہاز ٹیک آف کر گیا تھا۔

وہ اس وقت مدیحہ کی سیفٹی بیلت کھول رہی تھی جب آہٹ پر اس نے سر اٹھایا تھا۔

سرخ و سفید رنگت کی ایک بے حد چمکے نقوش کی بہت اسمارٹ سی عورت اس کے پاس کھڑی تھی

اس کا چہرہ مسکراہٹ سے عاری تھا۔

”ہیلو ثانیہ مراد! کیسی ہو؟“ بہت نرم لہجے میں اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے

اس عورت نے کہا تھا۔

ثانیہ کچھ حیران ہوئی تھی۔ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے اس کا چہرہ پہچاننے

کی کوشش کی چہرہ شناسا نہیں تھا۔

کر چکی تھی۔

”کوئیل کو جانتی ہو؟ سید کوئیل حیدر کو؟“

ثانیہ کو لگا تھا اس کے نزدیک، کہیں کوئی بم پھٹ گیا ہو۔ وہ رکے ہوئے سانس کے ساتھ اس عورت کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اسے اب یاد آ گیا تھا ماریہ کون تھی۔ آٹھ سال کے بعد ایک بار پھر جیسے کسی نے اس کے پچھلے زخم ہرے کر دیئے تھے۔

اس دن کوئیل کے جانے کے بعد وہ ہاسٹل سے واپس سرگودھا چلی گئی تھی اور پھر دوبارہ یونیورسٹی نہیں آئی۔ اس نے تعلیم چھوڑنے کی کوئی وجہ نہیں بتائی تھی۔ ہر بار اپنے والد کے سوالوں پر اس کا صرف ایک ہی جواب ہوتا۔ ”میرا اب پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ میں آپ سے الگ نہیں رہ سکتی۔“

مراد علی سرپیٹ کر رہ گئے تھے۔ اس نے ان کے سارے خوابوں کو چکنا چور کر دیا تھا۔ وہ بے حد ناراض اور افسردہ تھے لیکن بہر حال انہوں نے اسے مزید مجبور نہیں کیا تھا۔

ثانیہ کی منگنی بی اے کے دوران ہی اس کی پھوپھو کے بیٹے اسد سے ہو چکی تھی جو کویت میں دفاع میں کام کرتا تھا۔ تعلیم چھوڑنے کے چھ ماہ کے اندر اندر اس کی شادی ہو گئی تھی اور وہ پاکستان سے جانے کے بعد بے حد خوش تھی۔ وہ خوف جو چھ ماہ تک اسے اپنی گرفت میں لیے ہوا تھا۔ وہ ختم ہو گیا تھا۔ اب کوئی رودابہ، کسی کوئیل کو اس کے سامنے نہیں آتا تھا۔ لوگوں پر سے اس کا اعتبار یک دم جیسے ختم ہو گیا تھا۔ وہ اگر یونیورسٹی نہ چھوڑتی تو شاید پاگل ہو جاتی۔ ہر مرد کا چہرہ اسے کوئیل کا چہرہ لگتا۔ ہر لڑکی اسے رودابہ لگتی۔ ہر شخص اسے خود پر ہنستا ہوا لگتا۔

پھر سب کچھ نارمل ہو گیا تھا وہ اسد کے ساتھ بہت پرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ ہر سال وہ پاکستان آتی اور اس بار بھی وہ اپنی بیٹی کے ساتھ پندرہ دن پاکستان میں گزارنے کے بعد واپس جا رہی تھی جب ماریہ جہانگیر اس کے سامنے آ گئی تھی۔

”جانتی ہو تا کوئیل کو؟“ وہ دوبارہ پوچھ رہی تھی۔

ثانیہ کا دل چاہا وہ جہاز کی کھڑکی سے چھلانگ لگا دے۔ ندامت کا احساس کچھ ایسا

ہی وزنی تھا۔

”میں کوئیل حیدر کی منگنی تھی کسی زمانے میں۔“ ماریہ کی آنکھوں میں کچھ جل کر بھجا تھا۔

ثانیہ ایک تک اسے دیکھتی رہی۔ ”بلکہ..... بلکہ محبت کرتے تھے ہم دونوں ایک

دوسرے سے۔“

وہ اب بات کرتے ہوئے آہستگی سے اپنے ہاتھ کو بند کر کے کھول رہی تھی۔

”آج تمہیں دیکھا تو دل چاہا، ایک بار پھر سے سب کچھ دوہرانے کو۔ اس کے

بارے میں بات کرنے کو۔“

وہ ایک باریٹ کی پشت سے ٹیک لگا چکی تھی۔

”پتا نہیں، ہم دونوں میں سے کس نے ایک دوسرے سے زیادہ محبت کی۔ میں نے اس

سے یا اس نے مجھ سے۔ شاید میں نے۔ ہمیشہ عورت ہی زیادہ محبت کرتی ہے۔ ہے نا ثانیہ؟“

وہ ایک بار پھر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس کی رائے لے رہی تھی۔ ثانیہ کو گئی ہو چکی تھی۔ اسے حلق سے آواز نہیں نکلی۔

”ہاں۔ میرا خیال ہے۔ میں نے ہی زیادہ محبت کی تھی بلکہ اب بھی کرتی ہوں۔

نہیں محبت نہیں شاید اسے عشق کہنا چاہئے۔ ہم دونوں کو لگتا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے وجود کے

بغیر ادھورے ہیں۔ اس نے مجھے پہلی بار کسی پارٹی میں دیکھا تھا۔ پھر وہ ایک دوست کے توسط

سے مجھ سے ملا۔ میں تب میڈیکل کے تھرڈ ایئر میں تھی۔ بس پتا نہیں کیا ہوا۔ لیکن اس میں کوئی

ایسی بات تھی۔ جس نے مجھے مسحور کر دیا۔ پھر ہم اکثر ملتے رہے اور ایک دن اس نے مجھے

پروپوز کر دیا۔“

ثانیہ آنکھیں جھپکے بغیر ماریہ جہانگیر کا چہرہ دیکھتی رہی جو اس طرح اپنی داستان سنا

رہی تھی جیسے وہ اس کی عزیز ترین دوست ہو۔

”ہماری منگنی ہو گئی، تب اس نے ایم اے میں ایڈمیشن لیا تھا۔ ہم دونوں کی کمال کی

انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ بہت سی باتیں ہم کہے بغیر ہی سمجھ لیتے تھے یوں جیسے ٹیلی پتھی ہو گئی ہو۔

مجھے لگتا تھا کہ کوئیل حیدر کے سوا دنیا میں میرے لئے اور کچھ ہے ہی نہیں اور اگر کہیں یہ نہ ملا تو

مجھے تو دنیا ہی نہیں ملے گی مگر مجھے کوئی خدشہ نہیں تھا۔ آخر وہ مجھے کیوں نہ ملتا۔ وہ مجھ سے محبت

کرتا تھا۔ دونوں فیملیز کی رضامندی سے یہ رشتہ ہوا تھا۔ ہم دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی

تھی۔ پھر میں ایسے خدشات کیوں پالتی۔ تب ہم اپنی شادی کو پلان کر رہے تھے جب یک دم

ہمارے درمیان ثانیہ مراد علی آ گئی..... تم آ گئیں۔“

پتا نہیں ثانیہ کو ماریہ جہانگیر کا چہرہ اس لئے اس قدر تاریک کیوں لگا تھا۔ اس کا دل

چاہا وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دے اور خوب روئے۔

”نہیں ثانیہ! تم پریشان مت ہو۔ میں تمہیں کوئی الزام نہیں دے رہی۔ تمہاری غلطی نہیں ہے۔ بعض دفعہ ہمیں لگتا ہے کسی شخص سے ہماری بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے مگر ایسا نہیں ہوتا۔ ہم کو غلط فہمی ہوتی ہے عورت کسی مرد کو بھلا کیسے سمجھ سکتی ہے وہ بھی کوئیل حیدر جیسے مرد کو۔ میں نے بھی سارا عرصہ اس خوش فہمی میں گزارا تھا کہ میں کوئیل حیدر کو سمجھنے لگی ہوں مگر ایسی نہیں تھا اور مجھے اس خوش فہمی نے ڈبو دیا۔ مجھے تمہارے بارے میں رودادہ نے بتایا تھا پھر کوئیل کے بھائی اور بھابھی نے بتایا۔ جب ایک رات رودادہ تمہیں جان بوجھ کر وارڈن کی اجازت کے بغیر ساتھ لے گئی تھی۔ مجھے پہلے اس ساری کہانی پر یقین نہیں آیا۔ مجھے کوئیل پر بے حد اعتماد تھا۔ مگر پھر پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا میں چاہتی تھی۔ کوئیل تم سے قطع تعلق کر لے خاص طور پر موہد والے واقعہ کے بعد۔ وہ موہد سے بے پناہ محبت کرتا تھا پھر بھی ایک معمولی سی بات پر اس نے تمہاری وجہ سے موہد کو چھوڑ دیا اور تب میں بے پناہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ مجھے تم سے بے پناہ خوف اور نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ پھر وہ رودادہ والا واقعہ پیش آیا اور میں نے کوئیل سے بات کرنے کی سوچ لی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ تمہیں چھوڑ دے یا مجھے۔“

اور اس نے..... اس نے مجھے چھوڑ دیا۔“

ایک بار پھر ماریہ کے چہرے پر کچھ جل کر بجھ گیا تھا۔

”تب میرا دل چاہا تھا میں تمہیں اور کوئیل دونوں کو شوٹ کر دوں۔ میں نے دھوکا کھایا۔ مجھے ایسا لگا تھا، وہ بھی اس شخص کے ہاتھوں جس پر میں نے سب سے زیادہ اعتبار کیا تھا۔ تب مجھے لگا تھا جیسے دنیا ہی ختم ہو گئی تھی شاید سب کچھ ٹھیک ہو جاتا شاید ہم دونوں کا غصہ ختم ہو جانے کے بعد، کچھ دنوں کے بعد دوبارہ ہم میں صلح ہو جاتی مگر پھر تم نے وہ جھوٹ بول دیا یاد ہے نا ثانیہ! تم نے اس سے کہا تھا کہ میں نے تمہارے پاس آ کر کہا ہے کہ کوئیل تم سے فلرٹ کر رہا ہے؟“

وہ یاد نہ بھی دلائی، تب بھی ثانیہ کو سب کچھ یاد تھا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ اس نے ایک بار پھر بولنا شروع کر دیا۔

”کوئیل اس کے بعد صرف ایک بار میرے پاس آیا تھا۔ میرے جھوٹ پر مجھے ملامت کرنے۔ اسے میری کسی بات پر یقین نہیں آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ تمہارے پاس لے کر جائے اور پھر تم سے پوچھے کہ کیا میں تمہارے پاس آئی تھی؟ کیا میں نے ایسی بات کہی تھی۔ مگر تب تک تم کچھ کہے کچھ بتائے بغیر ہاسٹل اور یونیورسٹی چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ میں نے تمہارے آنے کا بہت انتظار کیا۔ کیونکہ صرف تمہاری گواہی اس کے دل

پر جی بدگمانی کی دھند کو ختم کر سکتی تھی۔ مگر تم نہیں آئیں۔ پتا نہیں ثانیہ تمہاری بات میں کیا اثر تھا کہ کوئیل کو پھر میری بات پر یقین نہیں آیا۔ وہ جانتا تھا کہ میں کبھی بھوٹ نہیں بولتی پھر وہ یہی کہتا رہا کہ جو کچھ ثانیہ نے کہا ہے وہ ٹھیک ہے، جو تم کہہ رہی ہو وہ بھوٹ ہے۔ میں لے بہت کوشش کی تھی سب کچھ ٹھیک کرنے کی مگر پتا نہیں اس کے دل میں میرے خلاف کون سی بدگمانی آ گئی تھی اور پھر میں نے سوچ لیا کہ اب اس شخص سے مجھے کوئی واسطہ نہیں رکھنا۔ مجھے لگتا تھا اسے محبت مجھ سے نہیں تم سے ہوئی ہے۔ میں پتا نہیں کیا تھی۔ راستے کی گرد یا پھر راستے کا پتھر۔ اس نے مجھے ٹھوکر ماری اور میں اس کے راستے سے ہٹ گئی۔“

ماریہ خاموش ہو گئی تھی۔ ایک بار پھر آنکھیں بند کر کے وہ سیٹ کی پشت سے لپک لگا چکی تھی۔

ثانیہ کا لال بڑھتا جا رہا تھا۔

”ماریہ! آپ یقین کریں میرے اور کوئیل کے درمیان کچھ نہیں تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا۔ وہ میرے لئے کیا سوچنے لگا تھا مگر میں نے کبھی بھی اس کے لئے دل میں کوئی نللا جذبات نہیں رکھے۔ پھر بھی میں آپ سے ایکسکوز کرتی ہوں۔ یہ سب میری غلطی تھی جس کی سزا آپ کو.....“

ماریہ آنکھیں کھول کر اسے دیکھتے ہوئے مسکرائی اور بہت نرمی سے اس نے اپنا ہاتھ ثانیہ کے کندھے پر رکھ دیا۔

”نہیں مجھے تمہاری غلطی کی سزا نہیں ملی۔ تمہارا کہیں بھی کوئی قصور نہیں تھا اور میرے دل میں اب تمہارے خلاف کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے تو بس اپنی بدگمانیوں کی سزا ملی ہے۔ بہت دعوے تھے مجھے کوئیل حیدر کو سمجھنے کے۔ بس اس خوش فہمی نے مجھے مار دیا۔“

”ماریہ! میں آپ دونوں کے درمیان اپنی وجہ سے پیدا ہونے والی یہ غلط فہمی دور کر سکتی ہوں۔ میں کوئیل سے ملوں گی اور سب کچھ کلیئر کر دوں گی پھر آپ دونوں شادی کر سکتے ہیں، پھر تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے؟“

ثانیہ کو ایک دم پتا نہیں کیا سوچا تھا۔ وہ کچھ بے چین ہو کر بولی تھی ماریہ ایک ٹک اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر تھکی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔

”اب یہ نہیں ہو سکتا ثانیہ! کوئیل کی شادی کو سات سال ہو چکے ہیں اور وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ بہت خوش ہے اور میں..... میں بھی شادی کر چکی ہوں۔ میرا بھی ایک بیٹا ہے۔“

چاہئے تھا کہ میں، میں کوئیل حیدر کسی اور سے محبت کر سکتا تھا؟ کیا میں ایسا آدمی تھا جو ہر دوسری لڑکی کو اپنی محبت کا یقین دلاتا پھر۔ اتنا شک کیوں کیا تھا تم نے؟ اتنی بے اعتباری کیوں تھی تمہیں مجھ پر؟

وہ مجھ سے سوال کر رہا تھا ثانیہ! اور میرا دل چاہ رہا تھا میں اس کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روؤں اور کہوں یہ بے اعتباری عورت کی سرشت، اس کی فطرت میں ہے۔ مجھے اس کو گوانا تھا۔ اس لئے میں نے اس پر شک کیا تھا۔ تم نے مجھ سے پوچھا ہے نا ثانیہ! کیا میں خوش نہیں ہوں پہلے خوش تھی۔ یہ سوچ کر کہ میں نے اس شخص کو چھوڑا ہے جو کسی اور کی محبت میں مبتلا ہو چکا ہے اور میں اس شخص کی بیوی ہوں جو صرف مجھ سے محبت کرتا ہے لیکن اب، اب میں صبر کیسے کروں۔ یہ سوچتے ہوئے کہ میں نے اپنی ایک معمولی حماقت کے ہاتھوں اس شخص کو گنوا یا ہے جو آج بھی صرف مجھ سے محبت کرتا ہے۔ مجھے اب ساری عمر جہانگیر کے چہرے میں کوئیل کو تلاش کرنا ہے۔ میں خوش کیسے رہوں گی۔“

وہ بیک سے نشوونما کر گالوں پر بہتے آنسوؤں کو خشک کرنے لگی تھی اور ثانیہ خالی الذہنی کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھتی جا رہی تھی۔

کوئیل حیدر، رودابہ نواز، ماریہ جہانگیر، ثانیہ مراد علی نام جیسے اس کے ذہن میں رقص کرتے جا رہے تھے۔

اس نے آٹھ سال پہلے رودابہ نواز کو کوئیل حیدر کے التفات کے لئے سر پر ہاتھ رکھو دتے دیکھا تھا۔ اس نے آج ماریہ جہانگیر کو ایک بار پھر اسی شخص کے لئے بلکتے دیکھا تھا اور ایک وہ تھی جو مرد کو نہیں سمجھتی تھی اور اسے گمان ہوا تھا کہ صرف کوئیل حیدر ایک مرد ہے جسے وہ اچھی طرح جان اور پہچان چکی ہے اور آج.....

آج اس کا بھی دل چاہ رہا تھا، وہ رودابہ نواز کی طرح سر پر ہاتھ رکھ کر روئے، مرد سمجھ میں کہاں آتا ہے۔ مرد سمجھ میں ہی نہیں آتا، چاہے وہ رودابہ نواز جیسی ہوشیار اور زیرک لڑکی ہو یا ماریہ جہانگیر جیسی پر خلوص اور ہانگی کو ایفائیڈ لڑکی یا پھر ثانیہ مراد علی جیسی سادہ اور سیدھی لڑکی ہر ایک کو گمان ہوتا ہے چند لمحے کا گمان اور پھر پوری زندگی ایک گمان بن کر رہ جاتی ہے۔

اور اب یہ ماریہ جہانگیر کس کس کو اس طرح رو رو کر اپنی داستان سناتی پھرے گی اور میں..... میں کس کس سے یہ کہوں گی کہ میں لوگوں کو اور خاص طور پر مرد کو بہت اچھی طرح سمجھ جاتی ہوں اور جب بھی یہ کہوں گی تو مجھے کوئیل حیدر یاد آئے گا اور پھر مجھے سب کچھ یاد

”ماریہ! کیا آپ خوش نہیں ہیں۔“ ثانیہ نے بے اختیار اس سے پوچھا تھا۔
”شاید خوش ہوئی اگر اس بار کوئیل سے نہ ملی ہوتی۔ ثانیہ! میں آخری بار پاکستان آئی ہوں۔ اب مجھے دوبارہ پاکستان نہیں آنا۔ میں دوبارہ کبھی تمہارا اور کوئیل حیدر کا سامنا کرنا نہیں چاہتی۔“

ثانیہ نے سر جھکا لیا تھا۔
ماریہ کی خود گلایا جاری تھی۔ ”آٹھ سال پہلے منگنی توڑتے وقت میں نے بار بار اس سے پوچھا تھا۔ کوئیل! مجھے بتاؤ۔ تمہارا ثانیہ سے رشتہ کیا ہے؟ کس حوالے سے تم اس پر اتنی توجہ دے رہے ہو؟ وہ ہر بار چپ رہتا تھا۔ ہر بار بھڑک اٹھتا تھا اور اس کی یہ خاموشی، یہ غصہ، یہ اضطراب میرے شک کو یقین میں بدلتا گیا تھا کہ وہ تم سے محبت کرنے لگا ہے۔ مگر وہ تب اس کا اعتراف نہیں کرتا تھا اور آٹھ سال کے بعد پچھلے ہفتے اس نے اعتراف کر لیا ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا کوئیل حیدر! اب تو بتا دو کہ ثانیہ سے کیا رشتہ تھا؟ اب تو کہہ دو۔ تم اس سے محبت کرتے تھے اور اس نے کہا تھا۔

”ہاں ماریہ! میں اس سے محبت کرتا تھا اور محبت کرتا ہوں لیکن صرف..... صرف ایک چھوٹی بہن کی حیثیت سے۔“

ثانیہ کو لگا تھا، کسی نے اسے پہاڑ کی چوٹی سے کسی کھائی میں دکھیل دیا ہو۔
”بہن کی حیثیت سے؟ مجھے اس کی بات سن کر یوں لگا تھا جیسے کسی نے میرے سینے میں ایک خنجر گاڑ دیا ہو۔ میں نے اس سے کہا تھا۔

”اگر تم اسے صرف بہن سمجھتے تھے تو تم نے یہ کہا کیوں نہیں۔ جب میں اتنی بات تم سے پوچھتی رہی تھی تو تم نے کہا کیوں نہیں کہ تم اسے بہن سمجھتے ہو اور بتا ہے وہ ایک بار پھر میری بات پر بھڑک گیا۔ اس نے کہا تھا۔ ”میں کیوں کہتا کہ میں اسے بہن سمجھتا ہوں۔ میں کیوں کہتا؟ رشتے کوئی ٹیگ نہیں ہوتے جنہیں بندہ گلے میں ڈال کر پھرتا رہے۔ یہ بہن ہے۔ وہ بیوی ہے۔ یہ بیٹی ہے یا وہ ماں ہے۔ کیا کہے بغیر میں کسی کو بہن نہیں سمجھ سکتا۔ کیا کہنا ضروری ہے۔ تمہیں تو مجھے سمجھنا چاہئے تھا تم بھی دوسروں کی طرح مجھ سے وضاحتیں مانگنے لگی تھیں۔ ثانیہ کون ہے؟ اس سے کیا رشتہ ہے؟ تمہاری زبان پر بھی یہی سوال آنے لگے تھے۔ تم تو دعویٰ کرتی تھیں کہ تم مجھے سب سے زیادہ سمجھتی ہو پھر تم..... میں نے اگر کسی سے محبت کا اعتراف کیا تھا تو وہ بھی تم تھیں اور میں تم سے آج بھی اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی تمہیں پہلی بار دیکھتے ہوئے میں نے تمہارے لئے محسوس کی تھی لیکن تم نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔ تمہیں سوچنا

آجائے گا۔ اپنی حماقت جس نے کتنی زندگیوں کو عذاب میں ڈال رکھا ہے یا اپنی سمجھداری جو اب مجھے کہیں چین لینے نہیں دے گی۔ کتنا اچھا ہوتا میری زندگی میں کبھی کوئی کو میل حیدر نہ آیا ہوتا۔ یا میں کبھی مدد کے لئے اس کے پاس نہ جاتی۔ یا وہ بالکل ویسے ہی انکار کر دیتا جیسے وہ سب کو کرتا تھا۔ یا وہ..... وہ مجھے ایک بار بتا دیتا کہ وہ مجھے کیا سمجھتا ہے یا..... یا ماریہ جہانگیر! تم مجھ سے کبھی نہیں ملتیں۔“

وہ سوچ رہی تھی اور اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ ماریہ کی سسکیاں اب بھی اس کی سماعتوں میں گونج رہی تھیں اور ثانیہ..... ثانیہ ایک بار پھر کو میل حیدر سے ملنا چاہتی تھی۔

